فہرست مضامین

۴۸۹

سیر المصنّفین (جلد اوّل)

جس میں

نثارانِ اُردو کے حالاتِ زندگی اور اُردو زبان کی عہد بعہد کی ترقی و تبدیلی

کا ذکر کیا گیا ہے

از

جناب مولوی محمد یحییٰ صاحب تنہا بی۔ اے (علیگ)

مترجم شاعرانہ خیالات و تاریخ مغربی یورپ

جس کو

مینیجر دار الاشاعت غازی آباد

نے

محبوب المطابع دہلی میں چھپوا کر شایع کیا

سنہ ۱۹۲۴ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم
نحمدہٗ و نصلی علیٰ رسولہ الکریم

دیباچہ

آج سے دس برس قبل یعنی ۱۹۱۴ء میں جبکہ راقم لکھنؤ میں اقامت گزین تھا یہ خیال پیدا ہوا کہ "آبِ حیات" کے نمونہ پر جو تاریخ نظمِ اُردو کی مقبول کتاب ہے نثرِ اُردو کی تاریخ لکھی جائے، یا بالفاظِ دیگر نثارانِ باکمال کا تذکرہ تحریر کیا جائے، چنانچہ مصنفینِ اُردو کے حالاتِ زندگی کی جستجو دامنگیر ہوئی، لیکن اُسی زمانہ کے قریب قریب جنگِ یورپ چھڑ گئی اور سب لوگوں کی توجہ لڑائی کی خبروں کی طرف منعطف ہوگئی، کسی چیز کی جانب نہ وہ التفات رہا اور نہ وہ سرگرمی، بلکہ شب و روز جنگی خبروں کے معلوم کرنے میں وہ انہماک ہوگیا کہ تصنیف و تالیف سے بھی مطلق دلچسپی نہ رہی، یہ حال نہ صرف میرا تھا بلکہ گرد و پیش کے سب لوگوں کو اسی مرض میں مبتلا دیکھا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کچھ دنوں تک اس قسم کی تصنیف کا خیال رہا اور پھر ایسا نسیاً منسیاً ہوگیا کہ ۱۹۲۳ء تک بھولکر بھی یاد نہ آیا۔ آخرِ کار جون ۱۹۲۳ء میں پھر خیالِ رفتہ نے دل میں چٹکی لی اور اس مرتبہ مصمم قصد کرلیا کہ جو کچھ ہو اور جس طرح ہو اپنے پُرانے خیال کو عملی جامہ پہناؤں، اگر حسبِ خواہش حالات بہم نہ پہنچیں یا کتابیں دستیاب نہ ہوں تو جس قدر حالات فراہم ہوسکیں اور جس قدر کتابیں مل سکیں اور اُن سے جیسی کچھ کتاب مرتب

ہو سکے پبلک کی خدمت میں پیش کر دوں۔

ظاہر ہے کہ ایسی کتاب کے لیئے ایک بڑے کتب خانہ کی ضرورت ہے غازی آباد جیسے مقام میں وہ کہاں؟ تاہم دلی کی قربت نے میری مشکل کو کسی قدر آسان کر دیا اور مجھے بہت سا مواد وہاں سے مل گیا، پھر بھی دل کی آرزو دل میں ہی رہی یعنی جن جن کتابوں کے دیکھنے کو جی ترستا تھا وہ دستیاب نہ ہوئیں۔ ناچار جو کچھ میسر ہوا اُس پر قناعت کی گئی۔ پس کتاب موجودہ شکل میں ہدیۂ ناظرین ہے۔

خدا کا شکر ہے کہ اب اُردو جو کس مپُرسی کی حالت میں تھی، اہلِ ملک کی چہیتی اور پیاری زبان ہوتی جاتی ہے۔ پہلے انگریزی تعلیم یافتہ اُردو میں لکھنا یا پڑھنا خلافِ شان سمجھتے تھے اور اُردو رسائل و اخبارات پر ایک نظر ڈالنا گناہ جانتے تھے لیکن اب وہ حال نہیں رہا۔ نئی نئی کتابیں لکھنے اور پڑھنے کا شوق پیدا ہو گیا ہے اور ہم اپنی زبان کو جملہ اقسام کی کتابوں سے مالامال دیکھنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ اس مقصد کو پیش نظر رکھکر اس کتاب میں اہلِ ملک کے سامنے اپنی زبان کی عہد بعہد کی ترقی و تبدیلی کا ایک خاکہ کھینچا گیا ہے، اگرچہ اس سے ضمناً تاریخِ اُردو کی تکمیل بھی مقصود ہے جو ابتک ناتمام چلی آتی تھی اور کسی اہل نے ہنوز اس طرف توجہ نہ کی تھی سہ

آسماں بارِ امانت نتوانست کشید   قرعۂ فال بنامِ منِ دیوانہ زدند

اس کتاب میں تین دَور قائم کیے گئے ہیں، پہلا دَور سنہ ۱۷۹۰ء سے سنہ ۱۸۳۶ء تک، دوسرا دَور سنہ ۱۸۳۶ء سے سنہ ۱۸۵۷ء تک اور تیسرا دَور سنہ ۱۸۵۷ء سے سنہ ۱۹۱۴ء تک ہے۔ چوتھا دَور سنہ ۱۹۱۴ء سے شروع ہو جاتا ہے لیکن ابھی یہ نہیں کہا جا سکتا کہ کب ختم ہوگا۔ یہ دَور دَورِ حاضرہ ہے اور اس دَور کے مصنفین کس درجہ اور

کس پایہ کے ہونگے، زمانہ آگے چلکر بتائیگا۔ ابھی ان مصنفین کی ابتدا ہے اور خدا بہتر جانتا ہے کہ ان لوگوں کی انتہا کیسی ہوگی۔ فی الحال یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان مصنفین کے حالات سے قطع نظر کی جائے۔ اس بارے میں مولوی عبدالحق بی۔ اے سکرٹری انجمن ترقیِ اُردو اور مولوی عبدالرزاق مصنف البرامکہ و نظام الملک طوسی میرے ہمخیال ہیں۔ اگرچہ بعض دوستوں کا یہ بھی اصرار ہے کہ دورِ حاضرہ کے مصنفین کے حالات ضرور داخلِ کتاب ہوں، راقم کو افسوس ہے کہ وہ اس مشورہ سے فائدہ نہ اُٹھا سکا اور اُن کے حالات قلمبند کرنے سے قاصر رہا۔ نہ اس وجہ سے کہ ان کے حالات میسر نہ آسکے بلکہ اس لحاظ سے کہ موجودہ مصنفین کو اپنی تصنیفات پر تنقیدی نظر شاید ناگوارِ خاطر ہو اور اُن کے ہواخواہان و مدح خواں بے لطفی و بدمزگی پیدا کریں۔

پہلے اور دوسرے دَور کے مصنفین کے حالاتِ زندگی امتدادِ زمانہ نے ہماری دسترس سے باہر کردیے ہیں، اس لیے نہایت مختصر اور نہایت قلیل حالات درج ہوسکے جس کا بیحد افسوس ہے، تاہم امید ہے کہ اس کتاب کی اشاعت پر ہمارے ناظرین میں تحقیق و تفتیش کی تحریک پیدا ہوجائیگی اور وہ اس کمی کو دور کرنے کی سعی بلیغ فرمائیں گے، اور اُن کی توجہ سے کامل یقین ہے کہ ہم آئندہ نہ صرف موجودہ مصنفین کے حالاتِ زندگی بالتفصیل زیبِ قرطاس دیکھیں گے بلکہ توقع کی جاتی ہے کہ آئندہ ان دونوں دوروں کے مصنفین کی تعداد میں بھی اضافہ ہوجائیگا۔

تیسرے دور کے مصنفین کے حالات حتی الامکان جس قدر فراہم ہوسکے تحریر کیے گئے ہیں۔ چونکہ یہ سب اصحاب اب سے تیس برس پیشتر زندہ تھے اور بعضوں کے انتقال کو تو صرف دس سال ہی ہوئے ہیں اور

اُن میں حضرت "شرر" اب تک خدا کے فضل سے زندہ اور صحیح و سلامت ہیں، لہٰذا ان حضرات کے حالاتِ زندگی معلوم کرنا یا بہم پہنچانا دشوار نہ ہوا البتہ "سرشار" کے حالاتِ زندگی بہت دقت اور مشکل سے دستیاب ہوئے اور وہ بھی حسبِ منشاء نہ ملے۔

مجھے اس کتاب کے لکھنے میں جو مشکلات پیش آئیں اُن کو میرا دل ہی خوب جانتا ہے۔ ہم میں بعض اصحاب عنایتِ ایزدی سے ایسے سعید ہیں جنہوں نے اپنے باپ کے بھی حالاتِ زندگی فراہم کرنے میں دریغ کیا اور اس قدر تکلیف گوارا نہ کی کہ اپنے باپ کے سوانح تحریر فرما کر خاکسار کو روانہ کر دیتے۔ راقم کو بلطائف الحیل ٹال دیا بعض اصحاب نے دوسرے بزرگوں کے حالات جن سے وہ واقف تھے قلمبند کرنے میں کوتاہی فرمائی اور جواب لکھنا کسرِ شان سمجھا۔ ہمارے ملک مین گو علمی مذاق روز بروز زیادہ ہوتا جاتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہم ابھی ایک صدی تک اس قابل نہ ہوں گے جو مہذب ممالک کے اہلِ علم کی ہمسری تو کیا اُن کی کامل تقلید ہی کر سکیں۔ مجھکو شرم آتی ہے کہ میں اپنے ہموطن بھائیوں کی علمی عدم توجہی کی شکایت کر رہا ہوں لیکن واقعات مجبور کرتے ہیں کہ میں اس شکایت کو زبان پر لاؤں اور اُس کرم گستری اور توجہ کا شکریہ ادا کروں جو میرے عزیز ہموطنوں کے برعکس ایک شریف امریکن نے مجھ پر مبذول کی۔ وہو ہٰذا:۔

راقم نے "مسٹر رابنسن" کی "تاریخ مغربی یورپ" کا ترجمہ اُردو میں کیا تھا لیکن کتاب مذکور کا ترجمہ قانوناً بلا اجازت اصل مصنف شائع نہیں کیا جا سکتا تھا چنانچہ صاحبِ موصوف کو ایک خط بغرض حصولِ اجازت امریکہ بھیجا اور نیز اُن کے حالاتِ زندگی اُن سے طلب کیے اور فلسفۂ تاریخ کے متعلق کتابوں کے نام اور ملنے کا پتہ دریافت کیا۔ "مسٹر رابنسن" نے نہ صرف اجازتِ اشاعت ترجمہ فراخدلی سے دی اور اپنے

حالاتِ زندگی بھیجکر مجھے شکر گزار کیا بلکہ "فلسفہ تاریخ" پر اور نیز "تاریخ یورپ" پر چار پانچ ضخیم کتابیں اپنی تصنیف شدہ عنایت فرمائیں۔ افسوس ہے کہ تاریخ مغربی یورپ ابھی طبع نہیں ہو سکی تاہم یہ واقعہ بآوازِ بلند کہہ رہا ہے کہ ہمارے عزیز ہموطن توسیع زبان واشاعتِ علم سے کہاں تک گریز کرتے ہیں، اور متمدن ممالک کے اہلِ علم اپنے علمی مذاق کو وسعت دینے میں کہاں تک غیر ملکیوں کی بھی امداد کرتے ہیں ؎

چراغِ مردہ کجا شمع آفتاب کجا
ببیں تفاوتِ رہ از کجاست تا بکجا

شکایت کے دوش بدوش مجھے اپنے اُن احباب کا شکریہ بھی ادا کرنا چاہیے جنہوں نے اس کتاب کی تالیف و تدوین میں میری امداد فرمائی۔ سب سے زیادہ لائقِ تحسین و تشکر شیخ محمد اسمٰعیل صاحب احمدی پانی پتی ہیں جنہوں نے تیسرے دَور کے اکثر مصنفین کے حالاتِ زندگی مطبوعہ و غیر مطبوعہ کا بہت سا مواد مجھے بہم پہنچایا۔ مولوی عبدالحق صاحب بی۔ اے سکرٹری انجمن ترقی اُردو اورنگ آباد دکن، مولوی ظفر الملک ایڈیٹر الناظر لکھنؤ، مولوی بشیر الدین احمد صاحب دہلوی اور بابو رام دیال صاحب نائنش سکرٹری ریاست چاہرہ بھی میرے دلی شکریہ کے مستحق ہیں جنہوں نے مجھے کتابیں بہم پہنچائیں یا اُن کے دستیاب ہونے کے وسائل بتائے یا ضروری مضامین نقل کرا کر روانہ کیے ۔

محمد یحییٰ تنہا بی۔ اے (علیگ)

غازی آباد
۱۰ ستمبر ۱۹۲۴ء

تمہید

اُردو ہندوستان[۱] کی مشترکہ زبان ہے

ایک مکمل زبان کے لیے کیا کیا چیزیں ضروری ہیں؟ ذرا غور کرنے سے معلوم ہو جائیگا کہ ایسی زبان کے الفاظ میں صوری حیثیت سے حسب ذیل باتیں ہونی چاہئیں:-

(۱) اُن کا تلفظ آسان ہو (۲) اُن کے مشتقات آسانی سے بن سکیں

(۳) وہ دوسرے الفاظ کے ساتھ آسانی سے ملائے جا سکیں۔

معنوی حیثیت سے جیسا کہ "مِل" نے کہا ہے، اس نظام عالم میں دو باتیں ضروری ہیں:-

(۱) ہر اسم نکرہ کے اپنی جگہ پر مستقل و متعین معنی ہونے چاہئیں۔

(۲) حسب ضرورت ہر مفہوم کے لیے ایک نام مخصوص ہو یعنی ہر خیال، ہر جذبہ ہر حالت غرض ہر چھوٹی سے چھوٹی کیفیت کے لیے جسے دماغ محسوس کر سکے ایک نام ہو۔

یہ صاف ظاہر ہے کہ مذکورۂ بالا شرطیں صرف ترقی یافتہ ہی زبان سے پوری ہو سکتی ہیں، اور زبان کی ترقی اُس قوم کی، جو اُسے بولتی ہے، دماغی ترقی کے تناسب ہوتی ہے، اُن قوموں کی زبان جو تمدن کے اعلیٰ مدارج پر ہیں، لازماً اُن قوموں کی زبانوں سے زیادہ ترقی یافتہ ہوتی ہے جو تمدن کے اُس زینہ پر نہیں ہیں۔

---

[۱] یہ مضمون رسالۂ معارف اعظم گڑھ سنہ ۱۹۲۱ء اور رسالۂ آئینہ الہ آباد سنہ ۱۹۲۳ء سے ماخوذ ہے۔ تنہا

مؤخرالذکر قوموں کی زبانیں قدرتاً ناقص اور کم مایہ ہوتی ہیں، اُن کا سرمایۂ الفاظ اس قدر وسیع نہیں ہوتا کہ متمدن قومیں اپنے اعلیٰ خیالات وجذبات کا اظہار اُسکے ذریعہ کرسکیں، غور کرو کہ دنیا کی غیر مہذب اور نیم متمدن قوموں کی زبانوں کی کم مایگی کا کیا حال ہے؟

اب دیکھو کہ اُردو زبان میں ان امور کی کیا حیثیت ہے؟ **ہندی** کی اصل کا تاریخ میں کوئی قطعی پتہ نہیں، تاہم ماہرین زبان کے اجماعِ عام کی بنا پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ ہندی دراصل شمالی ہند کی متعدد ابتدائی زبانوں کا ایک مجموعی نام تھا تاکہ وہ مشرقی ومغربی پراکرت زبانوں سے متائز رہ سکے، یہ ایک قابلِ لحاظ امر ہے کہ وہ زبان جسے ہم آج **ہندی** کہتے ہیں، وہ سنسکرت کی ایک شاخ نہیں بلکہ ہندوستان کے قدیم واصلی باشندوں کی زبان ہے حقیقت میں وہ سنسکرت سے بہت پہلے موجود تھی، اس کے ساتھ ساتھ رہی اور اس کے بعد تک باقی رہی "مسٹر بیمز" آنجہانی جنہوں نے ہندوستانی زبانوں کا خاص طور پر مطالعہ کیا ہے، کہتے ہیں :-

"سنسکرت عام لوگوں کے لیے نہ تھی، ہر جگہ مقامی زبانیں بولی جاتی تھیں جو سنسکرت سے قبل تھیں، اُس کے ساتھ قائم رہیں اور بعد تک باقی رہیں"

مشہور فرہنگ نویس **ڈاکٹر فیلن** نے اپنی لغت کے دیباچہ میں لکھا ہے:-

"یہ بالکل ممکن ہے کہ آجکل دیہاتی ہندی زبان کم وبیش تغیر وتبدل کے ساتھ موجودہ ناخواندہ باشندوں کے ناخواندہ اسلاف کی دیہاتی ہندی ہو"

لسانیاتی تجربات بتاتے ہیں کہ رفتہ رفتہ اس پراکرت یا ہندی نے

جو ملک کے باشندوں کی سب سے قدیم زبان تھی دو صورتیں اختیار کر لیں۔ ایک صورت ہندوستان میں متعدد آئی ہوئی زبانوں کے باہمی اختلاط سے پیدا ہوئی۔ انگریزوں کے آنے سے قبل ہندوستان میں بہت سی قومیں آئیں مثلاً "آرین" "یونانی" "سیتھین" "عرب" "مغل" اور "افغان" یہ سب اپنے ساتھ اپنی اپنی زبانیں لائیں۔ لیکن ان میں سے کوئی زبان بھی اتنی قوت نہ رکھتی تھی کہ ملک کی مروجہ زبان کو مٹا سکتی۔ قدرتی طور پر نتیجہ یہ ہوا کہ باہمی اختلاط شروع ہو گیا۔ ہر ایک دوسرے سے اثر پذیر ہونے لگی ایک زبان دوسری میں جذب ہونا شروع ہوئی۔ اس قدیم پراکرت کی ایک صورت "سنسکرت" "ژند" "یونانی" "سیتھین" "عربی" "ترکی" اور "فارسی" زبانوں کے تدریجی اثرات کو جذب کرنے لگی۔ ان میں سے ہر زبان کے حدود اثر اس رقبۂ زمین تک محدود تھے جو اس قوم کے زیر اثر ہوتا تھا۔ چنانچہ اسلامی اثرات میں سب سے زیادہ نمایاں اور وسیع تھا۔ پراکرت کی یہ صورت موجودہ بول چال میں ہندوستانی یا اُردو کے نام سے موسوم ہے۔

پراکرت کی دوسری صورت دینیات میں محدود رہی اور اس لیے اُسے بیگانہ اثرات سے آلودہ ہونے کے بہت کم مواقع ملے۔ خارجی اثر کو اس نے بہت کم قبول کیا اور تھوڑا بہت جو کچھ کیا وہ بھی سنسکرت تک محدود رہا۔ پراکرت کی یہ خالص صورت موجودہ ہندی کے نام سے پکاری جاتی ہے۔

اصل میں اُردو اور ہندی دو مختلف زبانیں نہیں ہیں بلکہ ایک ہی ماں کی دو بیٹیاں ہیں جو مختلف ضروریات و حالات کے لحاظ سے اپنی اصناف ادب اُردو اپنی زندگی کی ہر منزل پر مختلف ضروریات و حالات کے لحاظ سے اپنی اصناف ادب کے لیے اور تہذیب و تمدن کے گوناگوں ذرائع سے اپنی غذا حاصل کرنے کے لیے بڑھتی رہی برعکس اس کے ہندی ان اثرات سے پاک و بے آمیز رہی۔ یہ سچ ہے کہ کوئی زبان خارجی اثرات سے بالکل پاک نہیں رہ سکتی تاہم ہو سکے تو اتنا ضرور ہے کہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ سنسکرت

یونانی، ایرانی، عربی، ترکی، اور فارسی اثرات کی آمیزش واختلاط سے جو پراکرت پیدا ہوئی، اُسی درخت کی اُردو ایک قلم ہے اور ہندی صرف سنسکرت کی آمیزش کے ساتھ شمالی ہند کی قدیم اور خالص زبانوں کی ایک یادگار ہے۔

مختصر یہ کہ حقائقِ ذیل ناقابلِ انکار ہیں:۔

(۱) آرین قوم کے آنے سے قبل ہندوستان میں متعدد زبانیں مروج تھیں جنکا عام نام پراکرت تھا۔

(۲) سُرسینی پراکرت کی وہ صورت تھی جو سرسینا (نواح متھرا کا علاقہ) میں بولی جاتی تھی۔

(۳) ہندی، اصطلاح میں ایک فارسی لفظ ہے جس کے دو مختلف معنی ہیں۔ وسیع معنی میں اس میں وہ سب زبانیں شامل ہیں جو ہندوستان میں بولی جاتی تھیں۔ محدود معنی میں اس سے "سرسینی" یا "پراکرت" کی وہ صورت مراد تھی جو شمالی و مشترکہ زبان تھی اور جس سے غیر ممالک کے باشندے اوّل اوّل دوچار ہوئے۔

(۴) شمالی ہند کی اس ہندی زبان نے رفتہ رفتہ دو مختلف صورتیں اختیار کیں، ایک ناقص جامد اور بے آمیز رہی، دوسری نے نہایت آزادی سے خارجی اثرات کو جذب کیا اور دوسری زبان سے اختلاط قبول کیا۔

(۵) اوّل الذکر صورت کا قدیم نام ہندی ہی قائم رہا، مؤخر الذکر اُردو کے لقب سے موسوم ہوئی۔

نتیجہ اب بالکل صاف ہے۔ اُردو جو مختلف تمدن وتہذیب کا مزا چکھ رہی ہے اور مختلف آریائی اور سامی زبانوں کا عطر ہے ذریعۂ تعلیم کے لیے نہایت موزوں ہے اور ملک کی دیگر زبانوں کی بہ نسبت علمی خیالات کے اظہار اور تمدن کی ضروریات کے لیے زیادہ مناسب وبہتر ہے۔

اُردو زبان کا ذخیرہ بھی کثیر ہے۔ ایرانی، یونانی، فارسی، ترکی، عربی اور (زمانۂ

حال میں) انگریزی زبانوں کے مشتقات بے شمار ہیں جو سنسکرت اور قدیم زبان کے الفاظ سے خلط ملط ہو گئے ہیں۔ اس سے جدید مصطلحات کے ڈھالنے میں بڑی آسانیاں پیدا ہو گئی ہیں۔ جدید مغربی علوم کا اُردو مصنف نہایت آسانی سے عربی و سنسکرت، فارسی و انگریزی کے وسیع ذرائع سے کام لے سکتا ہے، بغیر اسکے کہ اپنی خاص زبان کے حسن و خوبی کے پہلو کو نظر انداز کرے۔

ہندوستانی کی بڑی خوبی اس کا عالمگیر ہونا ہے جسکا مقابلہ ہندوستان کی کوئی دوسری زبان نہیں کر سکتی۔ مرہٹی کشمیر میں، گجراتی بہار میں اور تامل اودھ میں ایسی ہی اجنبی معلوم ہونگی جیسی کہ افریقہ کی بنتو زبان۔ برعکس اس کے ہندوستانی جیسا کہ ہر شخص اس کا تجربہ کر سکتا ہے ہندوستان کے طول و عرض میں بلکہ بیرونِ ہند کے اکثر مقامات مثلاً عدن، بندر سعید، مالٹا وغیرہ میں ہر جگہ سمجھی جاتی ہے۔ ہندوستان کی دیگر زبانیں، معاف کیا جائے میرا منشا رکسی کا استخفاف نہیں ہے، زیادہ سے زیادہ صوبہ وار زبانیں ہیں۔ ہندوستانی ہی صرف ایسی زبان ہے جو ہر صوبہ میں بولی اور سمجھی جا سکتی ہے۔ ہندوستانی زبان کا ایک معقول حصہ ہندوستان کی ہر زبان میں شامل ہے، اور یہی سبب ہے کہ اُن صوبوں کے باشندے بھی جہاں ہندوستانی عام طور پر نہیں بولی جاتی اُسکو بالکل ہی اجنبی زبان محسوس نہیں کرتے۔

یہاں ہندوستانی زبان کے متعلق دو ایک یوروپین محققین کے خیالات کا پیش کرنا مناسب موقع ہوگا جن سے مذکورۂ بالا نتائج پر مزید روشنی پڑے گی۔ جارج کیمبل مصنف انڈیا ایزاٹ مائٹ بی، نے ہندوستان کی مشترک تعلیمی زبان کے بارہ میں ایک طویل مضمون لکھا ہے:۔

"ہندوستانی، ملک کے اکثر طبقوں میں عام طور پر بولی جاتی ہے اور اس سے زیادہ، عام طور پر یہ سمجھی جاتی ہے مسلمان جن کی کہیں زیادہ تعداد ہندوستان میں آئی

اور جنھوں نے اپنی تحریری زبان کو ایک حد تک فارسی رکھا، بول چال میں عام طور پر ہندوستانی ہی کو استعمال کرتے تھے۔ البتہ اُنھوں نے اس میں بیرونی الفاظ کی ایک کثیر تعداد داخل کر دی ہے جیسا کہ ہم کو بھی وقتاً فوقتاً انگریزی الفاظ کی آمیزش کرنی پڑتی ہے اور آئندہ کرنی پڑے گی۔"

"ان لوگوں کے لیے بھی جو ہندوستانی اچھی طرح نہیں سمجھتے ایک ایسی زبان کا انتخاب کر لینا جس کو اُن کے گرد و پیش کے لوگ عموماً بولتے ہوں اور جس کا ایک بڑا حصہ ہندوستان کی تمام زبانوں میں شامل ہے (یعنی ہندوستانی زبان) کہیں زیادہ آسان ہو بہ نسبت اس کے کہ وہ ایک ایسی زبان سیکھیں جو بالکل ہی غیر مانوس اور اجنبی ہو۔

میں یہ تجویز کرتا ہوں کہ تمام اعلیٰ مدارس میں ...... ہندوستانی ہی عام زبان ہونی چاہیے اور زبانیں بھی جہاں تک ضرورت ہو سکھائی جائیں ...... بغیر کسی عام مشترک زبان کے ترقی کرنا محال ہے، اور اگر جیسا کہ میرا خیال ہے انگریزی کو عام بنانا خارج از بحث ہے تو ہندوستانی ہی جہاں تک ممکن ہو، عام و مشترک بنانا بہت بڑا مقصد ہونا چاہیے، بنگالی زبان کے موافق بھی اُس صوبہ میں جہاں کی یہ خاص زبان ہے دلائل پیش کیے جا سکتے ہیں، لیکن درحقیقت ہندوستانی تمام طبقوں میں اس قدر عام ہے کہ کسی کو اُس کے مقابلہ میں پیش کرنا میرے خیال میں مناسب نہ ہوگا۔"

ایک دوسرے موقع پر اسی مصنف نے لکھا ہے:۔

"ہندوستانی، جیسا کہ میں نے کہا ہے ہندوستان کی مشترکہ زبان ہے، اس حیثیت سے تمام اعلیٰ طبقوں میں بلکہ میں یہ کہوں گا کہ تمام ادنیٰ طبقوں میں بھی (سپاہی، ملازم وغیرہ) تمام مسلمانوں اور ہندوستان میں رہنے والے تمام یورپینوں میں عام طور پر بولی جاتی ہے اور اس میں قبولِ الفاظ کی ایک ایسی عجیب خصوصیت ہے کہ میں نے کسی اور زبان میں نہیں دیکھا۔ اگر کسی لفظ کا بہ آسانی معقول ترجمہ ہندوستانی میں نہ ہو سکے تو اُس کی بجائے کسی

طویل تفکر کی ضرورت نہیں، فوراً ہی وہ لفظ ہندوستانی میں شامل کر لیا جاتا ہے، خواہ وہ فارسی، عربی، پرتگالی، یا انگریزی ہی کیوں نہ ہو۔ اس طریقہ کی سہولت اور سودمندی حیرت انگیز ہے، ہم ہندوستانی کو ہر ضرورت کے لیے استعمال کر سکتے ہیں۔"

مسیو گرسین ڈی ٹیسی مشہور فرانسیسی عالم نے ۹ ردسمبر ۱۸۶۹ء کو امپیریل اسپیشل اسکول آف اورنٹیل لنگویجز پیرس میں ہندوستانی زبان پر ایک لکچر دیا تھا، اُسکے بعض اقتباسات ہم ذیل میں درج کرتے ہیں:-

"اُردو نے ہندوستان میں وہی مرتبہ حاصل کیا ہے جو فرانسیسی زبان نے یورپ میں۔ یہ وہ زبان ہے جو بہ کثرت استعمال میں رہتی ہے، یہ عدالت اور شہر دونوں میں استعمال ہوتی ہے، اہل علم اپنی تصنیفات اور شعرا اپنی غزلیں اسی زبان میں لکھتے ہیں۔ یورپین سے گفتگو کا وسیلہ یہی ایک زبان ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ہندو لوگ اُردو ہر جگہ نہیں سمجھتے، مگر یہی صورت تو تمام ملک کی زبانوں کے ساتھ ہوتی ہے۔ برٹین (جو فرانس ہی کا ایک صوبہ ہے) کے کسان خواہ پیرا و نسل ہوں یا السا شین، فرانسیسی زبان نہیں سمجھتے، تو کیا یہ اس بات کی دلیل قرار پا سکتی ہے کہ فرانسیسی صوبہ کی عدالتوں اور سرکاری دفاتر میں نہ استعمال کی جائے؟"

"اُردو ہندوستان کے ہر قصبہ و قریہ میں سمجھی جاتی ہے، باوجودیکہ وہاں اور بھی زبانیں بولی جاتی ہیں، شمالی مغربی صوبہ اور اودھ کی تو یہ خاص زبان ہے، یہ صرف ہندوستان کے اندر ہی محدود نہیں ہے بلکہ بلوچستان اور دیگر ممالک میں جو ہند سے ملحق ہیں سمجھی جاتی ہے، یہ امر مشہور و معروف سیاحوں کے بیان سے پایۂ ثبوت کو پہنچ چکا ہے۔"

جے بیمز، مصنف انڈین فلالوجی کا حسب ذیل بیان ہندوستانی زبانوں کے عمیق مطالعہ کا نتیجہ ہے۔

"میں اس کو (اُردو) مختلف گروہوں کی بڑی اور وسیع زبان کی نہایت ہی ترقی یافتہ اور متمدن صورت خیال کرتا ہوں، صرف یہی نہیں کہ یہ ایک فصیح، سلیس اور وسیع زبان ہے

ملکہ اس میں وادیِ گنگا کی بسنے والی قوموں کی زبان کی اعلی ترقی ظاہر ہو سکتی ہے (رسالہ بنگال ایشیاٹک سوسائٹی جلد ۳ ۱۸۶۶ء صفحہ ۱۰)

ایسے زمانہ میں جبکہ ہندو مسلم اتحاد اور ہندوستانی قوموں کے باہمی میل جول کا غلغلہ مچ رہا ہے یہ یاد رکھنا بہتر ہوگا کہ اُردو اسلامی حکومت کی یادگار نہیں بلکہ ہندو مسلم یکجہتی کی علامت ہے۔ ایک طرف تو عربی و فارسی کے درمیان اور دوسری جانب سنسکرت و پراکرت کے مابین یہ ایک معقول رابطہ ہے۔ ہر زبان کے خزانہ میں خاص اجزاء صرف دو ہوتے ہیں، اسماء اور افعال، بقیہ چیزیں ثانوی اور ضمنی ہوتی ہیں۔ اب اگر دیکھا جائے تو اُردو کے تمام اسماء یا تو عربی ہیں یا فارسی اور تمام افعال سنسکرت یا پراکرت اصل سے ہیں۔ آنا، جانا، چلنا، بولنا، مارنا، مرنا، کھانا، پینا، اُٹھنا، اُٹھانا، بیٹھنا، بٹھانا، یہ ایسے الفاظ ہیں جن سے کوئی شخص بھی احتراز نہیں کر سکتا۔ برعکس اس کے غیر زبان کے الفاظ مثلاً جنگل، مال، میدان، مکان، حال، کاغذ، تماشہ، سال، دروازہ، سرکار، شکار، چاقو ایسے الفاظ ہیں جن کے استعمال سے کسی جاہل دہقانی کے لیے بھی بچنا ویسا ہی محال ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ اتحاد و ایثار نفسی کی روح تھی جس نے ہندو اور مسلمان دونوں کو ترغیب دی تھی کہ اپنی اپنی زبانیں چھوڑ کر ایسی زبان اختیار کریں جو اصل میں ہندوستانی ہو لیکن اسکی نشو و نما خارجی ذرائع پر ہوئی اور باہمی اتحاد و ہمدردی کی اس روح کا عملی نتیجہ تھی اور آج بھی وہ وفاداری کے ساتھ اُس روح کو ظاہر کر رہی ہے۔

اگرچہ پیشتر یہ ظاہر کیا جا چکا ہے کہ اُردو اور ہندی دراصل ایک ہی بولی کے دو نام ہیں یہ دو الگ الگ زبانیں نہیں ہیں، تاہم بالتفصیل ہم اس امر کا پھر اعادہ کرتے ہیں۔

دونوں کی صرف و نحو میں کوئی خاص فرق نہیں ہے۔ مصدر دونوں میں ایک ہیں اشتقاق کے قاعدے یکساں ہیں، جملوں میں لفظوں کی ترتیب ایک سی ہے، تاکید وغیرہ کے طریقے یکساں ہیں، سینکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں الفاظ ایسے ہیں جو اُردو میں بھی ہیں اور

ہندی میں بھی۔ ہندی کے حمایتی کہتے ہیں کہ عربی فارسی ملی ہوئی ہندی اُردو ہے، اُردو کے طرفداروں کا قول ہے کہ سنسکرت ملی ہوئی اُردو کو ہندی کہتے ہیں۔ ان دعووں سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ حقیقت میں اُردو اور ہندی ایک ہیں صرف نام کا ہیر پھیر ہے، یورپ والوں کی تیز نگاہیں پہلے ہی اس راز تک پہنچ گئی تھیں، اُنھوں نے دونوں کا نام "ہندوستانی" رکھکر یہ جھگڑا چکانا چاہا تھا مگر نام بدلنے سے کام نہ چلا۔

اوّل یہ بتا دینا ضروری ہے کہ اُردو کے زور پکڑنے سے پہلے شمالی ہندوستان میں برج بھاشا کا راج تھا۔ مہاتما تلسی داس کی بے نظیر کتاب "رام چرت مانس" جو دنیا میں رامائن کے نام سے مشہور ہے اسی زبان میں ہے۔ یہ اکبری عہد میں لکھی گئی تھی مگر آج بھی شاعری اسے آنکھوں سے لگاتی ہے اور عقیدت اسے پوجتی ہے، میں اس مقدس کتاب سے کچھ چوپائیاں سُناتا ہوں اور برج بھاشا کا نمونہ دکھاتا ہوں۔ سیتا جی کے باپ راجہ جنک نے عہد کیا تھا کہ جس کسی میں اتنی طاقت ہو کہ وہ شیو جی کی کمان چڑھا دے اُس کے ساتھ اپنی بیٹی کا بیاہ رچائیں گے۔ سوئمبر کیا گیا۔ دور دور سے راجہ مہاراجہ اپنا زور اور اپنی قسمت آزمائی کے لیے آئے مگر کوئی اس کمان کو اپنی جگہ سے سرکا بھی نہ سکا۔ یہ دیکھکر راجہ جنک نے اُن سب کو مخاطب کر کے کہا:۔

کہھو کا ہے یہ لابھ نہ بھاوا	کا ہو نہ شنکر چاپ چڑھاوا
کہو کسی کو یہ نفع نہ بھایا	کسی نے نہ شنکر[1] (کی) کمان چڑھائی
رہا چڑھاؤب توڑب بھائی	تل بھر بھومی نہ سکیو چھڑائی
رہا چڑھانا توڑنا بھائی	تل بھر زمیں نہ سکے چھڑا
تجہو آس نج گرہ جاہو	لکھا نہ بدہی بیدیہی بیاہو
چھوڑ آس اپنے اپنے گھر جاؤ	لکھا نہ خدا (نے) بیدیہی[2] (کا) بیاہ

[1] شنکر شیو جی کا دوسرا نام ہے۔ ۱۲ [2] بیدیہی سیتا جی کا دوسرا نام ہے۔ ۱۲

جو جنتیوں بن بہت فہی بھائی — تو پران کرِ کر تیو نہ ہنسائی

جو جاتا میں بہادر زین (کو) بھائی — تو عہد کر (سکے) کرتا میں نہ ہنسی

جنک بچن سن سب نر ناری — دیکھ جانکی بھئے دکھاری

جنک (کے) لفظ سن (کے) سب مرد و عورتیں — دیکھ (کے) جانکی[1] (کو) ہوئے رنجیدہ

یہ بھی برج بھاشا یا پرانی ہندی۔ ظاہر ہے کہ آجکل کے شریف ہندو ہوں یا مسلمان اس زبان میں بات چیت نہیں کرتے ہیں اور ہندی کے پجاری بھی اس زبان کو تمام ہندوستان کی زبان بنانا نہیں چاہتے ہیں، آجکل جس ہندی کا زور ہے اُسے "کھڑی بولی" کہتے ہیں۔ آئندہ جہاں کہیں ہم ہندی کا لفظ استعمال کرینگے وہاں اسی "کھڑی بولی" سے مُراد ہوگی۔ اب آجکل کی ہندی کا نمونہ دیکھیے۔ اس وقت ورتمان اخبار کا ۵ اکتوبر کا پرچہ میرے سامنے ہے، اس کی عبارت دو مقاموں سے نقل کرتا ہوں مشکل لفظوں کے معنی اُن کے سامنے بریکیٹ میں لکھدیے ہیں۔

(۱) کانپور کے بازار میں جو ولایتی مال آگیا ہے اُس کا کوئی خریدار نظر نہیں آتا۔ اگر مینچسٹر والے بیٹہ کاٹ کر واپس کرلیں تو بڑی کرپا (مہربانی) ہو۔ کانپور والے ایسی ہی ایک درخواست لکھکر بھیجنے والے ہیں۔

(۲) سکھ جات (ذات) نے ثابت کردیا کہ پرتگیہ (عہد) کرکے اُسے اس پرکار (طرح) نبھایا (نباہا) جاتا ہے۔ اپنا بلدان دیکر اپنے ادھکار (حقوق) اس پرکار (طرح) پراپت (حاصل) کیے جاتے ہیں۔ حقوق حاصل کرنے میں قربانی اس طرح دی جاتی ہے ...... سرکار اب گرودوارے کے جھگڑے نپٹانے کے لیے ایک بل (Bill) بنانے والی ہے۔ جہاں تک اس بل کے حالات ابھی تک پرکاشت (شائع) ہو چکے ہیں اُن سے پتہ چلتا ہے کہ گرودوارا بل سکھوں کی ساری آشاؤں (امیدوں) پر پانی پھیرنے

---

[1] جانکی یعنی سیتاجی ... ۱۲

والا ہوگا۔۔۔۔۔۔۔۔۔اس بل میں ایک اور دوش (نقص) ہے، اور وہ یہ ہے کہ اُسکے تینوں ممبروں کو تنخواہ سرکار دیگی، سرکار سے تنخواہ پانے والے آدمی اُس بات کا بسواس (یقین) رکھنا کہ وہ اُس موقع پر بھی سکھوں کی بھلائی کریگا جس سمئے (وقت) گورنمنٹ کے بھے (خوف) اور سکھوں کے فائدے کا پرشن (سوال) اُپستھت (پیش) ہوگا ہر آتھک (فضول) ہے۔ ہم سراسر دیکھتے ہیں کہ سرکار سے تنخواہ پانے یا منسٹر بننے کے بعد لوگوں کو ماڈریٹ (Moderate) سبھاؤں تک سے استعفا دینا پڑا ہے۔۔۔۔۔۔ کیسے آشا (امید) کریں کہ اتنی زبردست بہادر اور اپنے دھارمک (مذہبی) سدھانتوں (اصول) کے سامنے پرانوں (جانوں) کو بھی کچھ نہ سمجھنے والی جات (ذات) کے فائدے کے مقابلہ میں وے (وہ) اپنی تنخواہ تتھا (اور) سرکار کے رعب داب کی تنک (ذرا) بھی پروا نہ کرینگے"

اس پرچے میں سیتلا پرشاد وشنوئی کی ایک نظم بھی چھپی ہے۔ اس کے ابتدائی دو شعر لکھتا ہوں:

ابرو میں خم ہے آنکھ میں حرکت غرور کی   کیا جانے موت آئی ہے کس بے قصور کی
حب وطن کی مے سے ہوں میں مست ہو بہا   حاجت مجھے نہیں ہے شراب طہور کی

اسی اخبار کے ۱۸ اکتوبر کے پرچے میں راجہ رام جیسوال کی ایک نظم ہے اس کے بھی دو شعر سن لیجیے:

بیچ ستیہ کی آجکل ہو رہی ہے   اُتھیوگ دھارا پربل ہو رہی ہے
(زوردار)
اکالی تو ڈرتے نہیں کال سے بھی   گورنمنٹ کیوں بے عقل ہو رہی ہے

اب تو اُردو ہندی کا فرق سمجھ میں آگیا ہوگا حقیقت میں دونوں زبانیں بالکل ایک ہیں اگر کچھ فرق ہے تو یہ کہ:-

(۱) اُردو میں فارسی عربی کے لفظ زیادہ ہیں، سنسکرت لفظ کم ہیں، اور جو

ہیں بھی ان کی صورت کچھ نہ کچھ بدل گئی ہے، ہندی میں اس کا اُلٹا ہے۔ فارسی عربی کے لفظ کم اور سنسکرت کے زیادہ ہیں اور ان میں سے اکثر اپنی اصل شکل میں ہیں (اُن لفظوں کا ذکر نہیں جو دونوں زبانوں میں مشترک ہیں)

(۲) محاورے، کہاوتیں، مثلیں وغیرہ اُردو میں زیادہ تر فارسی اور کچھ عربی سے ترجمہ ہو کر آئیں اور ہندی میں زیادہ سنسکرت سے۔

(۳) اُردو لکھنے والوں کو جب کسی خیال کے لیے بول چال کی زبان میں کوئی لفظ نہیں ملتا تو وہ فارسی یا عربی لفظ لکھ دیتے ہیں۔ ہندی لکھنے والے ایسے موقعوں پر سنسکرت لفظوں سے کام چلاتے ہیں۔

(۴) اُردو میں علمی اصطلاحیں عربی فارسی سے لیتے ہیں اور ہندی میں سنسکرت سے

(۵) اُردو میں جب عبارت کو بہت شاندار بنانا یا اپنی قابلیت دکھانا چاہتے ہیں تو عربی لفظ فارسی ترکیبیں اور عربی فارسی کے شعر اور کہاوتیں وغیرہ نقل کرتے ہیں اور ہندی میں سنسکرت سے مدد لیتے ہیں۔

(۶) اُردو میں استعارے، تشبیہیں، تلمیحیں وغیرہ عربی اور فارسی ادبیات سے لی گئی ہیں اور ہندی میں سنسکرت لٹریچر سے۔

(۷) اُردو شاعری میں فارسی کا عروض مستعمل ہے اور ہندی شاعری میں سنسکرت کا۔

(۸) اُردو فارسی حرفوں میں لکھی جاتی ہے اور ہندی ناگری حرفوں میں۔ یہی سب سے زیادہ کھلا ہوا فرق ہے۔

ان اختلافات کے دور کرنے کے لیے ترتیب وار تدبیریں پیش کی جاتی ہیں۔ اگر ان پر عمل کیا جائے تو رفتہ رفتہ ایک مدت کے بعد وہ دن بھی آجائیگا کہ یہ دونوں زبانیں ملکر ایک ہو جائیں گی۔

(۱) جب ایک ہی بات کے لیے دو لفظ ملیں تو اُسے ترجیح دی جائے جسے زیادہ

آدمی بغیر سمجھائے ہوئے سمجھ سکتے ہوں۔ اس کا ذرا بھی خیال نہ کیا جائے کہ وہ لفظ اعربی ہے یا فارسی، سنسکرت ہے یا پراکرت۔ دوسرے اگر لوگ " عام طور پر" کسی لفظ کا غلط تلفظ کرنے لگے ہوں تو اُس کو صحیح کرنے کی کوشش نہ کی جائے۔ میری مراد ایسے لفظوں سے ہے جیسے کھیت، برات، بھاگن، توج، نیاہ، سُنار، چاند، لالٹین، اردلی، کہ اصل میں کشیتر، بریاترا، بھالگن (نون غنہ) لغوذ، نربّاہ، اسنورنکار (نون غنہ) چندر، لینٹرن، آرڈرلی ہیں۔ اسی طرح اگر لوگ عام طور پر کسی لفظ سے وہ معنی مراد لینے لگیں گے جس کے لیے وہ لفظ بنایا نہیں گیا تھا تو ہم کو وہی عام فہم معنی مراد لینا چاہیے۔ مثلاً تکرار کے معنی جھگڑا، روزگار کے معنی نوکری یا پیشہ، خفیف کے معنی شرمندہ، غرور کے معنی گھمنڈ، قضا کے معنی موت، عطار کے معنی دوا فروش حجام کے معنی نائی ہی لینا چاہیے، گو کہ عربی اور فارسی میں ان لفظوں کے معنی کچھ اور ہیں۔

(۲) جو محاورے، مثلیں، کہاوتیں لوگوں کی زبانوں پر چڑھ گئی ہیں اُنھیں سب لوگ استعمال کریں اور اُن محاوروں وغیرہ سے پرہیز کریں جن کا سمجھنے والا لاکھوں میں ایک آدمی ہو۔

(۳) نئے خیال اکثر نئی چیزیں دیکھنے یا نئی زبان سیکھنے سے پیدا ہوتے ہیں۔ اگر کسی خیال کے لیے ہمارے پاس لفظ نہ ہوں تو ہمیں نہ سنسکرت کی طرف دوڑنا چاہیے نہ عربی فارسی کی طرف۔ پہلے ہمیں ہندوستان کی دوسری زبانوں کو ٹٹولنا چاہیے اور جہاں کہیں ہمارے کام کا لفظ ملے اُسے لے لینا چاہیے۔ اس ذریعہ سے اُردو ہندی اور ان کی دوسری بہنوں میں میل جول بھی بڑھتا رہیگا اور ہماری زبان کو تمام ہندوستان کی زبان بننے میں زیادہ آسانی ہوگی۔ اگر ہندوستانی زبانوں کا خزانہ اُس لفظ سے خالی ہو تو جس ملک سے وہ نئی چیز آئی ہے یا جس زبان نے وہ نیا خیال ہمارے دل

میں پیدا کیا ہے اُسی سے ہم لفظ بھی نہ لے لیں۔ اب اگر ایک بات کے لیے کئی کئی لفظ آجائیں تو کچھ دن کے بعد دیکھنا چاہیے کہ کونسا لفظ سب سے زیادہ رواج پا گیا ہے اور اُس کو اختیار کر لینا چاہیے۔ ایک صورت یہ بھی ہو سکتی ہے کہ وہ نئی چیز ہمیں نے بنائی ہو یا وہ نیا خیال ہمارے ہی دل میں پیدا ہوا ہو، ایسی حالت میں ہم کو ایک نیا لفظ بھی گھڑ لینا چاہیے۔ یہ اس سے بدرجہا بہتر ہے کہ ہم عربی یا سنسکرت کا ایک نہایت مشکل لفظ ڈھونڈھ لائیں اور اُسے کسی خاص مفہوم کے لیے استعمال کرنے لگیں مگر کسی دوسری زبان سے لفظ لینے یا نیا لفظ گھڑنے میں یہ خیال ضرور رکھنا چاہیے کہ اُس کی آواز ہماری زبان کے الفاظ سے ملتی جلتی ہوئی ہو، اور ضرورت ہو تو اُس کی صورت میں ایسی تبدیلی کر دیں کہ جب وہ ہمارے لفظوں کی صف میں بیٹھے تو اجنبی نہ معلوم ہو۔

(۴) اس اختلاف کو مٹانے کی وہی تدبیر ہے جو ہم نے ابھی بیان کی، ہماری غرض یہ ہے کہ نہ اُردو لکھنے والے صرف عربی و فارسی ہی سے ہمیشہ مدد لیں اور نہ ہندی لکھنے والے صرف سنسکرت ہی سے۔ نہ اُنہیں سنسکرت سے "اسہیوگ" کرنا چاہیے اور نہ انہیں عربی و فارسی سے "ترکِ موالات"۔

(۵) جو لوگ صحیح ذوق رکھتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ مشکل لفظوں اور مشکل ترکیبوں کی بھرمار سے نہ عبارت کی شان بڑھتی ہے نہ لکھنے والے کی قابلیت ظاہر ہوتی ہے عربی فارسی یا سنسکرت کے لفظ اور فقرے لکھ دینے سے اُردو یا ہندی کی واقفیت کیسے ثابت ہوگی؟ جن لوگوں کو عربی، فارسی یا سنسکرت میں قابلیت کا دعوٰی ہو وہ اُنھی زبانوں میں اپنا زورِ قلم دکھائیں۔ بیچاری اُردو یا ہندی کو کیوں تکلیف دیتے ہیں۔ زبان کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ آسان سے آسان لفظوں میں مشکل سے مشکل اور نازک سے نازک مطلب ادا کر دیا جائے۔ اب رہا اپنی زبان میں دوسری زبانوں کی کہاوتیں مثلیں اور اشعار وغیرہ نقل کرنا تو جیسی عربی ویسی فارسی، جیسی سنسکرت ویسی پراکرت بلکہ

آپ کا جی چاہے تو انگریزی و فرانسیسی، لاطینی و جرمنی، عبرانی و سُریانی، چینی و جاپانی عبارت بھی نقل کیجیے مطلب صرف وہی سمجھیں گے جو ان زبانوں سے واقف ہیں۔ ہاں یہاں میں پھر کہوں گا کہ اُردو کے لیے عربی و فارسی اور ہندی کے لیے سنسکرت کو مخصوص کر دینا ٹھیک نہیں۔ اُردو میں سنسکرت کے قول نقل کیجیے اور ہندی میں عربی و فارسی کے۔

(۶) استعارہ، تشبیہ، تلمیح وغیرہ زبان کے زیور ہیں۔ اس طرح کا سامان جتنا زیادہ ہوگا اُتنی ہی زبان میں خوبصورتی، لوچ، اختصار اور ادائے مطلب کی قابلیت بڑھ جائیگی، اس لیے میری رائے ہے کہ جو تشبیہیں اور استعارے وغیرہ اب تک اُردو سے مخصوص ہیں، ہندی والے بھی اپنے یہاں رواج دیں اور جو ہندی سے مخصوص ہیں وہ اُردو میں لائے جائیں۔ اس طرح دونوں زبانوں میں کچھ خوبیاں بڑھ جائینگی اور یہ اختلاف بھی رفتہ رفتہ دور ہو جائیگا۔

(۷) عروض کے متعلق اُردو اور ہندی نظموں کے مطالعہ سے ایک بات سمجھ میں آتی ہے اور وہ یہ ہے کہ اُردو میں ہندی کی وہ بحریں لانا چاہیے جن میں روانی کے ساتھ شعر موزوں ہو سکتے ہوں، اور ہندی گویوں کو اُردو کی بحروں سے پرہیز نہ کرنا چاہیے۔ بلکہ میرا تو خیال ہے کہ "کھڑی بولی" کی شاعری کے لیے اُردو کی بحریں پُرانی ہندی بحروں سے زیادہ موزوں ہیں میرے اس بیان کا ثبوت یہ ہے کہ آجکل کھڑی بولی کی جو نظمیں پُرانی ہندی بحروں میں کہی گئی ہیں وہ کتنی بے مزہ اور روکھی پھیکی ہیں۔ تعقید کا عیب اُن میں قدم قدم پر موجود ہے اور روانی اور اثر نام کو نہیں ہے۔ ہندی کے بعض شاعروں نے یہ راز سمجھ لیا ہے اور اپنی روش بدلدی ہے

خلاصہ اس تحریر کا یہ ہے کہ اُردو لکھو تو کوشش کرو کہ تمہارا مطلب ہندی جاننے والے بھی سمجھ سکیں اور ہندی لکھو تو وہ زبان اختیار کرو جو اُردو جاننے والوں کے لیے بھی مشکل نہو، اُردو ہندی کے ملکر ایک ہو جانے کی سب سے بہتر تدبیر یہی ہے۔ یہ نکتہ بھی یاد رکھو کہ جو بولتے ہو وہی لکھو، کسی مصنوعی زبان کو رواج دینا فطرت سے لڑنا ہے۔

رسم الخط

(۸) حروف کا فرق اصل میں سب سے بڑا فرق ہے، میں خود فارسی حروف پسند کرتا ہوں اس لیے اُردو کی موجودہ تحریر پر جو اعتراض کیے گئے ہیں اُن پر ایک نظر ڈالنا چاہتا ہوں۔ ناگری حرفوں کے طرفدار فارسی تحریر میں یہ نقص نکالتے ہیں کہ اس میں ایک ہی لفظ کو کئی طرح پڑھ سکتے ہیں، ظاہر میں یہ اعتراض بہت وزنی معلوم ہوتا ہے لیکن اس کا وزن بہت گھٹ جاتا ہے جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ حقیقت میں یہ دقت بہت کم پیش آتی ہے، اتنی کم کہ الشاذ کالمعدوم کا حکم رکھتی ہے۔ ممکن ہے کہ اگر تنہا ایک لفظ یا ایک فقرہ کہیں لکھا ہو تو اُس کے پڑھنے میں کبھی غلطی ہو جائے مگر بالعموم لفظ کسی جملے میں اور فقرہ کی عبارت میں ہوتا ہے اور اُس لفظ کے گرد و پیش کے لفظ اور اس فقرہ کے آس پاس کے فقرے اس کے پڑھنے میں مدد دیتے ہیں۔ ایک بات اور بھی ہے جسے میں ایک مثال دیکر سمجھاؤنگا۔ فرض کیجیے کہ کہیں لفظ "خط" لکھا ہوا ہے، اسے تین طرح پڑھ سکتے ہیں، خَط، خِط، خُط، مگر خِط اور خُط سے ہمارے کان آشنا نہیں اور خَط پہلے سے ہمارے ذہن میں موجود ہے۔ اس لیے جہاں کہیں ہم "خط" لکھا ہوا دیکھیں گے اُسے بلا تامل "خَط" پڑھیں گے۔ اگر کبھی ہمارا ذہن بھٹک کر "خِط" یا "خُط" کی طرف چلا جاتا ہے تو یہ خیال کہ ہماری زبان میں "خِط" یا "خُط" کوئی لفظ نہیں ہے اُسے سیدھے رستے پر لگا دیتا ہے۔ پھر اگر لفظوں پر نقطے اور اعراب لگا دیے جائیں تو الگ الگ لفظوں کے پڑھنے میں بھی کبھی غلطی نہیں ہو سکتی، اب رہا خطِ شکست وہ ناگری تحریر میں بھی اتنا ہی مشکل ہے جتنا فارسی تحریر میں، اس کے پڑھنے کے لیے دونوں صورتوں میں کافی مشق اور مہارت کی ضرورت ہے۔ اس کے علاوہ میرا تو خیال ہے کہ اُردو کی اُس تحریر کا جس پر اعراب نہ لگے ہوں ناگری سے نہیں کیتھی سے مقابلہ کرنا چاہیے کیونکہ کیتھی اصل میں بے اعراب کی ناگری تحریر ہے جس طرح

عجلت کے خیال سے کیتھی میں پائی اور ماترا وغیرہ نہیں لگاتے ہیں اسی طرح اُردو میں زیر، زبر، پیش وغیرہ نہیں دیتے۔ اور جس طرح کیتھی کو بغیر پائی اور ماترے کے صرف قرینے سے صحیح پڑھ سکتے ہیں اسی طرح اُردو کو بغیر اعراب کے۔ یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ غلطی کا احتمال کیتھی میں اُردو سے کہیں زیادہ ہے۔ اگر بغیر اعراب کے اُردو میں ایک لفظ پانچ طرح پر پڑھا جا سکتا ہے تو کیتھی میں دس طرح پر۔

اُردو کی تحریر پر دوسرا اعتراض یہ ہے کہ اُس کا سیکھنا مشکل ہے۔ یہ سچ ہے کہ ہندی لکھنا اُردو لکھنے سے جلد آجاتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ معمولی آدمی ہندی لکھنا تین دن میں اور اُردو لکھنا ایک ہفتے میں سیکھ سکتا ہے۔ لیکن، اب ذرا اس بات پر یوں نظر کرو کہ اگر ایک آدمی بیس برس تک برابر اُردو حرفوں میں لکھتا رہے اور دوسرا ہندی حرفوں میں تو کون کتنا زیادہ لکھ ڈالے گا اور سچ کہو کہ ابتدا میں جو چار دن کا نقصان ہوا تھا اس کے بدلے میں کتنا نفع ہوگا۔ ہے یہ کہ اُردو میں لکھنے کا وہ ڈھنگ اختیار کیا گیا ہے جو مختصر نویسی کا ایک اعلیٰ نمونہ ہے۔ اُس کی بہت بڑی خوبی یہ ہے کہ لکھنے میں وقت بھی کم لگتا ہے اور کاغذ بھی اور کون عقلمند ہوگا جو اس عجلت پسندی اور اقتصادی کشمکش کے زمانہ میں وقت اور کاغذ کی یہ بچت نظر انداز کر دیگا۔ اس مقام پر مجھے یہ بھی بتا دینا چاہیے کہ آجکل کچھ لوگ اُردو رسم الخط میں ایسی اصلاحیں سوچ رہے ہیں کہ اعراب کی ضرورت ہی باقی نہ رہے یا اگر رہے تو بہت کم اور جو لکھا گیا ہے اس کے سوا کچھ اور نہ پڑھا جا سکے جس وقت یہ اصلاحیں مکمل ہو جائیں گی اُس وقت شاید کسی زبان کی تحریر اُردو کی تحریر کا مقابلہ نہ کر سکے گی۔

حقیقت میں اُردو کی تحریر میں اگر کوئی دقت ہے تو یہ کہ بعض آوازوں کے لیے کئی کئی حرف استعمال کیے جاتے ہیں۔ ا + ع، ت + ط، س + ث + ص، ز + ذ + ض + ظ، ہ + ح۔ ان میں سے ہر مجموعے کے حروف اُردو میں ایک ہی آواز ظاہر کرتے ہیں (عربی کا ذکر نہیں) جن آوازوں کے لیے ث، ح، ذ، ص، ض، ط، ظ، ع یہ آٹھ حروف

ایجاد کیے گئے ہیں وہ ہماری زبان میں موجود نہیں ہیں، اس لیے بظاہر یہ فیصلہ بالکل صحیح معلوم ہوتا ہے کہ یہ حرف اُردو کے حروفِ تہجی سے خارج کر دیے جائیں، مگر جہاں تحریر کی آسانی انہیں نکالنا چاہتی ہے وہاں بعض وجہیں اُن کی سفارش بھی کرتی ہیں۔ اوّل تو جن لفظوں میں یہ حرف آجاتے ہیں وہ اپنی اصل کا پتہ دیتے ہیں۔ اور یہ اتنی بڑی خوبی ہے کہ کوئی علم اللسان کا ماہر اس کے مقابلے میں تحریر کی آسانی کی کچھ بھی پرواہ نہ کرے گا۔ اُردو کے بعض لفظوں کا املا اُن کے تلفظ کے مطابق نہیں ہے مثلاً "بالکل" "خواہش" مگر ان میں بھی یہی خوبی موجود ہے۔ انگریزی الفاظ میں بھی بعض حروف محض اصل کا پتہ دینے کے لیے قائم رکھے گئے ہیں ورنہ تلفظ کے لحاظ سے اُن حروف کی املا میں کچھ ضرورت نہ تھی دوسرے بہت سے لفظ جو تلفظ میں یکساں اور معنی میں مختلف ہیں جب لکھ دیے جاتے ہیں تو اپنے معنی آپ بتاتے ہیں۔ جیسے ثواب + صواب۔ نال + نعل۔ نذیر + نظیر وغیرہ یہ بھی ایسی خوبی ہے کہ نظر انداز نہیں کی جا سکتی۔

یہ بات بھی غور کرنے کے قابل ہے کہ اُردو کا موجودہ طرزِ تحریر وہ ہے جو بہت خفیف سے تغیر کے ساتھ ایشیا کے کئی ملکوں، یورپ کے بعض خطّوں اور افریقہ کے زیادہ حصّے میں رائج ہے، اس لیے اگر ملک کی مشترکہ زبان کے لیے ہم اسی کو اختیار کرلیں تو جہاں اُردو زبان ہندوستان کی مختلف قوموں کو ایک کرسکتی ہے وہاں اُردو کی تحریر بھی مختلف ملکوں سے اتحاد پیدا کرنے کا ایک ذریعہ بن سکتی ہے۔ یہ ایسی صفت ہے جو ہندوستانی زبانوں میں اُردو کے سوا کسی کو نصیب نہیں۔ وجہ یہ ہے کہ اتحاد ہی نے اُردو کا بیج بویا اتحاد ہی نے اسے سینچا، اتحاد ہی کی ہوا میں یہ پودا پھیکا، پھولا، پھلا اور ایک چھتنار درخت ہوگیا۔ اس کے سائے میں اتحاد کی کیفیت ہے۔ اس کی ہوا میں اتحاد کا اثر ہے۔ اور اب بھی اُسے سر سبز رکھنے کے لیے اتحاد ہی کی آبیاری کی ضرورت ہے۔

رسم الخط پر اب ہم محققانہ نظر ڈالتے ہیں کیونکہ اب تک جو کچھ لکھا گیا تھا وہ سطحی

طور پر جو خیالات ذہن میں آ گئے تھے تحریر کر دیے گئے تھے۔ لیکن عالم علم اللسان اس مضمون کو کس نظر سے دیکھے گا وہ بھی ہم ذیل میں درج کرتے ہیں اور بعض جگہ اگر ہم اپنے کسی خیال کا دیگر الفاظ میں اعادہ کر دیں تو قابل معافی تصور کیے جائیں۔

کسی رسم خط کے محاسن و معائب دو طریقے سے پرکھے جا سکتے ہیں:-

(۱) بلحاظ خواندگی۔ (۲) بلحاظ کتابت

ہم ان دونوں پہلوؤں پر علیحدہ علیحدہ غور کرتے ہیں۔

ماہرین لسانیات (فلالوجسٹ) گروہ کا اتفاق ہے کہ ہر مکمل نظام تہجی میں (۱) ہر علیحدہ مفرد آواز کو ادا کرنے کے لیے ایک علیحدہ اور مستقل حرف (کیرکٹر) ہونا چاہیے اور مفرد اصوات کے علاوہ اور کسی آواز کو علیحدہ و مستقل حرف سے نہ ادا ہونا چاہیے۔ (۲) جو اصوات مفردہ اصلاً ایک ہوں، ان کے طول و اختصار، پستی و بلندی و دیگر تغیرات حالت کے ادا کرنے کے لیے مستقل حروف نہیں بلکہ مختلف حرکات یا اعراب ہونے چاہئیں۔

ہر ابجد یا نظام تہجی کے تمام حروف ان آوازوں کے جو بولنے میں پیدا ہوتی ہیں، مرئی نشانات ہوتے ہیں، یہ حروف تحریری زبان سے متعلق ہوتے ہیں، اور آوازیں تقریری زبان سے۔ حروف ہجائیہ کی خاص غرض یہ ہوتی ہے کہ تقریری زبان کو آنکھوں کے سامنے موزوں علامات کے ذریعہ سے لے آئیں، اس لیے حروف ہجائیہ کی خوبیوں کا معیار صرف یہ ہے کہ وہ کس صحت و احتیاط کے ساتھ اصوات کی ترجمانی و نمایندگی کرتے ہیں۔ غیر ضروری حروف کی افراط اور مرکب حروف علت یا مرکب در مرکب حروف کا صحیح ہونا کسی ابجد کے حسن و خوبی کی دلیل نہیں ہو سکتی بلکہ اس کے قبح و نقص کے شواہد سے ہے۔

اس معیار پر پرکھنے کے بعد اردو نظام تہجی اپنے حریفوں سے نہایت آسانی سے بازی لیجاتا ہے، اس میں تمام بڑی، چھوٹی، مفرد آوازوں کو ادا کرنے کے لیے مفرد حروف علت و مفرد حروف صحیحہ کی صورت میں حروف و نشانات موجود ہیں لیکن ساتھ ہی

ساتھ مرکب حرفِ علت اور مرکب حروفِ صحیح کی آوازوں کے ظاہر کرنے کے لیے کوئی حرف نہیں ہے۔ ناگری نظام تہجی کے مرکب حرفِ علت اور مرکب حروفِ صحیحہ کی آوازوں کو ظاہر کرنے کے لیے پیچیدہ اور غیر ضروری حروف ایجاد کر کے اُردو نظام تہجی کو خواہ مخواہ دشوار نہیں بنایا گیا ہے۔ نہ دو قسم کے حروف یعنی ابتدائی و ثانوی قرار دیکر اس پر غیر ضروری بار ڈالا گیا ہے۔

اُردو نظام ہجائیہ میں حسبِ ذیل دس آوازیں ہیں :-

(۱) تین اصلی حروفِ علت ہیں جو کسی علیحدہ حرف سے نہیں بلکہ نشانات سے ظاہر ہوتے ہیں، ان نشانات کے نام فتحہ، ضمہ، و کسرہ ہیں۔ (۲) تین ویسے ہی کھینچکر پڑھے جانیوالے حروفِ علت ہیں جو ماقبل آہستہ پڑھے جانے والے حروفِ علت کے بعد ہی آتے ہیں۔ مثلاً الف ساکن ماقبل مفتوح سے لمبی آواز پیدا ہوتی ہے جیسے چال اور سال میں۔ اسی طرح واؤ ساکن ماقبل مضموم سے ایسی آواز پیدا ہوتی ہے جیسے نور اور طور میں۔ اسی طرح یائے ساکن ماقبل مکسور سے ایسی آواز پیدا ہوتی ہے جیسے نیل اور فیل میں۔

(۳) دو ملے ہوئے حروفِ علت، واو ساکن، ماقبل مفتوح سے ایسی آواز پیدا ہوگی جیسے غور اور جور میں۔ اسی طرح یائے ساکن ماقبل مفتوح سے ایسی آواز پیدا ہوگی جیسے قیصر میں۔

(۴) دو فارسی کے حروف ہیں جو مجہول کہلاتے ہیں۔ (۱) واؤ مجہول جیسے شور میں (۲) یائے مجہول جیسے تیل میں۔

اصل میں اُردو نظام تہجی کا ماخذ عربی ہے لیکن گلچینی یا اخاذی کا ملکہ جو اُردو زبان کی سرشت میں داخل ہے رسم الخط کے سلسلہ میں بھی ظاہر ہوا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اُردو نظام تہجی عربی، فارسی اور سنسکرت نظاماتِ ابجدی کا گلدستہ بن گیا اور علاوہ اس کے بہت سے غیر عربی النسل حرف بھی شامل ہو گئے۔ جیسے پ، ٹ، چ، ڈ، گ، اور ہائے دوچشمی۔

ان محاسنِ ترکیبی کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ اُردو نظامِ تہجی صوتی حیثیت سے اتنا مکمل بن گیا جتنا کسی انسانی زبان کے لیے اب تک ممکن تھا۔ عربی حروفِ تہجی پر بحث کرتے ہوئے شہیر ولیم جانسن نے کہا ہے کہ مکمل زبان وہ ہے جس میں ہر وہ خیال جو انسانی دماغ میں آسکتا ہے، نہایت صفائی اور زور کے ساتھ ایک مخصوص لفظ کے ذریعہ سے ظاہر کیا جا سکے۔ خیالات اگر سادہ ہوں تو الفاظ بھی سادہ اور اگر خیالات مشکل ہوں تو وہ بھی مشکل۔ اسی اصول کی بنا پر مکمل رسم الخط وہ ہے جس میں اُسی زبان کی ہر آواز کے لیے ایک مخصوص نشان ہو۔ اس لحاظ سے قدیم فارسی درجۂ کمال کے قریب تر ہے، لیکن عربی نظامِ تہجی جسے تمام اسلامی قوموں نے اختیار کیا ہے، عربی لکھنے کے لیے اس درجہ مکمل ہے کہ ایک حرف بھی بغیر دشواری محسوس کیے ہوئے گھٹایا بڑھایا نہیں جا سکتا۔

مسٹر موصوف کے یہ خیالات اُردو نظامِ تہجی پر بھی حرف بحرف چسپاں ہوتے ہیں۔

اب اس مسئلہ کو کتابت کے نقطۂ نظر سے دیکھو، ایک ضروری امر جسے دیگر نظاماتِ ابجد میں نظر انداز کر دیا جاتا ہے یہ ہے کہ تحریری نشانات دو قسم کے ہوتے ہیں۔ حروفِ علت اور حروفِ صحیح۔ حروفِ علت تمام قسم کی آوازوں کی بنیاد ہیں، اور حروفِ صحیحہ کے اُتار چڑھاؤ کو بتانے میں حروفِ صحیح اصواتِ طبعی کی نیابت کرتے اور اُن کے باہمی تغیرات کو ظاہر کرتے ہیں۔ حروفِ علت کوئی اپنی مستقل آواز نہیں رکھتا بلکہ اس کا کام حروفِ صحیح کے تلفظ میں مدد دینا ہے اور بس۔ دیگر زبانوں نے ان دونوں قسم کے حرفوں کے درمیان اس امتیاز کو نظر انداز کر دیا ہے، لیکن اُردو نے حرفِ علت کو کوئی مستقل حرف نہ تسلیم کر کے اس امتیاز کو قائم رکھا ہے، اس لحاظ سے کوئی زبان اسکی ہمسری کا دعویٰ نہیں کر سکتی۔ اس میں حروفِ علت حرفوں سے نہیں بلکہ صرف اعراب سے ظاہر ہوتے ہیں، حروفِ علت بذاتِ خود مستقل آوازیں نہیں ہیں بلکہ محض اصوات کے لب و لہجہ، اُتار چڑھاؤ میں مدد دیتے ہیں۔ اُردو کتابت حروفِ علت کو بحیثیت حروف کے کوئی جگہ نہیں دیتی بلکہ صرف نشانات سے اُنھیں ظاہر کرتی

ہے اور یہ بالکل بجا ہے۔

یہ اعتراض کہ معمولی تحریر میں نشانات نہ ہونے سے ایک ہی لفظ مختلف طریقوں سے پڑھا جا سکتا ہے بالکل بے بنیاد ہے، جیسا کہ ایک مشہور عالم نے کہا ہے کہ ان نشانات کے حذف کر دینے سے پڑھنے والے ہیں اس قدر بلکہ دمہارت ہو جاتی ہے کہ وہ نشانات کی مدد بغیر پڑھ لیتے یہ نشانات اس غرض سے نہیں حذف کیے جاتے کہ مبتدی یا وہ لوگ جو زبان سے ناآشنا ہیں بھٹک جائیں۔ اُردو طرز تحریر میں ایک خاص بات یہ بھی ہے کہ پڑھنے اور لکھنے میں کم محنت صرف ہو۔ اُردو طالب علم کی ترقی تعلیم کا یہ ایک جزو ہے کہ وہ بلا نشانات کے بھی صحیح لکھ پڑھ سکے اور اس میں شبہ نہیں کہ جلد ہی وہ ایسا کرنے کے قابل ہو جاتا ہے۔ لیکن ہندی کا طریقہ تحریر کوئی ایسی تعلیم نہیں دیتا۔ ہندی عبارت سے کوئی منترہ (نشان) ہٹا دو اور بیچارہ ہندی کا طالب علم اندھے کی طرح بے بس و لاچار ہو جاتا ہے۔

یہ خیال کہ اُردو خطِ شکست اس قدر مشکل اور بے قاعدہ ہے کہ پڑھنا دشوار ہے بالکل طفلانہ ہے۔ ہر زبان کے روزمرہ کی طرح ہر طرزِ تحریر کی ایک رواں اور شکست صورت بھی ہے، اُردو میں یہ کوئی انوکھی بات نہیں ہے، اس کا فائدہ اُس کے رواں ہونے ہی میں ہے۔ اور اس کا استعمال صرف اُن کے لیے ہے جو اُردو زبان سے بخوبی واقف ہیں۔

اُردو کتابت ایک طرح کی مختصر نویسی ہے، ہر حرف کی پوری شکل کے علاوہ ایک مختصر صورت بھی ہوتی ہے اور یہ انہی مختصر صورتوں کو جوڑ کر لفظ بنانے کا طریقہ ہی ہے جس نے اُردو لکھنا اس قدر سہل کر دیا ہے۔ اس سے حسب ذیل فوائد ہیں:۔

(۱) جگہ کی کفایت۔ (۲) وقت کی کفایت (۳) لکھنے والے اور پڑھنے والے دونوں کے لیے قوت (انرجی) کی کفایت۔

اُردو رسم خط تھوڑے تغیر کے ساتھ تمام اسلامی ممالک میں رائج ہے۔ بنگال کے

مشرقی سرے سے لیکر مغرب میں طرابلس اور مراکش تک استعمال کیا جاتا ہے۔ ایک ایسے رسم الخط کے استعمال کرنے میں جو نہ صرف ہندوستان بلکہ افغانستان۔ بلوچستان اسلامی ترکستان، ایران، عراق، عرب، شام فلسطین، ترکی، مصر اور افریقہ کی بعض دیگر ریاستوں میں بھی رائج ہے جو بین الاقوامی فوائد ہیں وہ ایسے کم نہیں کہ نظرانداز کیے جاسکیں۔

لٹریچر

غیر اُردو داں طبقہ کا عام خیال ہے کہ اُردو زبان کوئی قابلِ ذکر لٹریچر نہیں رکھتی۔ اُردو زبان کے بعض بڑے ماہرین مثلاً سر چارلس لائل اور سر چارلس گریسن بھی اس خیال سے صاف اور پرزور طریقہ اختلاف نہیں ظاہر کرتے۔ یہ یقین گو اس قدر عام ہے لیکن حقیقت و اصلیت سے کوسوں دور ہے۔

یہ سچ ہے کہ ترقی یافتہ مغربی زبانوں کے مقابلہ میں اُردو کوئی وسیع علم ادب نہیں رکھتی لیکن ہندوستان کی ملکی زبانوں کے لحاظ سے اُردو کو بے مایہ کہا جائے تو یہ دعویٰ نہایت آسانی کے ساتھ غلط ثابت کیا جاسکتا ہے۔ لٹریچر کی وسعت کوئی مستقل بالذات شے نہیں ہے بلکہ اضافی شے ہے جسکا اندازہ اور زبانوں کی نسبت سے ہی ہوسکتا ہے۔ اس بنا پر دنیا کی کوئی زبان قطعی طور پر وسیع و سرمایہ دار نہیں کہی جاسکتی۔

سرمایۂ ادب کو دو حصوں میں تقسیم کرسکتے ہیں۔ (۱) اصل (۲) نقل۔ اصل سے مُراد مجتہدانہ مضامین ہیں، نقل میں وہ ذخیرہ شامل ہے جو دوسرے لٹریچر سے ترجمہ، تالیف و تلخیص کے ذریعہ حاصل کیا جاتا ہے۔ اب اُردو لٹریچر پر ان دونوں پہلوؤں سے غور کرو۔

پہلے نقل کو لو، نظم و ڈراما میں دنیا کی بہت سی زبانوں نے اُردو میں جگہ پائی ہے۔ ہومر کی ایلیڈ، مہابھارت، رامائن (مصنفۂ والمیکی اور تلسی داس) کالیداس کی شکنتلا، میگھ دوت) اور دوسری تصنیفیں، ملٹن کی فردوسِ گم گشتہ (پیراڈائز لاسٹ) اور ٹیگور

کی گیتا نجلی، چترا، نیز دیگر تصانیف اُردو داں حضرات کی نظر سے بآسانی گزر سکتی ہیں۔

شیکسپیر کو غالباً ان میں سب سے زیادہ مقبولیت کا درجہ حاصل ہے۔ اس کے بہت سے ناٹکوں کا ترجمہ ہو چکا ہے جو اسٹیجوں پر کھیلے جاتے ہیں اتھیلو، خونِ ناحق (ہیملٹ) سفید خون (کنگ لیر)۔ (دی ٹیمپیسٹ) بزم فانی (رومیو اور جولیٹ) انگشتری (سمبلائن) دلفروش (دی مرچنٹ آف وینس) مرید شک (ونٹرز ٹیل) شہیدِ ناز (مشیر رفار مشیرز) بھول بھلیاں (دی کامیڈی اوف ایررز) اور اڈیولائنک اٹ عرصہ سے اُردو میں موجود ہیں شیریڈن کے بعض ناٹک مثلاً اسیر حرص (پزیرو) سوفوکلس اور سیفو، وبیلیٹی اور گیٹے، لانگ فیلو اور ساؤدی، شیلے اور بائرن اور ورڈس ورتھ اور ٹینی سن کی اکثر چیدہ نظمیں اُردو میں آگئی ہیں۔

ناول یا فسانہ نگاری میں رینالڈ کے بعد جس کی تصنیفوں میں ہندوستانی نوجوانوں کے لیے جادو بھرا ہے، اسکاٹ، تھیکری، کریلی اور کانن ڈائل مقبول ترین مصنفین میں سے ہیں ان کی بہت سی تصنیفات کے اُردو ترجمے وادی گنگا میں کہیں زیادہ دلچسپی کے ساتھ پڑھے جاتے ہیں، بہ نسبت اسکے کہ اُن کے خاص وطن سواحل ٹیمز پر پڑھی جاتی ہوں۔ میلکم حیدر کی تقریباً تمام تصنیفیں اور ٹیگور کے اکثر قصے بھی اُردو میں ترجمہ ہو چکے ہیں۔ آر۔ ایل اسٹونسن رائڈر ہیگرڈ، اسکر وائلڈ، برنرڈ شا اور ایچ۔ جی ویلز بھی مقبول ہو رہے ہیں۔

نثر لکھنے والوں میں میکالے اور کارلائل، اسمائلز اور لیوبک اُردو داں طبقہ میں روشناس ہو چکے ہیں۔

فلسفہ اور علم النفس میں افلاطون کے متعدد مکالمے، ارسطو کی تصانیف اور چانکیہ کے نصایح کے انتخابات، سینکا کے خیالات (رفلکشنز) برکلے کے مبادی و مکالمات، لیبان کی روح الاجتماع (دی کراؤڈ) اور فلسفہ انقلاب الامم (سائیکالوجی آف دی ایوولوشن آف پیوپلز) نیز بیکن، ہیوم، کینٹ، مل، اسپنسر، جیمس اور اسٹاؤٹ

کی تصانیف کے حصّے اُردو میں ہیں۔

تاریخ وسیر میں پلوٹارک کی مشاہیر یونان وروما (لائیوز آف امینینٹ گریکس اینڈ رومنز) تھیکرا اور شویل کی تاریخ یورپ (جنرل ہسٹری آف یورپ) ڈوزی کی اسلامک اسپین، ویلس کی تاریخ روس (رشیا) ایبٹ کی نپولین اعظم (نپولین) گرین ہسٹری آف دی انگلش پیپل، ونسنٹ اسمتھ' ہند قدیم (این شینٹ انڈیا) الفنسٹن کی تاریخ ہندوستان (ہسٹری آف انڈیا) میلکم کی تاریخ ایران (ہسٹری آف پرشیا) اور گبن کی رومن امپائر کے حصّے قابلِ ذکر ہیں جن سے اسی پایہ اور مرتبہ کی اور تصانیف کی تشریح ہوسکتی ہے۔

سیاسیات واقتصادیات کے میدان میں ذیل کے نام کافی ہونگے:۔

ارسطو کی پالیٹکس، مل کی آزادی (لبرٹی) معلم السیاست (ریپرزنٹیٹو گورنمنٹ) اور سیاست مدن (پولیٹکل اکانمی) مِل کی قوانین دولت (لاز آف ویلتھ) مارلے کی علم السیاست (مکیاولی) اور ریمنی سینبرا کرزن کی پرشیا' میسرنجی کی ڈیوٹیز آف مین، شوسٹر کی تفتاءایران (اسٹرینگلنگ آف پرشیا) بلنٹ کی فیوچر آف اسلام۔ وینبری کی مستقبل اسلام (فیوچر آف اسلام) نیز سیلے وینچلی، ولسن وپولک، سجوک وجیونز، مارشل و مارین کے بعض حصّے۔

علم سیاست (پولیٹکل سائنس) کے ساتھ ساتھ فلسفیانہ تاریخ کا شعبہ بھی ہے اور اس شعبہ میں بکل کی تاریخ تمدن، ہسٹری آف سیولیزیشن، گوئزٹ کی تمدن انگلستان، سویلزیشن ان انگلینڈ لی بان کی تمدنِ عرب (سویلزیشن آف دی عرب) تمدن ہند سویلزیشن آف انڈیا) لیکی کی تاریخ اخلاق یورپ (یوروپین مارلز) ڈریپر کی انٹلکچول ڈویلپمنٹ آف یورپ اور دت کی تہذیب قدیم ہندوستان (اینشنٹ انڈین سیولیزیشن) کے ترجمے بتائے جاسکتے ہیں۔

تعلیم میں ٹاڈ وغیرہ کی چھوٹی چھوٹی کتابوں کے علاوہ اُردو، اسپنسر، بین، فرابیل پسٹلاٹلزی، ہربرٹ، اور مانٹیسوری کی تصانیف سے آشنا نہیں ہے۔

سائنس میں ڈریپر کی معرکۂ مذہب و سائنس (کانفلکٹ بٹون ریلیجن اینڈ سائنس) جیسے عام طرز کے کئی معقول رسالوں کے علاوہ اُردوداں طبقہ ڈارون اور ولیس، ہکسل اور ہکسلے، لائل اور لیکی، ٹنڈال اور بوہن، کلون اور میکسول، کروکس اور لاج کے انکشافات و تصنیفات سے معقول حد تک آشنا ہے۔

قانون، فقہ، اور طبی کتابوں کے تراجم کا ذکر کرنا بے سود ہے۔ کیونکہ ان مضامین کی بہت سی کتابیں بمقتضائے ضرورت اُردو میں منتقل ہو کر آگئی ہیں۔

یہ واضح رہے کہ فہرست بالا میں جامعیت و استقصار کا خیال بالکل نہیں رکھا گیا ہے جو نام برجستہ یاد آسکے لکھ دیے گئے ہیں تاکہ ناظرین کے ذہن میں ایک خاکہ قائم ہو جائے کہ اُردو لٹریچر غیر زبانوں کے خزانے سے کس قدر بہرہ یاب ہے، ان کی مکمل فہرست تیار کرنے کے لیے سینکڑوں صفحے چاہئیں۔

ایک دوسرا امر قابلِ لحاظ یہ ہے کہ فہرست بالا صرف مغربی لٹریچر تک محدود ہے اس کے علاوہ مسلمانوں کے لٹریچر کا سارا عربی و فارسی خزانہ اور ہندوؤں کی سنسکرت و ہندی کا خزانہ ایک حد تک اُردو میں آگیا ہے۔ قرآن شریف، گیتا، پران، مہابھارت اور رامائن میں سے ہر ایک کے اُردو میں متعدد ترجمے ہیں، پیغمبر اسلام، حضرت مسیح، سری کرشن، سری رامچندر، گوتم بودھ، گرونانک اور کبیرداس کی سوانح و تعلیمات، ہندو سنیاسی اور جوگیوں مثلاً وشسٹھ، اہل معرفت و صوفی شعرا مثلاً مولانا روم اور حافظ، معلم اخلاق و الہیات مثلاً سعدی و غزالی۔ رزمیہ شعراء مثلاً فردوسی، فلسفی مثلاً ابن سینا، مورخین مثلاً ابن خلدون، ابن خلکان اور فرشتہ کی تصانیف اُردو لٹریچر کے خزانہ میں بعض بہترین جواہرات میں سے ہیں۔

مجتہدانہ وطبعزاد تصانیف پر طویل گفتگو کی ضرورت نہیں، ان کے لیے کوئی ایسا مادی معیار قائم نہیں کیا جا سکتا، جس پر مختلف مصنفین کی خوبیاں پرکھی جا سکیں صرف مذاق سلیم ہی اس کا فیصلہ کر سکتا ہے۔ شعرا کے طبقہ میں میر و درد، غالب و حالی، انیس و دبیر، آتش و داغ اپنے اپنے رنگ میں روح شاعری کے بہترین نمونے ہیں۔ حال ہی میں اکبر الٰہ آبادی کا نام سب سے زیادہ نمایاں حیثیت رکھتا ہے، اُن کے کلام میں دقتِ نظر اور حکیمانہ نکتہ سنجی کے ساتھ ظرافت و شوخی کا امتزاج دنیائے شاعری کا ایک بے مثل معجزہ ہے۔ اُن کے بعد اقبال کا نمبر آتا ہے جو ایک عرصہ سے بھگوت گیتا کے انداز پر اپنا پر قوت فلسفۂ عمل دنیا کے سامنے حیرت انگیز بلند خیالی و اثر کے ساتھ پیش کر رہے ہیں۔ اُن کی بعض فارسی نظموں کا ترجمہ کیمبرج کے فاضل پروفیسر نکولسن نے انگریزی میں کیا ہے۔ اُن کے بعد حسرت و ریاض ہیں جو کسی دوسری زبان کے شعراء سے کمتر نہیں رکھے جا سکتے۔

ناول یا افسانہ نگاری میں مولوی نذیر احمد، مرزا رسوا، عبد الحلیم شرر، رتن ناتھ سرشار، راشد الخیری، خواجہ حسن نظامی، پریم چند کی کتابیں پڑھنے ہی سے تعلق رکھتی ہیں۔ پرانے قصے کہانی کی کتابوں کا تو کچھ ذکر ہی نہیں۔ ان میں سے بہت سی کتابوں کا انگریزی اور ہندی میں ترجمہ ہو گیا ہے۔

سنجیدہ نثر نویسوں میں اُردو سر سید احمد، مولوی نذیر احمد، محمد حسین آزاد، چراغ علی، حالی، شبلی، کرامت حسین، سید سلیمان اور ابو الکلام آزاد پر بجا فخر کر سکتی ہے، محمد حسین آزاد کی شاعرانہ نثر اور نازک خیالی اعجاز سے کم نہیں، نذیر احمد کو اُردو، فارسی، و عربی زبان پر ایک حیرت انگیز قدرت حاصل تھی، شبلی ایک بلند پایہ مورخ تھے لیکن بحیثیت ایک ادیب اور نقاد کے اُن کی عظمت کا پایہ اور بھی بلند تھا۔ سیرۃ نبوی (چھ جلدوں میں) اُن کے علمی فضل و کمال کی بجائے خود ایک ناقابل انکار

شہادت ہے۔ شعر العجم (۵ جلدوں میں) جیسی جامع و مانع تصنیف نے مشہور مستشرق پروفیسر براؤن کو اُن کا گرویدہ بنا دیا ہے، پروفیسر موصوف نے اپنی کتاب لٹریری ہسٹری آف پرشیا (تاریخ ادبیات ایران) کی تیسری جلد میں اس سے بہت سے اقتباسات نقل کیے ہیں۔ کرامت حسین (نج الہ آباد ہائیکورٹ) لسانیات اور علم المعاشرت کے ممتاز عالم تھے، سید سلیمان، شبلی کے تاریخی و علمی ترکہ کے وارث ہوئے ہیں اور نہایت سرگرمی کے ساتھ اپنے پیشرو کے نقش قدم پر چل رہے ہیں، جہاں تک مذہب، فقہ اور تصوف کا تعلق ہے اُردو لٹریچر کا خزانہ قطعاً بے مایہ نہیں۔

پچھلے چند سال کے اندر اُردو لٹریچر کی اشاعت و تبلیغ کے لیے تین مرکز قائم ہوئے ہیں۔ ان میں سب سے بڑا دارالترجمہ عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد دکن ہے، جہاں تمام مفید مضامین مثلاً تاریخ، علم المعیشت، منطق، اخلاقیات، نفسیات، مابعد الطبیعیات، اقتصادیات، ریاضیات، علم الحیات، طبعیات، علم کیمیا وغیرہ کی انگریزی کتابوں کے تالیف و ترجمہ کا کام نہایت تیزی کے ساتھ ہوتا ہے۔ دوسرا مرکز انجمن ترقی اُردو ہے جس کا صدر دفتر اورنگ آباد دکن ہے، اس انجمن نے اب تک کئی درجن کتابیں بالخصوص مغربی علوم و فنون مثلاً علم الحیوانات، علم طبقات الارض، علم النفس، علم نباتات اور علم المعاشرت کے متعلق شائع کی ہیں، ان کے علاوہ ایک تیسرا مرکز مجلس دارالمصنفین یا شبلی اکاڈیمی ہے جو اپنے بانی کے نام سے موسوم ہے اور جسکا دفتر اعظم گڑھ (صوبۂ متحدہ) میں ہے، اس کا تعلق زیادہ تر مشرقی علوم و فنون سے ہے، تاہم اُس نے یورپی فلاسفہ اور علمائے نفسیات مثلاً برکلے اور لیبان کے متعلق بھی چند کتابیں شائع کی ہیں۔

غرض ان واقعات و مشاہدات کا مطالعہ تمام غیر متعصب ناظرین کو یہ سمجھا دینے کیلئے کافی ہے کہ اُردو لٹریچر گو غیر معمولی طور پر وسیع اور مکمل نہو تاہم اس قدر مفلس و بے مایہ بھی نہیں ہے جتنا عموماً خیال کیا جاتا ہے اور ہندوستان کی دیگر زبانوں کے مقابل میں تو اپنی ہستی برقرار رکھنے کی پوری صلاحیت رکھتا ہے۔

سیر المصنفین

اردو کی پیدائش[1]

جب دو صاحب زبان قومیں ایک دوسرے سے ملتی جلتی ہیں اور آپس میں رشتۂ اتحاد وارتباط قائم ہوتا ہے تو قانونِ فطرت کے مطابق اخلاق، مذہب، زبان، طرز بود و باش، ادب وآداب، لباس اور دیگر شعائر پر ایک دوسرے کا اثر نامعلوم طریقہ سے شروع ہو جاتا ہے اور رفتہ رفتہ یہ اثر کچھ دنوں میں ایک صورت اختیار کر لیتا ہے اور سب کو نظر آنے لگتا ہے، اس قاعدۂ کلیہ میں کوئی استثناء نہیں جن لوگوں نے تاریخ عالم کا مطالعہ کیا ہے وہ اس امر کی بھی شہادت دے سکتے ہیں کہ ایسی حالت میں دیگر امور متذکرۂ بالا کی نسبت دونوں قوموں کی زبان پر خصوصاً زیادہ اثر پڑتا ہے کیونکہ اظہارِ مطالب کیلیے ہر شخص وہ لفظ استعمال کرنے کی قدرتاً کوشش کرتا ہے جسکو دوسری قوم کا فرد بآسانی سمجھ لے اور یہ جب ہی ممکن ہے کہ آخر الذکر قوم کی زبان کا لفظ بولا جائے۔ اس طریقہ سے دونوں قوموں کے افراد روزمرہ کے کاروبار چلانے کے لیے کچھ الفاظ ایک دوسرے کی زبان کے سیکھ لیتے ہیں اور یہ سلسلہ برابر جاری رہتا ہے یہاں تک کہ ایک زبان کے بہت سے الفاظ دوسری زبان کے اصلی الفاظ بن جاتے ہیں۔

انگریزی زبان جو آجکل مخزنِ علوم وفنون بنی ہوئی ہے۔ اس میں اُردو سے لیکر لاطینی و یونانی زبانوں تک کے الفاظ پائے جاتے ہیں۔ علاوہ ایرین زبان ہونے کے اس کی

---

[1] اس مضمون میں جابجا آب حیات سے آبیاری کی گئی ہے۔ ۱۲ تنہاؔ

وجہ یہ بھی ہے کہ انگریزوں کو دنیا کی تمام قوموں سے خوب ملنے جلنے کا واسطہ رہا ہے اس لیے ان قوموں کی زبانوں کے بہت سے الفاظ بجنسہ اُن کی زبان میں داخل ہو گئے ہیں اور ہوتے جاتے ہیں۔ پس ہماری زبان کی ابتدا اُسی وقت سے ہو گئی تھی جب سے کہ مسلمان اس ملک میں داخل ہونے شروع ہو گئے تھے، یہ صحیح ہے کہ وہ زبان جو اُس وقت ہندو اور مسلمان بغرض اداے مطالب بولتے تھے اُردو نہیں کہلائی جا سکتی، تاہم اختلاطِ الفاظ کی بنیاد پڑ چکی تھی اور یہی اختلاطِ الفاظ آگے چلکر ہماری زبان کی پیدائش کا باعث ہوا۔

ابو ریحان بیرونی نے جو علامۂ البیرونی کے نام سے موسوم ہے اور جبکا شمار دربار غزنوی کے افاضل واکابر میں ہے ہندوؤں کی قدیم علمی درسگاہوں میں طالبعلمی کرکے سنسکرت حاصل کی، اور ہندوؤں کے علوم عربی میں اور عربوں کے علوم سنسکرت میں منتقل کیے اور برسوں اُن شہروں میں رہکر جہاں اسلام کا نام ونشان بھی نہ تھا یہاں کی مروجہ زبانیں سیکھیں۔ اُسی عہد سے وابستہ فارسی کا مشہور شاعر مسعود سعد سلمان ہے جسکی نسبت تذکرۂ مجمع الفصحا میں لکھا ہے" وے راسہ دیوان بودند تازی، ہندی، پارسی" اور مولانا شبلی لکھتے ہیں" تمام تذکرے متفق اللفظ ہیں کہ ہندی زبان میں اُس نے ایک دیوان لکھا تھا" یہ غزنویوں کے عہدِ اوّلین کا ایک نامور مسلمان شاعر تھا وہ لاہور میں پیدا ہوا تھا، اگرچہ خاندانی لحاظ سے وہ عجمی تھا تاہم اُس نے اپنے وطن ولادت کی زبان میں بھی ایک دیوان مرتب کر ڈالا۔

سنہ ۱۱۹۳ء میں جبکہ شہاب الدین غوری نے رائے پتھورا پر فتح پائی تو چاند کوی ایک نامی شاعر نے پرتھی راج راسو لکھا۔ اس کتاب کے ہر صفحہ میں فارسی، عربی کے کئی کئی لفظ نظر آتے ہیں۔ اگر محمود غزنوی کے وقت کی نظم یا نثر مل جائے تو اُس میں بھی عربی فارسی کے الفاظ پائے جائیں۔

کشمیر کے حکمران سلطان زین العابدین نے جو فارسی کے علاوہ ہندی اور تبتی زبانوں میں بھی پورا دخل رکھتا تھا، فارسی کتابوں کا ترجمہ ہندی میں اور بہت سی ہندی کتابوں کا ترجمہ

فارسی میں کرایا۔ اور سب سے پہلے اسی کے حکم سے مہا بھارت اور راج ترنگنی (قدیم تاریخ کشمیر)
کا ترجمہ فارسی میں ہوا۔ اسی عہد کے قریب قریب امیر خسرو نے جو ۷۲۵ھ ۱۳۲۵ء میں فوت ہوئے
خالق باری تصنیف کی۔ یہ کتاب بازار میں عام طور پر فروخت ہوتی ہے اور معلوم ہوتا
ہے کہ اس کا سبب تصنیف یہ ہے کہ جو طلبا فارسی سیکھنے کا شوق رکھتے ہوں اس کو پڑھیں
کیونکہ اس میں اکثر فارسی، عربی الفاظ کا ترجمہ یہاں کی اس وقت کی عام اور مروجہ زبان میں
کیا گیا ہے، نمونہ کے طور پر ایک شعر کافی ہے ؎

بیا برادر آؤ رے بھائی　　بنشیں مادر بیٹھ ری مائی

اس وقت سے لیکر انیسویں صدی عیسوی کے اختتام تک یہ کتاب مبتدی طلاب کا وظیفۂ
زبان رہی ہے، البتہ بیسویں صدی کے آغاز سے اس کی کساد بازاری ہوگئی ہے اور وجہ
صرف یہ ہے کہ اب فارسی زبان حاصل کرنے کی ضرورت باقی نہیں رہی۔

امیر خسرو آنکھوں کا ایک مجرب نسخہ دوہروں کی بحر میں اس طرح لکھتے ہیں کہ:۔

لود، پھٹکری، مُردہ سنگ　　ہلدی، زیرہ، ایک ایک ٹنگ
افیون چنا بھر، مرچیں چار　　اُرد برابر تھوتا ڈار
پوست کے پانی پوٹلی کرے　　ترت پیڑ نینوں کی ہرے

ظاہر ہے کہ اس عہد میں مسلمانوں کی زبان بھی آپس کے تعلقات کی بنا پر ضرور برج بھاشا
ہوگی جسکو وہ آدھی اپنی اور آدھی اُن کی ملا کر ٹوٹی پھوٹی بولتے ہونگے۔ ان زبانوں کی کوئی نثر
تصنیف نہیں ملتی۔ البتہ امیر خسرو کی ایک غزل جس کا مطلع ہے ؎

زحالِ مسکیں مکن تغافل، دورائے نیناں بنائے بتیاں
کہ تابِ ہجراں ندارم اے جاں، نہ لیہو کاہے لگائے چھتیاں

اور پہیلیاں، مکرنیاں اور گیت پتہ دیتے ہیں کہ ساتویں صدی ہجری میں یہاں کے مسلمان خاصی بھاشا
بولتے ہونگے۔ بلکہ اس سے یہ بھی نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ مسلمان بھی اُس وقت یہیں کی

زبان کو اپنی زبان سمجھنے لگے تھے اور اس زبان کو کس شوق اور محبت سے بولتے تھے بیشک ہندوؤں کی نسبت اُن کی زبان پر فارسی عربی الفاظ زیادہ آجاتے ہونگے لیکن جتنا یہاں رہنا سہنا اور استقلال زیادہ ہوتا گیا اُتنا ہی روز بروز فارسی ترکی نے ضعف اور یہاں کی زبان نے زور پکڑا ہوگا۔

پندرہ صدی عیسوی میں جبکہ سکندر لودی سریر آرائے سلطنت تھا اول کایستھ فارسی پڑھکر شاہی دفتر میں داخل ہوئے اور عربی فارسی کے الفاظ اُن کی زبانوں پر بکثرت آنے لگے۔ اور اسی سکندر لودی کے زمانہ میں کبیر شاعر بنارس کے رہنے والے علم میں اَن پڑھ تھے۔ گرو راما نند کے چیلے ہوکر ایسے ہوئے کہ خود کبیر پنتھوں کا مت نکالا، اُنکے دوہروں میں فارسی عربی کے الفاظ بکثرت موجود ہیں۔ مثلاً

دین گوایو دُنی سے دنی نہ آیو ہاتھ　　　　پیر کہاڑی ماریو گافِل اپنے ہاتھ
(دُنیا)　　　　(غافل)

کبیر سر پر سراہی کیوں سوئے سُکھ چین　　　　کوچ نگارا سانس کا باجت ہے دن رین
(نقارہ)

گرو نانک کی تصنیفات میں بھی جو سنہ ۱۵۳۹ء کے بعد فوت ہوئے عربی فارسی کے الفاظ پائے جاتے ہیں:-

ساس ماس سب جیو تمہارا　　　　تو ہی کھرا پیارا　　　　نانک شاعر ایو کہت ہے　　　　سچے پروردگارا

جو چیزیں وظیفۂ عبادت کے طور پر ہیں اُن میں بھی الفاظ مذکورہ اسی کثرت سے ہیں جپ جی کے دو فقرے ملاحظہ ہوں:-

وارن جاؤں اَن ایک بار　　　　تو سدا سلامت جی نرنکار

سولھویں صدی عیسوی میں کہ شیر شاہی عہد تھا ملک محمد جائسی نے پدماوت کی داستان نظم کی اور یہ التزام کیا کہ فارسی عربی کا ایک لفظ نہیں آنے دیا اور پھر بھی ہندی رکھی ہے، اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ مسلمان اس ملک میں رہ کر یہاں کی زبان کو کس پیار سے بولنے لگے تھے۔ بعد ازاں اکبر کے عہد سے جبکہ مسلمان ہندوؤں سے شیر و شکر ہوگئے

یہ نوبت پہنچی کہ ہند و شرفا بلکہ راجہ مہاراجہ ایرانی لباس پہنکر اور فارسی بولکر فخر کرنے لگے جس طرح کہ آجکل انگریزی بولنے اور انگریزی لباس پہننے پر فخر کیا جاتا ہے۔

سترھویں صدی عیسوی میں بابا تلسی داس برہمن نے جو ضلع باندہ کے رہنے والے تھے اور پنڈت اور شاعر اور فقیر تھے، رامائن کو بھاشا میں اس طرح ترجمہ کیا کہ یہ لاثانی کتاب مطبوع خاص و عام ہوئی۔ ان کے دوہروں میں بہت اور کتاب مذکور میں کہیں کہیں فارسی عربی کے الفاظ موجود ہیں۔

سنکاسے سیوک سکل چلے سوای کچھ پائے ۔ گھر ترو ترو بن و باگ و بر ڈیرا دیو لگائے

گھر بسواس بچن ہٹ بولے کتنی بھینگ کلہ بھی کھولے ۔ رام انیک گریب نواجے لوک بید بر بر و بر اجے

گنی گریب گرام نرناگر پنڈت مو ڑھے ملین رو جاگر ۔ مایا کو لے کر کر لیبے ہاتھ تلسی داس گریب کی کوئی نہ پوچھے بات

اسی زمانہ میں سورداس جی نے سری کرشن جی کے ذکر سے اپنے کلام کو مقبول خاص و عام کیا۔ ان کی تصنیف میں شاید کوئی شعر ہوگا جو فارسی عربی لفظ سے خالی ہوگا۔ پس اس سے قیاس کیا جاسکتا ہے کہ جب یہ بزرگان مذہب اپنے دوہروں میں فارسی لفظ بول جاتے تھے تو گفتگو میں عام ہندو لوگ کیا کچھ اس سے زیادہ نہ بولتے ہوں گے۔ سورداس جی کہتے ہیں:—

مایا دام دہن و نتا، باندھوں ہوں اس ساج ۔ سنت سبھی جانت ہوں، تو نہ آئیو باج

کھیت بہت کا ہے تم تانے نسین سنی آواج ۔ ڈیو نہ جات پار اُترآئے، چاہت چڑھیں جہاج

لیجے پار اُتار سور کون، مہاراج برج راج ۔ نئیں کرت کہت پربھو تم سوا، سد گریب نواج

رفتہ رفتہ شاہجہاں کے زمانہ میں شہر اور شہر پناہ تعمیر ہو کر نئی دلی دار السلطنت ہوئی، بادشاہ اور ارکان دولت زیادہ تر وہاں رہنے لگے۔ اہل سیف، اہل قلم، اہل حرفہ اور تجار وغیرہ ملک ملک اور شہر کے آدمی ایک جگہ جمع ہوئے۔ ترکی میں اُردو بازار لشکر کو کہتے ہیں۔ اُردوئے شاہی اور دربار میں ملے جلے الفاظ زیادہ بولے جاتے تھے۔ وہاں کی بولی کا نام اُردو ہو گیا،

اور یہ زبان خاص و عام میں شاہجہاں کے اُردو کی طرف منسوب و مشہور ہو گئی۔

سُنا جاتا ہے کہ ہماری زبان کو ریختہ بھی کہتے ہیں، یہ لفظ ہمارے کانوں کو غیر مانوس اور اجنبی معلوم ہوتا ہے تاہم متقدمین اور متاخرین شعراء نے اُردو کی بجائے لفظ ریختہ اشعار میں لکھا ہے۔ میر تقی میرؔ فرماتے ہیں ؎

خوگر نہیں کچھ یوں ہی ہم ریختہ گوئی کے　　معشوق جو تھا اپنا باشندہ دکن کا تھا

اُن کے ہمعصر قائمؔ بھی کہتے ہیں :- ؎

قائمؔ میں غزل طور کیا ریختہ ورنہ　　اک بات لچر سی بزبانِ دکنی تھی

متاخرین میں مرزا غالب کا ارشاد ہے :- ؎

ریختے کے تمہی اُستاد نہیں ہو غالبؔ　　کہتے ہیں اگلے زمانہ میں کوئی میرؔ بھی تھا

یا　　یہ جو کہے کہ ریختہ کیونکہ ہو رشکِ فارسی　　گفتۂ غالبؔ ایکبار پڑھکے اُسے سُنا کہ یوں

نواب مرزا داغ اور اُن کے ہمعصروں کے یہاں ریختہ متروک ہو گیا اور ہماری زبان کا نام صرف "اردو" رہ گیا۔ چنانچہ داغؔ نے ایک جگہ فخریہ کہا ہے :- ؎

اُردو ہے جس کا نام ہمیں جانتے ہیں داغؔ　　ہندوستاں میں دھوم ہماری زباں کی ہے

ایک اور شعر ہے ؎

نہیں کھیل اسے داغؔ یاروں سے کہدو　　کہ آتی ہے اُردو زباں آتے آتے

نسیمؔ دہلوی شاگرد حکیم مومن خاں یوں نغمہ سرا ہیں :- ؎

نسیمؔ دہلوی ہم موجدِ بابِ فصاحت ہیں　　کوئی اُردو کو کیا جانے کہ جیسا ہم سمجھتے ہیں

اُردو کو پہلے ریختہ اس وجہ سے کہتے تھے کہ مختلف زبانوں نے اسے ریختہ کیا ہے۔ جیسے دیوار کو اینٹ، مٹی، چونا، سفیدی وغیرہ پختہ کرتے ہیں، یا یہ کہ ریختہ کے معنی ہیں گری پڑی پریشان چیز، چونکہ اس میں الفاظِ پریشاں جمع ہیں اس لیے اسے ریختہ کہتے تھے اور یہی سبب ہے کہ اس میں عربی، فارسی، ترکی وغیرہ کئی زبانوں کے الفاظ شامل ہیں اور اب

انگریزی بھی داخل ہوتی جاتی ہے، اور ایک وقت ہوگا کہ عربی فارسی کی طرح انگریزی زبان بھی قابض ہو جائیگی اور شاید وہ وقت بسرعت تمام قریب آرہا ہے۔

اُردو کی ابتدائی تصنیفات نظم سے شروع ہوئیں اگرچہ فطرتاً بھی اسی کی مقتضی رہی ہے کہ ادب اور علم کی ابتدا ہمیشہ نظم سے ہوتی آئی ہے، کیونکہ ایک وحشی قوم جو لکھنا پڑھنا نہیں جانتی ہمیشہ اپنے بزرگوں کی روایات، رسم ورواج اور اُن کی شجاعت وبسالت کو جس کو اُس قوم کی تاریخ سمجھنا چاہیے اپنی قوم کے بھاٹ اور کبیشر کے ذریعہ گیتوں اور راگ راگنیوں میں محفوظ رکھتی آئی ہے چنانچہ یہی بھاٹ اور کبیشر تھے جنہوں نے نہ صرف یورپ بلکہ چین، تبت، اور تاتار اور اسی طرح ہندوسندھ، بلوچستان مغربی ایشیا، جزائر بحر اسود، مصر، مغربی افریقہ، شمالی امریکہ، جنوبی امریکہ اور جزائر بحر الکاہل کے مطبوع ومقبول افسانہ ہائے قدیم کو محفوظ رکھا۔ پس علم کی سب سے پہلی بنیاد ہمیشہ شاعری اور اکثر اوقات قافیہ بندی سے پڑتی ہے، ایک وحشی کے کانوں کے لیے یہ الفاظ کی زیر وبم عجب ترنم پیدا کرتی اور خوش آئند معلوم ہوتی ہے، لیکن یہ حالات ہماری زبان پر منطبق نہیں ہوتے کیونکہ اس کے بولنے والے اَن پڑھ اور وحشی نہ تھے بلکہ ایک طرف سنسکرت اور بھاشا کے خزائن کی کنجی ہاتھ میں لیے ہوئے تھے اور دوسری طرف عربی، فارسی کے گنجینوں کو سینوں میں نہاں رکھتے تھے، تاہم نتیجہ یہی برآمد ہوا کہ اُردو کی تصنیفات کی ابتدا نظم سے ہوئی۔ ہمارے نزدیک اس کی وجہ یہ ہے کہ مطالب ضروری کی سب کارروائی فارسی میں ہوتی تھی۔ اُردو نثر کی طرف کسی کو اصلاً توجہ نہ تھی اور اُردو کے اُس وقت اہل زبان جو ذی استعداد ہوتے تھے وہ اُردو کی شاعری کو بھی فخر نہ سمجھتے تھے۔ کچھ کہنا ہوتا تھا تو فارسی میں کہتے تھے، البتہ عوام الناس موزوں طبع دل کی ہوس پوری کرنے کو جو منھ میں آتا تھا کہے جاتے تھے اور اس طرح ابتدا شعر وشاعری سے ہوگئی۔

نواز نام ایک مصنف نے فرخ سیر کے عہد میں شکنتلا کا ترجمہ بھاشا میں کیا اور اُردو کو محروم رکھا۔ لہذا یہ بات قابلِ افسوس ہے کہ سنسکرت اور بھاشا سے باوجود قدرت کوئی فائدہ ہندوؤں اور مسلمانوں نے اپنی مشترکہ زبان کو نہیں پہنچایا اور وہ اسلوب بیاں اور وہ صحیفۂ فطرت کے مناظر جن سے سنسکرت اور بھاشا کی نظمیں مالا مال ہیں اُن سے اُردو مفلس نظر آتی ہے۔ البتہ فارس کی انشا پردازی کے گلزار جابجا کھلے ہوئے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ نظم اُردو کے آغاز میں سنسکرت کی تقلید ضرور کی گئی۔ سنسکرت میں ایک لفظ کے کئی معنی ہیں اسی واسطے اس میں اور برج بھاشا اس کی شاخ میں ذومعنیین الفاظ اور ایہام پر دوہروں کی بنیاد ہوتی تھی، فارسی میں یہ صنعت ہے مگر کم۔ اُردو میں پہلے پہلے شعر کی بنا اسی پر رکھی گئی اور دورِ اوّل کے شعرا میں وہی قانون جاری رہا۔ اس عہد کے چند شعر بطور نمونہ پیشکش ہیں ؎

لام نستعلیق کا ہے اُس بتِ خوشخط کی زُلف — ہم تو کافر ہوں اگر بندے ہوں اسلام کے

کیوں تہو ہم سے وہ صنم یاغی — قد ہو جس کا نہال کی مانند

تو جو دریا کے پار جاتا ہے — دل مرا وار وار جاتا ہے

تم دیکھو یا نہ دیکھو ہم کو سلام کرنا — یہ تو قدیم ہی سے سر پہ ہمارے کرہے

نہیں محتاج زیور کا جسے خوبی خدا دیوے — کہ آخر بدنما لگتا ہے دیکھو چاند کو گہنا

لیکن جس چیز کی اُردو میں نقل کرنی چاہیے تھی اُس سے قاطبۃً اعراض کیا گیا۔ ولی نے عالمگیر کے عہد میں نظم اُردو کی ابتدا کی اور محمد شاہ رنگیلے کے زمانہ میں جبکہ عیش و عشرت کی بہار تھی اور اُردو شاعری کا ستارہ چمک رہا تھا فارسی کا تتبع اختیار کیا اور غزل میں رنگ اُڑانا شروع کیا، اور شاعروں نے بھی اُس کی دیکھا دیکھی فارسی کے خاکے اُردو میں اُتار کر غزل خوانیاں شروع کر دیں اور قصیدے لکھنے لگے، چنانچہ ہمارے یہاں نئے نئے اسلوب بیاں، عمدہ عمدہ تراکیب الفاظ، تشبیہ و استعارات بکثرت موجود ہیں لیکن

مصطلحات علمی سے ہماری زبان ناآشنا رہی کیونکہ اُس عہد میں علوم و فنون، تاریخ و فلسفہ و ریاضی وغیرہ کا چرچا نہ تھا۔ الغرض یہی سلسلہ اب تک جاری رہا اور کسی کو یہ خیال نہ آیا کہ اس پک ڈنڈی کو چھوڑ کر ایک دوسری شاہراہ اختیار کریں اور آنکھ بند کیے اگلی بھیڑوں کے پیچھے چلتے رہے، آخر کار انگریزی علم ادب نے ہماری آنکھیں کھولیں اور آزاد و حالی نے ایک علیحدہ روش اختیار کی جس پر آجکل ہمارے نوجوان شعرا جادہ پیمائی کر رہے ہیں اور مترجمین مصطلحات علمی بہم پہنچا رہے ہیں۔

اُردو زبان کی طبیعت ایسی ملنسار واقع ہوئی ہے کہ ہر زبان سے مل جُل جاتی ہے سنسکرت آئی اُس سے مل گئی، عربی فارسی آئی اُسے بسم اللہ خیر مقدم کہا۔ اب انگریزی الفاظ کو اس طرح جگہ دے رہی ہے گویا اُس کے انتظار میں بیٹھی تھی، اس کی اس ملنساری اور آسانی کی وجہ سے یہ ملکی زبان ہو گئی ہے۔ کشمیر سے راس کماری تک اور بنگال سے سندھ تک اُردو بولی یا سمجھی جاتی ہے۔ اس قلیل عرصہ میں جب سے کہ ولی نے اپنی پہلی غزل اُردو میں تصنیف کی جس کو سوا دو سو برس کا زمانہ گزرا۔ آجتک جو کچھ ہوا وہ کسی تحریک یا ارادہ سے نہیں ہوا[1] تاہم اُردو کی ترقی نمایاں اور روز افزوں ہے، بلاشبہ یہ رفتار دوسری ترقی یافتہ زبانوں کے مقابلہ میں نسبتاً بہت کم ہے لیکن یہ اس کے ابتدائی مدارج ہیں اور دوسری زبانیں اپنی ترقی تکمیل کر چکی ہیں۔ انگریزی زبان نے اپنا موجودہ علم ادب چوتھی صدی سے بیسویں صدی تک یعنی ایک ہزار چھ سو برس میں پیدا کیا ہے، جبکہ کل قوم اور حکومت انگلشیہ برابر اس کی ترقی کے لیے کوشاں رہی ہیں، تو کیا یہ تعجب خیز امر نہیں ہے کہ اُردو نے بغیر کسی امداد اور وسیلہ کے اس قدر جلد ایک معتدبہ علم ادب بہم پہنچا لیا۔

افسوس ہے کہ نظم اُردو کے ساتھ ساتھ نثر اُردو کی ابتدا نہیں ہوئی بلکہ ایک عرصہ کے بعد

[1] مولوی حبیب الرحمن خاں شروانی اپنے ایک خط مورخہ ۱۰ ستمبر ۲۰ء میں تحریر فرماتے ہیں کہ "ایک صاحب نثر اردو کی تاریخ لکھ رہے ہیں، انکو عہد شاہجہانی تک کی نثریں دستیاب ہو چکی ہیں"۔ ۱۲ تنہا۔

محمد شاہ کے عہد میں فضلی تخلص ایک بزرگ نے ۱۱۴۵ھ ہجری میں وہ مجلس لکھی اس کے دیباچہ میں وہ سبب تالیف لکھتے ہیں اور غالباً یہی نثر اُردو کی پہلی تصنیف ہے۔ "پھر دل میں گزرا کہ ایسے کام کو عقل چاہیے کامل اور مدد کسو طرف کی ہوئے شامل کیونکہ بے تائید صمدی اور بے مددِ جنابِ احمدی یہ مشکل صورت پذیر ہووے اور گوہر مراد رشتۂ امید میں نہ آوے لہٰذا کوئی اس صنعت کا نہیں ہوا مخترع اور اب تک ترجمۂ فارسی بعبارت ہندی نثر نہیں ہوا مستمع۔ پس اس اندیشۂ عمیق میں غوطہ کھایا اور بیابان تامل و تدبیر میں سرگشتہ ہوا لیکن راہ مقصود کی نہ پائی۔ ناگاہ نسیم عنایتِ الٰہی دلِ افگار پر اہتزاز میں آ۔ یہ بات آئینۂ خاطر میں منھ دکھلائی"

میر کی مثنوی شعلۂ عشق کے مضمون کو بھی مرزا رفیع السودا نے نثر میں لکھا ہے (جنکا زمانہ ۱۱۲۰ھ ہجری سے ۱۱۹۵ھ تک ہے) اُس کا انداز بالکل یہی ہے جو سودا کی کلیات کے دیباچہ کا ہے۔

نثر مرزا رفیع

"ضمیر منیر پر آئینہ داران معنی کے مبرہن ہو کہ محض عنایت حق تعالیٰ کی ہے جو طوطیِ ناطقہ شیریں سخن ہو۔ پس یہ چند مصرع کہ از قبیل ریختہ دُر ریختہ خامۂ دو زبان اپنی سے صفحۂ کاغذ پر تحریر پائے۔ لازم ہے کہ تحویل سخن سامعہ سنجانِ روزگار کروں۔ تا زبانی ان اشخاص کی ہمیشہ مورد تحسین و آفریں رہوں ؎

قیمت قدر شناسا ہی سے پہنچے ہے بہم — ورنہ دنیا میں خذف بھی نہیں گوہر سے کم

مضمون سینہ اس بیش از مرغ اسیر نہیں۔ کہ ہو بیچ قفس کے جس وقت زبان پر آیا فریادِ بلبل ہے واسطے گوشِ دادرس کے۔ غرض جب اہل سخن کا دُرِ منصفی زینتِ لب ہے سررشتۂ حسنِ معانی کا اس کلام کے، اُس سے انصاف طلب ہے۔ اگر حق تعالیٰ نے صبح کاغذ سفید کی مانند شام سیاہ کرنے کو یہ خاکسار خلق کیا ہے تو ہر انسان کے فانوسِ دماغ میں چراغ ہوش دیا ہے۔ چاہیے کہ دیکھ کر نکتہ چینی کرے ورنہ گزندِ زہر آلود سے بے اجل کاہے کو مرے"

اس تصنیف سے تخمیناً تیس برس کے بعد جب میر انشاء اللہ خاں اور مرزا جانجاناں مظہر کی دلی میں ملاقات ہوئی ہے۔ اُس گفتگو کے چند فقرے بھی قابلِ غور ہیں۔ سید انشا مرزا جان جاناں سے فرماتے ہیں:۔

"ابتدائے سنِ صبا سے تا اوائلِ ریعاں اور اوائلِ ریعاں سے الی الآن۔ اشتیاقِ بالا یطاق تقبیلِ عتبہ عالیہ نہ بحدے تھا کہ سلک تحریر و تقریر میں منتظم ہو سکے۔ لہٰذا بے واسطہ و وسیلہ حاضر ہوا ہوں۔"

مرزا صاحب جواب میں فرماتے ہیں:۔

"اپنے تئیں کوں بھی بدو طفلی سے نہیں ایسے اشخاص کے ساتھ موانست اور مجالست رہی ہے۔"

یہ وہ زمانہ ہے جبکہ بزمِ شعراء کے تین دور ختم ہو چکے ہیں۔ اگرچہ میر تقی میر اور مرزا رفیع السودا چراغِ سحری ہیں لیکن اُن کی گرم نفسی اور آتش بیانی ہر صحبت اور ہر جلسے کو گرما رہی ہے، اور چوتھے دَور کے شعراء کے قہقہوں کی آواز دور سے بہم سُنائی دے رہی ہے کہ اب آئے اور اب آئے۔

بایں ہمہ اُردو میں اس وقت نثر کی کوئی قابل الذکر کتاب ایسی نہیں لکھی گئی جس سے زبان کی تبدیلیوں کا سلسلہ معلوم ہوتا، کیونکہ اُردو کی انشا پردازی اور ترقی اور وسعت فقط شعرا کی زبان پر تھی اور عرصہ تک یہی حال رہا۔ آخر تیرھویں صدی ہجری کے شروع میں کئی قدرتی سامان جمع ہو گئے اور سب سے مقدم سبب اسکی عام فہمی تھی۔ چونکہ ہر شخص سمجھتا تھا۔ اس لیے نثر لکھنے والوں کو بھی اسی میں واہ واہ لینے کا شوق ہوا۔

اُردو کا عالمِ طفولیت

ادھر تو یہ چونچال لڑکا شعراء کے جلسوں میں اور اُمراء کے درباروں میں اپنے بچپنے کی شوخیوں سے سب کے دل بہلا رہا تھا، اُدھر دانائے فرنگ جو کلکتہ میں فورٹ ولیم کے قلعہ پر دوربین لگائے بیٹھا تھا اُس نے دیکھا۔ نظر باز تاڑ گیا کہ لڑکا ہونہار ہے مگر تربیت چاہتا ہے۔ تجویز ہوئی کہ جس ملک پر حکمرانی کرتے ہیں اُس کی زبان سیکھنی واجب ہے۔

(آبِ حیات)

تیرھویں صدی ہجری اور تقریباً اُنیسویں صدی عیسوی کے آغاز سے نثر اُردو کی درحقیقت ابتدا ہوئی ہے جبکہ میر محمد عطا حسین خاں تحسین نے چار درویش کا قصہ اردو میں لکھ کر نوطرزِ مرصع نام رکھا۔ شجاع الدولہ کے عہد میں تصنیف شروع ہوئی ۱۷۹۸ء ۱۲۱۳ھ نواب آصف الدولہ کے عہد میں ختم ہوئی۔ اسی زمانہ میں بعہد لارڈ ولزلی گورنر جنرل ڈاکٹر جان گلکرائسٹ کے ماتحت فورٹ ولیم کے مدرسہ میں اُردو کتابوں کی تصنیف اور تالیف کا شعبہ قائم کیا گیا۔ اور اُردو کی تربیت کا سہرا صاحبانِ ذی شان ہی کے سر رہا صاحب تذکرۂ گلشنِ ہند نے میر تقی میر کے حال میں جبکہ شعبۂ تصنیف و تالیف کے اہتمام کے لیے کسی لائق اہلِ زباں کی ضرورت تھی الفاظِ ذیل میں یوں تصویر کھینچی ہے:-

"جن ایام میں کہ درخواست صاحب عالیشان کی، زبان دانانِ ریختہ کے مقدمے میں کلکتے سے لکھنؤ گئی تو پہلے کرنیل اسکاٹ صاحب کے روبرو تقریب میر کی ہوئی لیکن علتِ پیری سے یہ بیچارے مجہول کے محمول ہوئے اور نوجوانِ نومشق[۱]، مربی گرمی سے قوتِ بدنی کے مقبول ہوئے، زمانہ خوش طبعوں سے نہیں خالی ہے، اکثر اہلِ لکھنؤ پکارتے تھے کہ

---

[۱] میر شیر علی افسوس کی طرف اشارہ ہے، جو لسفارش نواب سرفراز الدولہ حسن رضا خاں نائب نواب آصف الدولہ اس جگہ پر مامور کیے گئے۔ ۱۲۔

نکلتے ہیں شاعری کی جادر خواست حمالی ہے، کس واسطے کہ یہ جانتے سب اہلِ تمیز ہیں کہ آج بھی بوڑھے کے سامنے نوجوان غورے میں موبیز ہیں۔ اسی بھی جو بوجہ تمکنت معنی کا حجر ثقیل طبع سے ترازو کرکے وہ دکھاتا ہے جوان اگر کوہ بو تہیں ہے تو تحمل سے اُس کے کمر چُراتا ہے"

بہر حال اس جگہ کے لیے میر شیر علی افسوس کا انتخاب ہوا اور افسوس ہے کہ میر صاحب ہماری بدقسمتی سے منتخب نہ ہوئے۔ ورنہ کیا عجب ہے کہ وہ نثر میں کوئی ایسی یادگار چھوڑ جاتے جو اُن کی نظم کی طرح مقبولِ خاص و عام ہوتی، اور اہلِ زبان اُسے سر اور آنکھوں پر رکھتے۔ فورٹ ولیم کے شعبۂ تصنیف و تالیف کی طرف سے میر شیر علی افسوس نے ۱۷۹۹ء میں باغِ اُردو اور ۱۸۰۵ء میں آرائشِ محفل لکھی۔ میر امّن دہلوی نے ۱۸۰۲ء میں باغ و بہار آراستہ کیا اور انہی دنوں میں اخلاقِ محسنی کا ترجمہ لکھا اور بیتال پچیسی جو محمد شاہ کے زمانہ میں سنسکرت سے بھاشا میں آئی تھی۔ اب عام فہم اُردو ہوکر ناگری میں لکھی گئی اور ۱۸۰۵ء میں مظہر علی ولا نے اُردو میں لکھی۔ لیکن بقول آزاد اس نقارۂ فخر کی آواز کو کوئی دبا نہیں سکتا کہ میر انشاء اللہ خاں پہلے شخص ہیں جنہوں نے ۱۸۰۷ء میں قواعدِ اُردو لکھکر ایجاد کی ٹہنی میں ظرافت کے پھول کھلائے۔

زبانِ اُردو کی عام فہمی دیکھکر مذہب نے بھی اپنی برکت کا ہاتھ اسکے سر پر رکھا یعنی ۱۸۰۷ء میں مولوی شاہ عبدالقادر صاحب نے قرآن شریف کا ترجمہ اُردو میں کیا۔ اس کے بعد مولوی اسمٰعیل صاحب نے بعض رسالے عام اہلِ اسلام کی فہمائش کے لیے اُردو میں لکھے الغرض اپنی آسانی کے وصف سے اُردو نے آہستہ آہستہ فارسی کو پیچھے ہٹانا اور اپنا قدم آگے بڑھانا شروع کیا۔ چنانچہ ۱۸۳۵ء سے سرکاری دفتر بھی اُردو ہونے شروع ہوئے۔ چند سال کے بعد کل دفتروں میں اُردو زبان ہوگئی۔ اسی سنہ میں اخباروں کو آزادی حاصل ہوئی۔ ۱۸۳۶ء میں اُردو کا اخبار دلّی میں جاری ہوا اور یہ اس زبان میں پہلا اخبار تھا، جو

آزاد کے والد مولوی محمد باقر کے قلم سے نکلا۔ اور دورِ اوّل اپنی اس کارگزاری کے بعد ختم ہوگیا۔

اس کے بعد دوسرے دَور کا آغاز ہوا اور ۱۸۳۶ء کے قریب فقیر محمد خاں گویا نے انوارِ سہیلی کا ترجمہ اُردو میں کیا جس کا نام بستانِ حکمت رکھا۔ بعد ازاں ۱۸۴۵ء میں میرزا رجب علی سرور نے فسانۂ عجائب تحریر فرمایا اور چند اَور قصّے لکھے۔ مرزا غالب مرحوم نے باوجود اس کے کہ فارسی زبان کے دلدادہ تھے اور اپنی تمام عمر فارسی میں قادر الکلام ہونے پر صرف کی تھی، زمانہ کی رفتار دیکھکر خطوط نویسی کا وہ طریقہ ایجاد کیا جس کا تتبّع بھی آجتک کما حقّہٗ کسی سے نہیں ہوا اور لمبے لمبے القاب و آداب کی جگہ نہایت مختصر القاب و آداب کی بنیاد ڈالی، اُن کے خطوط میں وہ حظ اور لطف ہے کہ عمدہ سے عمدہ افسانے اور ناول اُن پر قربان ہیں، حالانکہ روزمرّہ کی باتیں ہیں مگر اندازِ تحریر اس قدر دلچسپ ہے کہ برابر یہی جی چاہتا ہے کہ اُنہیں پڑھے جاؤ طبیعت کو سیری نہیں ہوتی۔ یہ خطوط کتاب کی شکل میں جمع ہو کر اوّل عودِ ہندی کے نام سے اور بقیہ خطوط اُردوئے معلّٰی کے نام سے شائع ہو چکے ہیں۔ اسی زمانہ میں مولانا غلام امام شہید نے انشائے بہارِ بے خزاں اور خان بہادر منشی غلام غوث بے خبر نے جو غالب مرحوم سے دوستانہ تعلقات رکھتے تھے خونابۂ جگر اور فغانِ بے خبر دو کتابیں تصنیف فرمائیں اور اس طرح دوسرے دور کا بھی خاتمہ ہوگیا۔ زبان کے ابتدائی مراحل کے لحاظ سے جو کچھ ہوا غنیمت ہوا ورنہ دو چار کتابوں کی تصنیف کسی دَور کے لیے ضرور باعثِ ننگ و شرم ہے[۵]۔ اگر غور سے نظر ڈالی جائے تو دوسرے دور سے پہلا دور بہت بہتر تھا۔ پہلے دَور کا خاتمہ یقین دلاتا تھا کہ دوسرا دَور ضرور بہتر ہوگا لیکن ردِّ عمل کا قانون جو دنیا کی تمام اشیا پر جاری و ساری ہے یہاں بھی اپنا اثر ظاہر کیے بغیر نہ رہ سکا اور اُردو اپنے عالمِ طفولیت سے ایک قدم آگے نہ بڑھ سکی، البتہ دوسرے دَور کی کمی کو تیسرے دَور نے باحسنِ وجوہ پورا کر دیا اور اُردو کا عالمِ طفولیت ختم ہو کر عنفوانِ شباب کے آثار ظاہر کرنے لگا جس کا ذکر ہم آئندہ چلکر کریں گے۔

۵ میری رائے موجودہ کتابوں کو دیکھنے سے ظاہر کی گئی ہے ورنہ اس دور میں بھی متعدد کتابیں لکھی گئیں جو اب ناپید ہیں، دوسرے دور کے آغاز میں اسکا مفصل ذکر ہوگا۔ ۱۲

پہلا دور[۵]

(۱۷۹۸ء سے ۱۸۳۶ء تک)

آج نثر اُردو کے باکمال اصحاب کا پہلا جلسہ منعقد ہوتا ہے۔ نظم اُردو کا تیسرا دور ختم ہو چکا ہے اور اُستادانِ فن اپنی شیریں کلامی اور سخن سنجی سے سب کو اپنا گرویدہ کر چکے ہیں، چوتھے دور کے بادہ خوار خمخانۂ اُردو میں اپنی اپنی جگہ آن بیٹھے ہیں اور غزل و قصیدہ کی شراب ارغوانی کے خم کے خم لنڈھا رہے ہیں اور سامعین کو اپنے دل آویز نغموں سے مست الست بنا رہے ہیں۔ ان اصحاب کی زمزمہ پردازیوں، ظرافت اور نکتہ چینیوں نے ایک عالم کو مسخر کر لیا ہے اور ایک شخص بھی ایسا نظر نہیں آتا جو ان کا اثر پذیر اور دلگیر نہو، نثر کی طرف کسی کو مطلق توجہ نہیں جس کو دیکھیے نظم میں کوس لمن الملک الیوم بجا رہا ہے اور ہمہ دانی کا دعویٰ کر رہا ہے۔ سید انشاء اللہ خاں انشا کہ جن کی طبیعت ہمہ گیر واقع ہوئی ہے اور لافِ زبان دانی اُن اصحاب سے سُننے کی متحمل نہیں ہے جو زبان اور اہلِ زبان سے کوسوں دور ہیں اُن کی فہمائش اور اُن کی غلطیوں کو طشت ازبام کرنے کے لیے دریائے لطافت جو دراصل قواعدِ اُردو ہے فارسی زبان میں تحریر کرتے ہیں، اور ایک داستان اُردو میں لکھتے ہیں جس میں عربی فارسی کا ایک لفظ بھی استعمال نہیں کیا۔ اُدھر میر امّن کلکتہ میں بیٹھکر اپنی صاف اور شستہ زبان میں وہ دلچسپ قصہ تحریر کرتے ہیں جو باغ و بہار کے نام سے موسوم ہے اور جس کی ادنےٰ صفت یہ ہے کہ زبان کے اس قدر تغیر و تبدل کے باوجود اب بھی اُس سے بہتر زبان میں اُس قصہ کا لکھا جانا ممکن نہیں ہے، اس پہلے دور میں یہ دو اصحاب باکمال نظر آتے ہیں۔ اگرچہ بلحاظ زمانۂ تصنیف میر محمد عطا حسین خاں تحسین کے سر پر اولیت کا تاج نظر آتا ہے اور چار درویش کا قصہ موسوم بہ نو طرزِ مرصع ۱۲۱۳ھ ہجری میں تصنیف ہو کر

[۵] دیکھو صفحہ ۵۰

فروغ پاتا ہے تاہم باغ و بہار جو ۱۸۰۲ء ۱۲۱۷ھ میں آراستہ ہوئی مقبولیت کے پھولوں کا ہار پہنے ہوئے ہے۔ مصرع ؎ قبولِ خاطر و لطفِ سخن خداداد است۔

فورٹ ولیم کالج کلکتہ کے مشاہیر نثار اپنی اپنی کوششوں کے لحاظ سے شکریہ کے مستحق ہیں، اُردو نثر کے ایوانِ عظیم الشان کی بنیاد رکھنے میں جس قدر روڑے اور سنگریزوں کی ضرورت ہے وہ اُن کا قلم آج مہیا کر رہا ہے۔ یہ سنگریزے عمارت کی بنیاد پختہ کرنے کیلیے آج جواہر ریزوں سے زیادہ قیمتی ہیں جنکی ضرورت تکمیلِ عمارت کے بعد محض زیب و آرائش کے لیے ہوگی۔

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کا خاندان بھی اس ہونہار بچے کے سر پر اپنا دستِ شفقت رکھتا ہے اور مذہبی تقدس کے ساتھ اسکو بھی پاکیزہ زندگی کی دعا دیتا ہے، خدا کرے یہ بچہ خوب پڑھے پھولے اور پھلے۔ آمین یارب العالمین۔

(نوٹ بابت صفحہ گزشتہ) لہٰذا یہاں ہم اُن چند علمی کتابوں کا ذکر کرنا ضروری سمجھتے ہیں جو اسی دور میں لکھی گئی ہیں لیکن گردشِ زمانہ سے ہندوستان میں نادر الوجود ہیں اور انڈیا آفس لائبریری لندن کی الماریوں کو زیب دے رہی ہیں، اگر کسی صاحب کے پاس موجود ہوں تو براہِ کرم راقم آثم کو مطلع فرمائیں اور اُن کے اقتباسات سے بہرہ اندوز کریں، نیز اُن کے مصنفین کے حالات بھی جو کچھ معلوم ہوں تحریر فرمائیں تاکہ طبع دوم میں تلافیِ مافات ہو سکے۔

کتب نجوم و ہیئت

۱:۔ مفتاح الافلاک: از عبد السلام کلکتہ سنہ ۱۸۳۳ء صفحات ۲۷۲

۲:۔ نظام آسمانی (انگریزی مع ترجمہ ہندوستانی) کلکتہ سنہ ۱۸۳۶ء۔

۳:۔ علم ہیئت مترجمہ لفٹنٹ میلس لکھنؤ سنہ ۱۸۳۳ء۔

جغرافیہ

۱:۔ خلاصۃ علم الارض (مع انگریزی) کلکتہ سنہ ۱۸۲۴ء

۲:۔ مرآۃ الاقالیم کلکتہ سنہ ۱۸۳۶ء صفحات ۱۸۰

علم المعاشرت

۱:۔ اقبالِ فرنگ، بیان عادات و آداب و احوال فرنگ۔ از نواب اقبال الدولہ بہادر۔ کلکتہ سنہ ۱۸۳۴ء۔

میر محمد عطا حسین خاں تحسین

آپ کا نام میر محمد عطا حسین خاں ہے اور تحسین تخلص ہے لیکن آپ مشہور شاعر نہیں معلوم ہوتے کیونکہ میرزا علی لطف نے اپنے تذکرۂ گلشن ہند میں آپ کا کوئی ذکر نہیں کیا جن کے آپ ہمعصر تھے۔ اور اب تک جس قدر تذکرے اُردو شعراء کے حال میں لکھے گئے ہیں کہیں آپ کا نام نامی نظر نہیں آتا۔ خمخانۂ جاوید میں بھی آپ کا ذکر خیر نہیں حالانکہ اُس میں ایک آدھ شعر کا لکھنے والا بھی زمرۂ شعراء میں داخل ہے۔ آب حیات میں شمس العلماء مولوی محمد حسین آزاد نے آپ کو نثر اُردو لکھنے والوں میں شمار کیا ہے، مگر نثاران اُردو میں بھی آپ کسی درجۂ اعلیٰ پر نہیں پہنچے، آپ اٹاوہ کے رہنے والے تھے، لیکن اب سے سوا سو برس پہلے دلّی اور لکھنؤ کی زبان کا چرچا تھا، اصحاب اٹاوہ کو کون خاطر میں لاتا ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ اگرچہ امیر خسرو کی کتاب چہار درویش کو آپ نے ۱۲۱۳ھ ۱۷۹۸ء میں ترجمہ کر کے نوطرز مرصع اُردو نام رکھا لیکن مقبول عام نہ ہوا۔ اور میر امن نے ۱۸۰۱ء میں اسی کتاب کو دلّی کی اعلیٰ زبان میں تحریر کیا، اور فارسی کی اصل کتاب سے خود ترجمہ کیا، اُس کا نام باغ و بہار رکھا گیا، آجکل بازار میں یہی کتاب فروخت ہوتی ہے اور نوطرز مرصع کا کہیں پتہ نہیں۔ کتاب کے ساتھ ساتھ آپ کے نام نامی سے بھی لوگ بے خبر ہو جاتے اس لیے چند سطور حوالۂ قلم کی گئیں کہ کم از کم آپ کی یاد لوگوں کے دلوں میں رہے زیادہ حالات معلوم نہ ہوئے ورنہ تحریر کیے جاتے۔

ڈاکٹر جان گلکرائسٹ

یہ عجیب بات ہے کہ فارسی جو مسلمان فاتحوں کی چہیتی زبان تھی اُن کے دور سلطنت میں سرکاری دفاتر میں ایک ہندو راجہ ٹوڈرمل کی کوشش سے داخل ہوئی اور دوسرے

دَور میں یعنی مسلمانوں کے عہد تنزل میں اُردو نے ایک انگریز کی وساطت سے دربار سرکار میں رسائی پائی۔ وہ کون؟ ڈاکٹر جان گلکرائسٹ جس نے اُس وقت کے قابل قابل لوگ بہم پہنچائے اور مختلف کتابیں لکھوانا شروع کیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اُردو نثر کا لکھنا اُسی وقت سے شروع ہوا اور یہ کہنا بیجا نہیں ہے کہ نظم اُردو پر جو احسان ولی نے کیا اُس سے زیادہ نثر اُردو پر جان گلکرائسٹ نے کیا ہے، کیونکہ اُس نے نہ صرف زبان اُردو کی قواعد اور لغت تحریر کی بلکہ اور لوگوں سے بھی مختلف کتابیں لکھوائیں۔ ہم نے اِس محسنِ اُردو کو مصنفینِ اُردو میں شمار کیا ہے۔

آپ کی تالیفات کا سلسلہ ۱۷۸۷ء سے شروع ہو جاتا ہے، آپ نے اُردو زبان پر بہت سی کتابیں لکھی ہیں جن میں سے حسبِ ذیل زیادہ مشہور ہیں۔

(۱) انگریزی ہندوستانی لغت کلکتہ ۹۰-۱۷۸۷ء

(۲) ہندوستانی علم اللسان جس میں انگریزی، ہندوستانی اور ہندوستانی انگریزی کی فرہنگ ہے اور شروع میں صرف و نحو پر مقدمہ بھی ہے جو دوسرے ایڈیشن میں مع اضافہ و ترمیم شائع ہوا۔ اڈنبرا سنہ ۱۸۱۰ء۔

(۳) ہندوستانی کی صرف و نحو کلکتہ سنہ ۱۷۹۶ء

(۴) مشرقی زباندان یعنی ہندوستان کی مقبول زبان کا آسان مقدمہ، جس میں زبان کے ابتدائی مسائل اور انگریزی ہندوستانی اور ہندوستانی انگریزی لغت بھی شامل ہے کلکتہ سنہ ۱۷۹۸ء۔

(۵) کتاب مذکورۂ بالا کا اضافہ بعض اضافوں کے ساتھ۔ کلکتہ سنہ ۱۸۰۰ء۔

(۶) فارسی فعل کا جدید نظریہ مع ہندوستانی مترادفات کے۔ کلکتہ سنہ ۱۸۰۱ء۔

(۷) ہندوستان کی سب سے بڑی اور مقبول زبان ہندوستانی کا رہنما (اجنبیوں کیلیے) کلکتہ سنہ ۱۸۰۲ء

(۸) اتالیق ہندی، یعنی " اس کے لیے ہندوستانی کی تحصیل کا آسان رستہ، یہ کتاب کالج کے

شعبۂ ہندوستانی کے علماء نے ڈاکٹر گلکرائسٹ کی ہدایت و نگرانی میں ترجمہ اور مرتب کی۔ کلکتہ ۱۸۰۳ء۔

(۹) ہندی عربی آئینہ۔ یعنی ایسے عربی الفاظ کی جدولیں جن کا ہندوستانی زبان سے خاص تعلق ہے۔ کلکتہ ۱۸۰۲ء۔

(۱۰) مکالمہ (انگریزی و ہندوستانی) یہ کتاب یوروپینوں کے لیے تھی تاکہ عام مضامین پر بول چال میں انہیں مہارت حاصل ہو اور وہ ہندوستان کے باشندوں کے ساتھ گفتگو کر سکیں۔ لندن ۱۸۰۲ء۔

(۱۱) قصص مشرقی، اس میں حکایات لقمان اور قدیم حکایات و قصص کا ترجمہ انگریزی سے ہندوستانی اور فارسی وغیرہ میں کیا گیا ہے۔ کلکتہ ۱۸۰۳ء وغیرہ۔

ڈاکٹر صاحب نے ایک حصہ انگریزی ہندوستانی لغت کا تیار کر کے ۱۷۹۸ء میں طبع کرایا۔ مگر دوسری جلد ہندوستانی انگریزی لغت ختم نہ کر سکے۔ علاوہ اُن تمام دقتوں کے جن سے وہ گھبرا گئے تھے، ایک دقت یہ بھی تھی کہ خریدار بہم نہ پہنچے، صرف ۷۰ صاحبوں نے خریداری منظور کی حالانکہ خرچ کا اندازہ کم سے کم چالیس ہزار روپے کا کیا گیا تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے اس کام کو نہایت حسرت کے ساتھ خیرباد کہا۔

ڈاکٹر صاحب نے انیسویں صدی کے شروع میں بمقام فورٹ ولیم کلکتہ اُردو کا ایک محکمہ قائم کیا جس کا ابتدائی اور اصلی مقصد یہ تھا کہ جو انگریز یہاں ملازمت اختیار کرتے ہیں اُن کی تعلیم کے لیے اُردو کی مناسب اور مفید کتابیں تالیف کرائی جائیں، چنانچہ ڈاکٹر صاحب ہی کی اس دلچسپی کا نتیجہ تھا کہ اُردو میں بہت سی کتابیں تالیف یا ترجمہ ہوئیں۔ اور ڈاکٹر صاحب ہی کے اہتمام سے چھپیں۔

خدا کرے کہ یہ شجرِ اُردو جس کی آبیاری سوا سو برس ہوئے ڈاکٹر جان گلکرائسٹ نے کی تھی خوب پھولے اور پھلے اور ہزارہا سال کے آئندہ زمانے میں اس کی شاخیں اقصائے عالم

میں پھیلیں [illegible] زبان نہ صرف ہندوستان کی بلکہ تمام عالم کی لنگوا فرینکا ہو جائے۔ ع

این دعا از من و از جملہ جہاں آمین باد

سیّد حیدر بخش حیدری

یہ بزرگ دہلی کے رہنے والے تھے۔ یہیں پیدا ہوئے اور اسی خاک پاک میں نشو و نما پائی، شاہ عالم بادشاہ کا زمانہ تھا جبکہ ہندوستان کے ہر صوبہ میں خود مختار ریاستیں قائم ہو چکی تھیں اور اکبر اور عالمگیر کے جانشینوں کی وقعت شاہ شطرنج سے زیادہ نہ تھی۔ چنانچہ مرزا سودا نے اپنا مشہور مخمس شہر آشوب لکھا جو بقول حضرت آزاد "غور سے دیکھو تو ملک کی دلسوزی نے اپنے وطن کا مرثیہ کہا ہے" جو کچھ ہو اُس وقت اہل کمال، نا قدری اور کس مپرسی کے ہاتھوں تنگ آکر اپنے وطن عزیز کو خیر باد کہنے پر مجبور ہوئے، اور سید حیدر بخش بھی جن کا تخلص حیدری تھا اُسی جمِ غفیر کی پیروی میں گھر سے باہر نکلے، چندے اِدھر اُدھر سرگردان و پریشان پھرے آخر قسمت نے اُنہیں کلکتہ کے فورٹ ولیم میں پہنچا دیا۔ اور وہاں اُنہوں نے شعبۂ تصنیف و تالیف میں ملازمت اختیار کر لی۔ آپ نے سنہ ۱۲۱۶ ہجری مطابق سنہ ۱۸۰۱ء میں ایک فارسی کے قصّہ کو سلیس اُردو کا جامہ پہنانا شروع کیا۔ اور اس کا نام آرائش محفل رکھا۔ لیکن یہ خیال نہ کرنا چاہیے کہ یہ کتاب اُس فارسی قصّہ کا لفظ بلفظ ترجمہ ہے کیونکہ بقول مؤلف "اکثر اس میں اپنی طبیعت سے جہاں موقع پایا اور زیادہ کیا تاکہ قصّہ طولانی ہو جائے اور سُننے والے کو خوش آئے" جب یہ کتاب درجۂ تکمیل کو پہنچی تو مصنف نے ایک قطعۂ تاریخ بھی کہا جو کتاب کے آخر میں درج ہے۔ وھو ہٰذا۔

اس قصّۂ پر لطف کے اتمام کی تاریخ — میں دل میں سمجھتا تھا نہایت ہی ہے مشکل

کر دور سر پاس کہا پیر خرد نے — کیونکر نہ کہیں ہم اسے آرائش محفل

آرائش محفل کے علاوہ طوطا کہانی، دہ مجلس، گلزارِ دانش یعنی ترجمۂ بہارِ دانش، اور

تاریخ نادری بھی آپ سے یادگار ہیں۔ طوطی نامہ، ابن نشاطی نے عبداللہ قطب علی شاہ کے زمانہ میں دکنی زبان میں لکھا تھا۔ مگر ماخذ اس کا ایک سنسکرت کتاب ہے، حیدری نے طوطا کہانی کے نام سے اُسے اُردو میں لکھا ہے۔ (کلکتہ ۱۸۰۲ء و ۱۸۰۴ء)۔ وہ مجلس جس کا دوسرا نام گلِ مغفرت ہے مسلمانوں کے اولیاء اللہ کے حالات میں لکھی ہے اور اس میں سلمان شہداء کے حالات آنحضرت صلعم سے لیکر شہادت کربلا تک درج ہیں۔ (مطبع ۱۸۱۲ء) تاریخ نادری کسی فارسی تاریخ کا ترجمہ ہے جس میں نادر شاہ کے حالات درج ہیں۔ اور فارسی کی مشہور کتاب بہار دانش کا ترجمہ گلزار دانش کے نام سے کیا ہے۔ اس میں عورتوں کی چالاکی اور مکر و فریب کا ذکر ہے۔

ان بزرگوں کے حالاتِ زندگی کا کچھ پتہ نہیں چلتا۔ غنیمت ہے کہ میر امّن دہلوی نے دو چار سطریں باغ و بہار میں اپنی نسبت نہ سہی اپنے بزرگوں کے بارے میں لکھ تو دیں۔ اُن کے ہمعصروں نے تو اتنا بھی نہ کیا۔ نگاہیں بیتاب ہو کر ان مصنفین کے حالات دیکھنے کو انکی کتابوں کے صفحات پر پڑتی ہیں لیکن مایوس ہو کر لوٹتی ہیں۔ آزاد کو شعراء کے حالات کچھ تو پرانے لوگوں کی زبانی معلوم ہو گئے، کچھ تذکروں سے پتہ چل گیا۔ نثر کی طرف نہ کسی کو توجہ تھی نہ نثارانِ باکمال سے دلچسپی تھی۔ خود ان مصنفین کو بھی یہ خیال نہ تھا کہ ہم اُردو نثر کے عَلَم بردار اور پیش رو ہیں، ایک زمانہ آئیگا کہ لوگ ہمارے حالات کا کھوج لگانے کی کوشش کرینگے اور بشرطِ حصول نہایت ذوق و شوق سے پڑھیں گے، جب یہ حال ہے تو آج تنہا کو کون بتائے کہ یہ بزرگ کس سنہ میں پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم کس سے پائی اور کہاں تک علمی استعداد بہم پہنچائی، کس مزاج کے آدمی تھے، لوگوں سے انکا برتاؤ تھا وغیرہ اتفاق سے اس قدر ضرور معلوم ہو گیا کہ آپ نے ۱۸۲۸ء میں انتقال فرمایا۔

چار و ناچار حالات سے قطع نظر کر کے آپ کی کتاب آرائشِ محفل سے کچھ عبارت نقل کرتا ہوں تاکہ ہماری زبان کی ابتدائی نثر کا نمونہ معلوم ہو جائے یہ امر قابلِ لحاظ ہے کہ اس کتاب کی

عبارت بھی میرامّن دہلوی جیسی صاف شستہ اور بامحاورہ ہے۔ شاہ عبدالقادر صاحبؒ کے دیباچہ یا ترجمہ جیسی نہیں مطلب سمجھنے میں کسی قسم کی دقت یا رُکاوٹ کا کیا ذکر بلکہ زبان آجکل کے مذاق کے مطابق ہے، بشرطیکہ دو چار جگہ تھوڑی سی تبدیلی کر دی جائے۔

پہلا قصہ:- سُنا ہے کہ خراسان کے ملک میں ایک بادشاہ تھا کہ لاکھوں سوار و پیادے اُس کے جلوس میں ہمیشہ ساتھ رہا کرتے تھے، اور عدل و انصاف میں ایسا تھا کہ شیر و بکری کو ایک گھاٹ پر پانی پلاتا تھا بلکہ اپنے بیٹے کا بھی پاس نہ کرتا تھا، اُس کے وقت میں برزخ سوداگر نہایت مالدار تھا۔ اپنے گماشتوں کو ہر ایک ملک میں سوداگری کا مال و اسباب دیکر بھیجا کرتا تھا اور آپ اُس ملک میں دلجمعی سے رہتا تھا۔ بادشاہ سے بھی اُس نے بہت سی رسوخیت بہم پہنچائی تھی اور بادشاہ کی بھی اُس پر کمال مہربانی تھی۔ ایک مدت بعد قریب المرگ پہنچا، اُس کی زندگی کا پیالہ بھرنے لگا۔ وہ حسن بانو کے سوا بیٹا بیٹی کوئی نہ رکھتا تھا، چنانچہ وہ مال اُسی لڑکی کو ملا۔ اُس وقت وہ بارہ برس کی تھی، آخر اس کو اس نے اپنے گھر کا وارث کیا اور اُس کو بادشاہ کے سپرد کر کے آپ مُلکِ عدم کا رستہ لیا۔ بادشاہ نے اُسکو بھی اپنی لڑکیوں کی طرح رکھا اور اُس کے زر و جواہر کا کچھ لالچ نہ کیا۔ بلکہ وہ سب اسباب اُسی کو سونپا۔ چند روز بعد جب وہ لڑکی شعور دار ہوئی تو اپنے ذہن کی رسائی اور نیک بختی کے باعث سے دائی سے کہا کہ اے مادر مہربان دنیا مانند حباب ہے، اس کا مٹنا کچھ بڑی بات نہیں، اس قدر دولت تنہا لیکر میں کیا کروں گی مصلحت یہی ہے کہ اس کو خدا کی راہ میں لُٹا دوں اور آپ کو آلائشِ دنیاوی سے پاک رکھوں اور شادی نہ کروں بلکہ یادِ خدا میں مصروف رہوں، اس واسطے تم سے پوچھتی ہوں کہ اس سے کس طرح چھٹکارا پاؤں، جو مناسب جانو کہو۔ دائی نے کہا۔ اے جانِ پدر تو ان سات سوالوں کا اشتہار لکھکر دروازہ پر چپکا دے اور یہ کہہ کہ جو کوئی میرے ساتوں سوال پورے کریگا میں اُسکو قبول کرونگی اور وہ سوال یہ ہیں۔ پہلا سوال یہ ہے کہ وہ کیا ہے جو ایک بار دیکھا دوسری بار دیکھنے کی ہوس ہے۔ دوسرا سوال یہ ہے کہ نیکی کر اور دریا میں ڈال

تیسرا سوال یہ ہے کہ کسی سے بدی نہ کر اگر کرے گا تو وہی پائیگا۔ چوتھا سوال یہ ہے کہ سچ کہنے
والے کو ہمیشہ راحت ہے۔ پانچواں سوال یہ ہے کہ کوہِ ندا کی خبر لاوے۔ چھٹا سوال یہ ہے کہ
وہ موتی جو مرغابی کے انڈے کی برابر بالفعل موجود ہے اُس کی جوڑی پیدا کرے۔ ساتواں سوال
یہ ہے کہ حمام بادگرد کی خبر لاوے۔ حسن بانو نے دائی کی اس بات کو پسند کیا اور خوش ہو کر
دل میں کہا وہ ایسا کون ہے جو ان ساتوں سوالوں کو بہم پہنچائیگا۔ اسی گمان پر وہ ہر وقت
روزہ نماز میں مشغول رہتی۔ ایک روز کوٹھے پر سے بازار کا تماشا دیکھ رہی تھی کہ اتنے میں ایک
فقیر بزرگ صورت مع چالیس خادموں کے اِس کی طرف سے گزرا، وہ پاؤں زمین پر نہ
رکھتا تھا۔ چنانچہ اُس کے ساتھی سونے چاندی کی اینٹیں رکھتے اور وہ ان پر قدم رکھتا چلا جاتا
تھا۔ حسن بانو نے یہ حال دیکھکر دائی سے کہا کہ اے ماں یہ فقیر بڑا صاحب کمال معلوم ہوتا
ہے جو اس شان و شوکت سے راہ چلتا ہے۔ اُس نے کہا یہ بادشاہ کا پیر ہے۔ ہر مہینے میں
بادشاہ دو چار بار اس کے پاس جاتا ہے اور کبھی یہ بھی بادشاہ کے پاس آتا ہے، اس کی برابر
دنیا میں کوئی درویش نہیں کیونکہ یہ نہایت پرہیزگار ہے۔ حسن بانو نے کہا کہ تم پروانگی دو کہ میں
اِس فقیر کی مہمانی کروں اور گھڑی دو گھڑی بلاکر تکلیف دوں، اور اپنی آنکھیں اُسکے قدموں پر
ملوں، دائی نے کہا یہ کام تو شوق سے کر مثل مشہور ہے آنکھوں سکھ کلیجہ ٹھنڈک۔ غرض اُس نے
اُس فقیر سے کہلا بھیجا کہ کسی دن میرے سیہ خانہ کو اپنے قدمِ مبارک سے روشن کرو تو یہ کمترین
دونوں جہان کی دولت حاصل کرے اور اپنے دامنِ مُراد کو گوہر مقصد سے بھرے۔ غرض ایک
شخص نے اُس فقیر سے جاکر کہا کہ بزرگوں کو لازم ہے کہ خردوں پر مہربانی کرکے اُنکے دامنِ تمنا
کو گلِ مُراد سے بھریں۔ یہ اُس نے قبول کیا اور کہا ضرور آؤنگا کیونکہ یہ سنتِ نبوی ہے۔ جو اس سے
پھرے وہ قعرِ جہنم میں گرے، مگر آج مجھے کام ہے، کل ضرور آؤنگا۔ یہ خبر حسن بانو کو پہنچی کہ
کل دو چار گھڑی دن چڑھے شاہ صاحب مع چالیسوں آدمیوں کے رونق افزا ہونگے۔ یہ سُنکر
اُس نے ہر قسم کے کھانے پکوائے اور کئی خوان میوے اور مٹھائی کے تیار کیے، اور کئی کشتیاں زر و جواہر

کی بھی شاہ صاحب کی نذر کے لیے رکھیں۔ اس امید پر کہ کل شاہ صاحب آئیں گے تو ان کی نذر کروں گی۔ اسی انتظار میں تھی کہ صبح کو وہ درویش مع چالیس فقیروں کے سونے چاندی کی اینٹوں پر قدم رکھتا ہوا حسن بانو کے گھر تک آیا۔

کروں وصف اسکا میں اب تجھسے کیا ۔ وہ ظاہر میں انسان تھا مسخرا

جو باطن پہ اسکے کروں میں نظر ۔ تو شیطان سے بھی ہو وہ ابلیس تر

نہ بالے کا خطرہ نہ بوڑھے کا غم ۔ وہ ہے قتل کرنے میں تیغ دودم

اور حسن بانو نے دروازہ سے نشستگاہ تک زریں فرش بچھوا رکھا تھا وہ اس کو روندتا ہوا مسند شاہانہ پر آ بیٹھا۔ خواجہ سرا زر و جواہر کی کشتیاں روبرو لائے، اس نے قبول نہ کیا اور کہا یہ اسباب میرے کس کام کا ہے، اس کے بعد ایک دسترخوان لطیف اور پاکیزہ بچھا کر اس پر سونے چاندی کے خوان میوے بھرے ہوئے رکھے، ان میں ہر قسم کے کھانے بھی تھے اور فرش شاہانہ بچھا تھا اور پردے زربفت کے کلابتون کی ڈوریوں سے دروں پر بندھے تھے۔ اور ایک نمگیرہ الماس کا اس کے آگے جھمجھما رہا تھا اور خوجے لباس زریں پہنے، سونے چاندی کی چلمچی آفتابہ لائے اور ہاتھ دھلوا کر باادب کھڑے ہو کر عرض کرنے لگے کہ ہماری بی بی اس بات کی آرزومند ہے کہ خداوند کچھ تناول کریں۔ یہ بات سنکر وہ مکار کھانا کھانے لگا۔ اور سونے چاندی کے اسباب کو بھانپنے لگا اور ہر نوالے پر اپنے جی میں کہتا تھا کہ یہ ترنج سوداگر بڑا مالدار تھا جو اتنا اسباب بادشاہوں کی طرح چھوڑ گیا۔ آج ہی رات کو یہ سب اپنے گھر پر لیجانا چاہیے۔ اسی سوچ میں اس ملعون نے تھوڑا بہت کھانا زہر مار کر کے ہاتھ کھینچا۔ پھر خواص جڑاؤ عطردان لائے، اس نے وہ عطر اپنی ڈاڑھی اور پوشاک میں ملا اور ظروف مینا کار کو تاکا۔ اور حسن بانو کو دعائیں دیکر رخصت ہوا حسن بانو کے نوکر اس کی ضیافت کے کاروبار میں تھک کر رات کو بے اختیار ہو کر سو رہے نہ انہوں نے کوٹھوں کے دروازے بند کیے، نہ زر و جواہر کو ٹھکانے سے رکھا۔ پہر رات گئے وہ ڈکیت انسان صورت

شیطان خصلت اپنے چالیسوں چوروں کے ساتھ اُس کی حویلی میں آیا اور تمام زر و جواہر
غارت کرنے لگا۔ اِس عرصہ میں تھوڑے لوگ جاگ اُٹھے، وہ اِن ظالموں کے ہاتھ سے
زخمی ہوئے اور کچھ مارے گئے۔ حُسن بانو کھڑکی سے جھانک رہی تھی اور سب کو پہچان کر کہہ رہی
تھی کہ افسوس یہ ہوا تو وہی خانہ خراب فقیر اور اُس کے ساتھی ہیں۔ اِس کا علاج کوئی کیا کرے
غرض رات اسی بکھیڑے میں کاٹی۔ صبح کو مُردوں اور زخمیوں کو چارپائی پر ڈالکر بادشاہ کے
حضور میں لے گئی اور فریادیوں کی طرح بآوازِ بلند دُہائی دیکر کہنے لگی کہ میں لُٹ گئی، بادشاہ نے
پوچھا کون ہے اور کس کے ظلم سے اتنی بیقرار ہے۔ خبرداروں نے عرض کی برزخ سوداگر کی
لڑکی چارپائیوں پر کئی زخمی اور مُردے لائی ہے۔ اور رو کر عرض کرتی ہے کہ اگر جہاں پناہ
نزدیک بُلائیں تو یہ لونڈی کچھ حال اپنی واردات کا حضور میں بیان کرے۔ یہ سُنکر بادشاہ نے
نزدیک بُلاکر پوچھا، اُس نے مجرا دیکر کہا۔ عمر و دولت خداوند کی بڑھے اور مہرِ انصاف
سپہرِ ہستی پر تاقیامت جلوہ گر رہے۔ کل دن کو لونڈی نے فقیر کی دعوت کی تھی، اُس نے
یہ غضب مجھ پر کیا کہ پہر رات گئے اپنے چالیسوں ساتھیوں سمیت آکر میرے گھر کو لوٹا۔
دس بیس کو زخمی کیا اور چار کو مار ڈالا اور گیارہ بارہ لاکھ روپے کا زر و جواہر لے گیا۔
خدا اُس کا مُنھ کالا کرے کہ اتنا ظلم و ستم اُس نے مجھ پر کیا۔ یہ سُنکر بادشاہ غصہ ہو کر کہنے لگا
اے بے وقوف تجھے کچھ بھی شعور ہے جو ایسے ولی کو تہمت لگاتی ہے، وہ تمام جہان
کی چیزوں سے نفرت رکھتا ہے۔ حُسن بانو نے پھر کہا کہ اے حضرت ایسے کافر کو ولی
نہ کہیے، یہ تو شیطان سے بھی زیادہ ہے۔ آپ کیا ارشاد فرماتے ہیں ؎

اس کو کس طرح سے کہیں انساں ہے یہ ملعون زادۂ شیطاں

اِس بات کو سُنکر وہ اور بھی غضبناک ہوا اور تاؤ پیچ کھاکر کہنے لگا کہ ارے کوئی ہے
جو اِس کمبخت لڑکی کو میرے سامنے ہی سنگسار کرے کہ یہ اپنی سزا کو پہنچے تاکہ اوروں کو
عبرت ہو اور پھر کوئی یہ حرکت نہ کرے کہ ایسے بزرگ کو یہ بات کہے۔ اتنے میں ایک وزیر

نیکو اپنی جگہ سے اُٹھا اور پایۂ تختِ شاہی چوم کر عرض کرنے لگا کہ جہاں پناہ! یہ وہی برزخ سوداگر کی بیٹی ہے کہ جس کے سر پر حضور دستِ شفقت اس کے باپ کی زندگی میں پھیرتے تھے اور پیار کر کے پاس بٹھاتے تھے۔ آج اُسکو سنگسار کرتے ہو۔ اس کو مار وگے تو ان غلاموں کے دلوں سے خداوندکی مہربانی اور بندہ پروری کا اعتماد اپنے فرزندوں کے حق میں اُٹھ جائیگا اور ہر ایک اس اندیشہ سے ہلاک ہوگا کہ جہاں پناہ ہمارے فرزندوں کے ساتھ بھی یہی سلوک کرینگے جو آج اس لڑکی کے ساتھ کرتے ہیں اور ان کا خیال کر کے کنارہ کش ہونگے، اغلب ہے کہ غنیم سے جا ملیں اور حضور سے دشمنی کریں۔ واجب تھا عرض کیا۔ آگے جو مرضی خداوند کی، بادشاہ نے کہا کہ میں نے تیری سفارش اور برزخ سوداگر کی روح کی خاطر سے اس کی جان بخشی کی۔ اگر یہ اپنا بھلا چاہتی ہے تو اس شہر سے نکل جاوے ملکہ حضورِ عالی کے لوگ اس کو نکال دینے آئیں، اور زر و جواہر سے لیکر جھاڑو دکا تنکا تک اس کا توشہ خانہ میں داخل کریں"۔

میرزا علی لطف

آپ کا نام میرزا علی ہے، اور لطف تخلص ہے۔ آپکے والد کاظم بیگ خاں استرآباد کے رہنے والے تھے ۱۱۵۲ھ ہجری میں نادر شاہ کے ساتھ شاہجہاں آباد تشریف لائے اور ابوالمنصور خاں صفدر جنگ کی وساطت سے دربار شاہی میں رسوخ پایا۔ فارسی کے شاعر تھے اور ہجری تخلص کرتے تھے، فارسی میں میرزا علی لطف باپ ہی کے شاگرد تھے۔ لطف گلشنِ ہند کے دیباچہ میں لکھتے ہیں: "میرا ارادہ سیر حیدرآباد کا تھا۔ مگر چونکہ مسٹر گلکرائسٹ نے بڑے اخلاق اور تپاک کے ساتھ مجھ سے اس تذکرے کے لکھنے کی خواہش کی لہٰذا میں نے اسے بسر و چشم قبول کیا"۔ اس کے بعد نواب سعادت علیخاں اور مارکوئس آف ولزلی کا ذکر کرتے ہیں اور پھر لکھتے ہیں کہ "موافق حکم اُن صاحب والا مناقب

کے، کہ نامِ نامی اور اسمِ گرامی اُس کا اوپر مذکور ہوا ہے، اِس ہیچمدان نے یہ تذکرہ لکھا۔"
تذکرۂ گلشنِ ہند مؤلف نے ۱۸۰۱ء میں ترتیب دیا۔ لُطف ایک معمولی شاعر ہیں، غزل
وقصیدہ و مثنوی سب کچھ لکھا ہے۔ مگر کلام میں لطف نہیں۔ البتہ یہ تذکرہ ایک ایسا کارنامہ ہے
جو اُردو زبان میں قابلِ یادگار رہے۔ زبان صاف اور سادہ ہے تاہم قافیے کو ہاتھ سے جانے
نہیں دیتے۔ بعض باتیں اِس تذکرہ میں ایسی درج ہیں جن کا ذکر کسی اور جگہ نہیں پایا جاتا۔
تاریخی حالات بھی خوب درج کیے ہیں۔ خود شیعہ ہیں اور بعض اہلِ سنّت کا ذکر تعصب
کے ساتھ کرتے ہیں، یہاں تک کہ بعض باتیں بالکل لغو اور کذب سے پُر بیان کر جاتے ہیں
مثلاً شاہ ولی اللہ صاحب کی نسبت لکھا ہے کہ "قرۃ العین فی ابطال شہادت الحسنین اور
جنت العالیہ فی مناقب المعاویہ ان کی تصانیف سے ہیں" حالانکہ اُن مباحث میں انکی
کوئی تصنیف نہیں ہے، نہ شہادت حسنین کا ابطال کیا ہے، نہ مناقبِ معاویہ میں
کوئی کتاب لکھی ہے، اس کے بعد یہ کہکر کہ "یہ والد ہیں شاہ عبدالعزیز کے" خوب ہجو ملیح
کی ہے۔ یا تانا شاہ کے حالات میں لُطف نے عالمگیر کی نسبت یوں گہرافشانی فرمائی ہے کہ

"خلد مکاں نے استیصال بادشاہانِ دکن کا جو اس محنت سے کیا، اور مکہ مسجد کو کھدوا کے
وہ کچھ مظلمہ اپنی گردن پر لیا، خدا جانے اس حرکت کا کیا مفاد ہے" مکہ مسجد کا کھدوانا نرا بہتان اور
صریح جھوٹ ہے۔ تعجب ہے کہ مؤلف نے جو خود حیدر آباد میں رہا ہے، اس کذب کا لکھنا
کیونکر گوارا کیا۔ ہمیں شاید ناظرین کو یہ اطمینان دلانے کی ضرورت نہیں کہ مکہ مسجد موجود ہے
اور اب تک نظرِ بد سے محفوظ ہے۔

لیکن باوجود ان سب باتوں کے میرزا لطف بعض اوقات سچ کہنے میں بھی تامل
نہیں کرتے اور بے کم وکاست بیان کر جاتے ہیں۔ مثلاً نواب آصف الدولہ کے حالات میں
اُن کی داد و دہش اور مروت کی بے انتہا تعریف کی ہے مگر آخر میں صاف لکھدیا ہے۔

"افسوس یہ ہے کہ فوج اور ملک کی طرف سے غفلت تھی، نائبوں کے ہاتھ میں اضافتاً

ملک کا سرانجام رکھا، آپ سیر و شکار سے کام رکھا، مشیر کوئی لائق اور کام کا نہ پایا، اس واسطے ساتھ عزم کے رتبہ تمام کا نہ پایا۔"

اس تذکرہ کی چند خصوصیات مولوی عبدالحق صاحب کے مقدمہ سے انتخاب کر کے لکھی جاتی ہیں:۔

(۱) اول تو سوا سو برس پہلے کی زبان ہے، جس سے زبان کے متعلق بہت کچھ پتہ لگ سکتا ہے اور محقق علم اللسان کو اور نیز اُن لوگوں کو جنہیں زبان کا چسکا ہے بہت کچھ نئی باتیں معلوم ہو سکتی ہیں۔ دکن کی زبان میں بعض الفاظ جو روزمرہ بول چال میں آتے ہیں اور ہم لوگوں کو اجنبی معلوم ہوتے ہیں وہ درحقیقت پرانی زبان کی یادگار ہیں۔ مثلاً "کر کے" کا خاص استعمال جو دکن میں روزمرہ سنا جاتا ہے اس تذکرہ میں بھی جا بجا موجود ہے۔ جیسے:۔

"شورش تخلص، متوطن عظیم آباد کے، مشہور میر بہا کر کے تھے۔"

فعل کے بعض استعمال بھی جو حیدر آباد میں کثرت سے سننے میں آتے ہیں اس کتاب میں پائے جاتے ہیں۔ مثلاً فعل متعدی میں فعل بلحاظ مفعول کے آتا ہے مگر اس کتاب میں بعض جگہ فاعل کے لحاظ سے آیا ہے۔ دکن میں عموماً اسی طرح بولتے ہیں ضیا کے حال میں لکھا ہے:۔

"دلی سے جب لکھنؤ میں آئے تو طور سکونت کا وہیں ٹھیرائے۔" فقیر کے تذکرے میں لکھتے ہیں:۔ "بیشتر دکن بطور سیاحت کے دیکھے، اور اکثر مقاموں میں سیر کی وضع پر پھرے۔"

(۲) دوسرے علاوہ اسکے کہ مؤلف ایسے زمانے میں تھا جبکہ نظم اردو عروج پر تھی اور بڑے بڑے اساتذہ زندہ تھے اور مؤلف اُن کا ہمعصر تھا اور ان میں سے اکثر سے شناسائی اور دوستی بھی، اور اس لیے جس وثوق اور صحت کے ساتھ اُن کے حالات یہ لکھ سکتا ہے دوسرا نہیں لکھ سکتا۔ اور بعض حالات تو ایسے لکھے ہیں جو کہیں دوسری جگہ دیکھنے میں نہیں

آئے۔ مثلاً رزیڈنٹ لکھنؤ کا میر تقی کو فورٹ ولیم کالج کلکتہ میں زبانِ ریختہ کی تالیف و تصنیف کے لیے طلب کرنا اور بوجہ پیرانہ سالی اُن کا منتخب نہ ہونا۔

(۳) تیسرے صاحبِ تذکرہ نے ایک یہ کام بھی بہت اچھا کیا ہے کہ جن لوگوں کو تھوڑا یا بہت یا کسی قدر تعلق سلطنت سے رہا ہے اُن کے تذکرے میں تاریخی حالات بھی خوب خوب لکھے ہیں۔ چنانچہ شاہ عالم متخلص بہ آفتاب کے حال میں اُن کا بزمانۂ ولیعہدی عماد الملک کے خوف سے دلی چھوڑنا، باپ کا دھوکے سے فیروز شاہ کے کوٹلے میں قتل ہونا اور ان کا ۱۱۷۳ھ میں تخت نشین ہونا، رام نراین سے جنگ، دلیر خاں کی دلیری اور جاں نثاری، فتح و نصرت کا حاصل ہونا وغیرہ وغیرہ بالتفصیل لکھا ہے۔ مرزا محمد رضا امید کے حالات میں اکثر تاریخی واقعات اور قصص لکھے ہیں۔ خصوصاً میرزا محمد رضا امید کے تذکرے میں امیر الامرا حسین علی خاں اور اُن کے بھائی کے حالات بڑی خوبی سے تحریر کیے ہیں۔

(۴) چوتھے اس کتاب سے زمانے کی سوسائٹی پر بھی روشنی پڑتی ہے اور یہ بات تو صاف صاف نظر آتی ہے کہ ہمارے شاعروں کا گروہ عجیب بے فکرا تھا اور دنیا و مافیہا کی کچھ خبر نہ تھی۔ اخیر میں جب ہمارے بادشاہ، نواب اور اُمرا اس طرف جھکے تو وہ بھی ایسے ہی ہو گئے۔ ان لوگوں نے رہا سہا انہیں اور کھو دیا، ملک گیری اور ملک داری کبھی کی جا چکی تھی۔ اس لیے اولوالعزمی اور ہمت بھی اسکے ساتھ ہی رخصت ہو گئی۔ جسمانی اور دماغی قوتوں میں انحطاط پیدا ہو گیا تھا، ایسی حالت میں حقیقی مسرت کہاں! البتہ عارضی خوشحالی اور جھوٹی زندہ دلی موجود تھی، شعر و شاعری نے اس کا سامان اور مہیا کر دیا، دیوانہ را ہوئے بس است، شاعروں کی بن آئی، وہ تو اس شغل میں رہے، اور یہاں کام تمام ہو گیا۔

علاوہ اس عام حالت کے تذکرے میں جو بعض باتیں ضمناً بیان کر دی ہیں وہ بھی دلچسپی سے خالی نہیں ہیں۔ ایک واقعہ یہ ہے کہ نواب وزیر اودھ اس زمانے میں جبکہ ان کا عروجِ اقبال تھا اور بادشاہ نام کے بادشاہ رہ گئے تھے، تب بھی شاہانِ دہلی اور ان کے گھرانے کی

بے انتہا تعظیم و تکریم کرتے تھے، اور تعظیم بھی ایسی کہ آجکل کے نوجوانوں کے خیال میں بھی نہیں آسکتی چنانچہ میرزا جوان بخت جہاندار شاہ کے حال میں لکھا ہے کہ وہ ۱۱۹۸ھ ہجری میں دلی سے لکھنؤ چلے آئے تھے۔

"نواب آصف الدولہ مرحوم نے جو مراتب آداب و خدمت گزاری کے تھے سب ادا کیے، خواص میں بیٹھنے کے سوا گھڑیوں ہاتھ باندھے سامنے کھڑے رہے، باوصف اس نازپروری کے کہ کبھی پیادہ قدم کاہے کو چلے تھے، پانچوں ہتھیار باندھے ہوئے ایک الائچی اور گلوری کی بخشش پر دس دس مرتبہ مجرا گاہ پر سے جاکر آداب بجالاتے تھے۔"

(۵) پانچویں بعض ایسے لوگوں کا بھی حال دیا ہے جن کی نسبت اُردو کی شاعری کا گمان بھی نہیں ہوسکتا مثلاً کوئی کہہ سکتا ہے کہ شاہ ولی اللہ اُردو کے شاعر تھے، اور اُن کا تخلص اشتیاق تھا۔ یا عبدالقادر بیدل بھی اُردو میں شعر کہتے تھے یا تانا شاہ سے بھی ایک شعر منسوب ہے، بعض ایسے شعرا کا بھی کلام درج ہے کہ جن کا نام تو بہت مشہور ہے مگر کلام دستیاب نہیں ہوتا۔

یہ تذکرہ درحقیقت علی ابراہیم خاں نے فارسی میں لکھا تھا اور اسکا نام گلزار ابراہیم رکھا تھا کوئی بارہ برس کی محنت میں ۱۱۹۸ھ ہجری مطابق ۱۷۸۴ء میں جاکر ختم ہوا۔ میرزا علی لطف نے اس کتاب کو اُردو میں لکھا، لیکن یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ یہ نرا ترجمہ ہے بلکہ مترجم نے اس میں بہت کچھ اضافہ کیا ہے، حالات میں بھی اور کلام میں بھی جس سے بالکل نئی صورت پیدا ہوگئی ہے۔ اور اس کو تالیف سمجھنا چاہیے۔

حکیم رضا قلی خاں آشفتہ اور میر غلام حسن کے حالات گلشنِ ہند سے اقتباس کرکے درج کیے جاتے ہیں:-

آشفتہ

"آشفتہ تخلص، حکیم رضا قلی خاں نام، والدِ ماجد اِن کے حکیم محمد شفیع محمد خاں مرحوم تھے، متوطن اکبر آباد کے، بڑے بھائی اُن کے میرزا ہجو صاحب، خدا مغفرت کرے، ذرہ

تخلص کرتے تھے، عجیب ولولہ اور ذوق شوق کے ساتھ کربلائے معلیٰ گئے، اور وہیں خاک
ہوئے، روبرو ضریح مقدس کے دفن ہیں، حق سبحانہ تعالیٰ حشر بھی ان کا، اور جمیع مومنین کا
جناب سید الشہدا علیہ السلام کے ساتھ کرے، دوسرے بھائی ان کے میرزا رضی صاحب
وہ بھی ان سے بڑے ہیں، بالفعل لکھنؤ میں داد طبابت اور معالجے کی دے رہے ہیں، سچ تو
یہ ہے کہ جو جو اختراعات فن طبابت میں انہوں نے کیے دیکھنے کا کیا دخل ہے کسی نے نہیں سنے
حذاقت اور لیاقت ان کے خاندان کی نہیں ہے محتاج تشریح اور بیان کی، ہمیشہ بزرگ
ان کے معالج سلاطین نامدار کے رہے ہیں، اور امیروں سے بلکہ وزیروں سے سدا ناز و اعزاز
کیا کیے ہیں، غرض حکیم رضا قلی خاں آشفتہ تخلص راقم آثم کے دوستان قدیم سے ہیں
جوان آزاد وضع، اور خوش اختلاط و وارستہ مزاج، اور مایۂ ارتباط میں محبت، اور یکرنگی میں
خلاصے، اور آشنائیوں کے بہت خاصے، حسن پرستی میں عدیل لیلی و شیریں کی تصویر، اور
عشق بازی میں قیس، و فرہاد کے پیر ہیں۔ مشورہ سخن کا انہوں نے میر سوز صاحب سے
کیا ہے، لیکن شاگردوں میں ان کے اتنا کوئی نہیں ہوا ہے، میر صاحب مذکور کے
طرز ادائیہ میں انہوں نے رنگینی کچھ اور بھی زیادہ کی ہے، سچ تو یہ ہے کہ رنگین ادائی کی
داد دی ہے۔ چندے انہوں نے رفاقت میرزا محمد تقی خاں کی کی جو کہ پوتے میرزا ابو یوسف
کے تھے، اس سبب سے دو اڑھائی برس بود و باش ان کی فیض آباد میں ہوئی تھی،
ورنہ پرورش انہوں نے لکھنؤ میں پائی ہے، اور کیفیت زندگی کی وہیں اٹھائی ہے۔ سنہ ۱۲۰۵ھ
میں لکھنؤ سے مرشد آباد میں آئے، نواب مبارک الدولہ ناظم صوبہ بنگالہ مرض الموت
میں گرفتار تھے، اگرچہ معالجہ میں انہوں نے رنگ مسیحائی کے دکھائے، لیکن قضا و قدر
سے لاچار تھے، بعد نواب مبارک الدولہ کی وفات کے خلف الصدق سے ان کے یعنی
نواب عضد الدولہ ناصر الملک سید بابر علیخاں بہادر دلیر جنگ سے، نہایت موافقت
آئی، اور صحبت نے بہ شدت یک رنگی پائی چنانچہ سات برس کامل ان کی خدمت میں رہے

اور قریب لاکھ روپئے کے بنگالہ میں پیدا کیے، لیکن خرچ کرنے والے بھی ایسے ہی بلائے روزگار تھے، کہ جس دن مرشد آباد سے نکلے تو قرضدار تھے، غرہ ذی الحجہ کو ۱۲۱۴ سنہ ہجری میں اپنے ہی مزاجِ نازک سے، ناحق روزگار چھوڑ کلکتے میں چلے آئے، اور زمانے کی بے رنگی کو مطلق خیال میں نہ لائے، بالفعل کہ ۱۲۱۵ سنہ ہجری ہیں، بہ عزت تمام کلکتے میں اوقات بسر کرتے ہیں، اور راگ رنگ کی صحبتوں میں دن رات بسر کرتے ہیں، طبیعت ان کی موسیقی کی طرف لڑکپن سے ہے، اور ایک مناسبت بھی بھلی چنگی ان کو اس فن سے ہے، اپنی آشفتہ مزاجی میں غزلوں کو انتظام نہیں دیا ہے، وگرنہ مدت سے ایک دیوان کا سرانجام ہو چکا ہے۔ یہ اشعار ان کے نتائج افکار سے ہیں۔

فقط نہ اپنی ہی تم آن دیکھتے جاؤ ۔۔۔ ادھر ادھر بھی مری جان دیکھتے جاؤ
نہ پیچ و تاب کو بالونکے طول دو اتنا ۔۔۔ ہمارا دل ہے پریشان دیکھتے جاؤ
بجائے اشک نکلتے ہیں پارہائے جگر ۔۔۔ تمہارے جی میں تھا ارمان دیکھتے جاؤ
کیا خرید زلیخا نے مصر میں یوسف ۔۔۔ جنابِ عشق کی تم شان دیکھتے جاؤ

یہ خرابی تو پڑی مجھپہ ترے جانے سے ۔۔۔ چھند بھی ڈرنے لگے اب مرے ویرانے سے
کس طرح قید کروں یہ تو ٹھہرتا ہی نہیں ۔۔۔ کون بر آوے بھلا اس دل دیوانے سے؟
میں سمجھتا ہوں کہ تم جا کے نہیں آنے کے ۔۔۔ فائدہ کیا ہے بھلا جھوٹ قسم کھانے سے
شعلہ خو! آگے تو اتنا نہ جلاتا تھا مجھے ۔۔۔ آج تو آگ ہوا غیروں کے بھڑکانے سے

دیکھتے ہی اُسے کل میرے یہ اوسان گئے ۔۔۔ اپنے بیگانے وہاں جتنے تھے سب جان گئے
اپنے کے ہوتے بھلا غیر کو صدقے تو نہ کر ۔۔۔ ہم بھی جی رکھتے ہیں پیارے ترے قربان گئے

مجھ کو کہتا ہے صنم تجھ کو بھی ہاں بھاگ لگے ۔۔۔ آنکھ سے آنکھ ملاتا ہے تجھے آگ لگے
بوسہ کے واسطے چمٹا تو لگا کہنے مجھے ۔۔۔ بس کہیں ڈر بھی ہو منہ کو ترے آگ لگے

حسن

حسن تخلص میر غلام حسن نام شاہجہان آبادی۔ بیٹا میر غلام حسین ضاحک تخلص کا، اولاد ہے میر امامی ہروی کے۔ دلی کے پرانے شہر میں بود و باش رکھتے تھے۔ صغر سن سے وارد لکھنؤ میں ہوئے۔ نواب سالار جنگ اور خلف اُن کے میر نوازش علی خاں سردار جنگ کی رفاقت میں اوقات انہوں نے ساتھ عزت اور غربت کے بسر کی ہے اور اصلاح سخن کی میر ضیاء الدین ضیا تخلص سے لی ہے۔ اقسام علم سے تو جمیع علوم میں انہیں اقرار ہیچمدانی ہے، ہاں مگر اشعار میں ان کے البتہ ایک صفائی اور روانی ہے، قریب آٹھ ہزار بیت کے انواع نظم میں دیوان ان کا ہے، اور ایک تذکرہ بھی ہندی گویوں کا زبان ریختہ میں لکھا ہے، بے نظیر اور بدر منیر کے احوال میں کیا خوب مثنوی لکھی ہے اور سنہ ۱۲۰۱ ہجری میں سیر روضۂ رضواں کی کی ہے۔ یہ اشعار منتخب دیوان ان نکو کردار کے ہیں:۔

گر کیجے رقم کچھ تری وحدت کے بیاں کا — تو چاہیے خامہ بھی اُسے ایک زباں کا

دامن صحرا سے اُٹھنے کا حسن کا جی نہیں — پاؤں دیوانے نے پھیلایا بیاباں دیکھکر

آنکر غمکدۂ دہر میں جو بیٹھے ہم — شمع ساں اپنے تئیں آپ ہی رو بیٹھے ہم

اُس کی جب بزم سے ہم ہو کے تنگ آئے ہیں — اپنے ساتھ آپ ہی کرتے ہوئے جنگ آتے ہیں

مجھ پر ہی یہ ترا ستم و جور کچھ نہیں — لیکن ترا ہر ایک سے یہ طور کچھ نہیں

روٹھا کرے وہ کیوں نہ کسی اور سے حسن — یہ سب بگاڑ چاہ کا ہے اور کچھ نہیں

تیرے ہمنام کو جب کوئی پکارے ہے کہیں — جی دھڑک جاتا ہے میرا کہ کہیں تو ہی نہو

گریباں چاک اور خاموش مجکو دیکھ کہتا ہے — "کروں کیا بات اس سے" یہ تو کچھ دیوار و در سا ہے

نہ رہنے دیگا اُس بن یہ دل تو ایک دم بھی — کیوں روٹھکر ہم اپنا کھوویں عبث بھرم بھی

لطف نے انتخاب کرتے ہوئے اور بہت سے اشعار درج کیے ہیں، لیکن ہم نے بخیال طوالت اُن کو نظرانداز کر دیا ہے۔ ذیل میں صرف اُس مثنوی کے اشعار درج کرتے ہیں جو لکھنؤ کی ہجو میں کہی ہے اور آزاد کو اُس کے اشعار دستیاب نہیں ہوئے۔ چنانچہ آبِ حیات میں لکھتے ہیں کہ:۔

"ایک موقع پر میر حسن مرحوم کا سفر شاہ مدار کی چھڑیوں کے ساتھ مطابق پڑا، چنانچہ سفرِ مذکور کا حال ایک مثنوی کے قالب میں ڈھالا ہے، اس میں فیض آباد کی تعریف اور لکھنؤ کی ہجو کی ہے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت عورتوں کی پوشاک وہاں کیا تھی اور چھڑیوں والوں کے جزئیاتِ رسوم کیا کیا تھے، میں نے یہ مثنوی دلّی کی تباہی سے پہلے دیکھی تھی، اب نہیں ملتی، لوگ بہت تعریف لکھتے ہیں۔"

مثنوی در ہجو لکھنؤ و تعریف فیض آباد

نہیں یہ لکھنؤ ہے۔ یہ زمانا
زمانے پر عبث رکھنا بہانا

زبس یہ ملک ہے پتھر پہ بستا
کہیں اونچا، کہیں نیچا ہے رستا

کسی کا آسماں پر گھر ہوا ہیں
کسی کا جھونپڑا تحت الثریٰ میں

زبس گنجان ہے یہ شہر باہم
سما سکتا نہیں ہے غیر کا دم

سیہ گل سے گلی یوں تر رہے ہے
بعینہ جس طرح زنگی کی بہے ہے

فراغت سے یہاں کس کا مکاں ہے
ہر اک گھر نحس کا سا دل یہاں ہے

کنواں بھی یوں ہے پھر اس تنگ گھر میں
پڑے پُتلی کا تِل جیسے نظر میں

کنواں کہنا اسے ہے عقل سے دور
کہ ہے اس گھر کی چھاتی کا وہ ناسور

کہوں کیا میں قدامت اس مکاں کی
پڑی بنیاد بعد اس کے جہاں کی

ہزاروں راہ اس میں پیچ در پیچ
ولیکن مثلِ زلفِ زشت رو ہیچ

جو اس کے زیرِ سایہ آن نکلے
رُکے دم، اور اسکی جان نکلے

جو کوئی رات کو بھولے یہاں گھر — پھرے گلیوں میں ٹکراتا وہ در در
نہیں امکاں جو گھر اپنا وہ پاوے — بُلا خورشید کو جیسا تک نہ لاوے
زمیں کو فخر ہے یہ شہر ہم عدد ہے — اگر شیعہ کہے نیک اسکو بد ہے
چڑھے ہے گو ہتی جب گرد آکر — حباب آسا یہے پھرتے ہیں سب گھر
رکھنے ہے پار ہو سکنا تب امکاں — چڑھے جب آدمی پر آدمی یہاں
سوائے تند یہاں دیکھا نہ کچھ اور — سو ہے روپوش وہ بھی دیکھ یہ طور
چلا میں یہاں سے دل اپنا اُٹھا کر — کہ کیجے سیر فیض آباد جا کر
عجب معمورہ آباد پایا ہے — مثالِ گُل ہر اک دل شاد پایا
کھلا بازار اور رستہ کشادہ — بیاضِ جدولی جیسے ہو سادہ
دو رستہ راستے میں اتنا رستا — کسی نے آجتک دیکھا ہے بستا
وہ چی ہے شہر کا تبرپولیا یوں — کہ جیسے تن دمیں جسم میں ہوں
اِدھر کو جوہری اودھر کو بزاز — اِدھر صرّاف اور اودھر طلا ساز
روپے اور اشرفی دیکھے برستے — دیلے تختوں پہ جوں نرگس کے دستے
یہ فیرنی[۵] اور فالودے کا عالم — کہے تو چاند اور تارے ہیں باہم
ملا شربت میں جو اُس کو بتاوے — بشب مہ کا سما پانی میں پاوے
ملائی دودھ کی دیکھو تو گویا — اُسی میں مال حلوائی نے کھویا
بلندی پر ہے حلوائی کی دکاں — ستارے گرد ہیں جیسے چراغاں
دھری ہیں گولیاں اور یوں اندرسے — کہ گویا چاند اور تارے ہیں برسے
مٹھائی کی کروں تعریف تا چند — قلم کی ہو گئی اب تو زباں بند
ہزاروں خانگی اور کسبی آکر — کریں ہیں سیرِ لالہ دل لگا کر

---

۵ یعنی فیرنی۔

چمک دامن کی دکھلاتیوں چلے ہی — کہ بجلی اپنے ہاتھوں کو ملے ہے
وہ سبزہ کان میں زیب بناگوش — کہ جسکو دیکھ طوطی کے اڑیں ہوش
شعاع اسکی یہ اور منھ کا پسینا — ہے گویا پھول پر شبنم کا مینا
کوئی کرتی پہن جالی کی سادہ — گریباں کر کے چھاتی تک کشادہ
کیا اس دام میں تکمہ کو یوں صید — سحر کے جوں گریباں میں ہو خورشید
مسافر اس طرف جو آن نکلے — نہ نکلے وہاں سے غیر از جان نکلے

زمانہ کیا کیا رنگ بدلتا ہے؟ آج لکھنؤ کو دیکھو تو فردوس بریں کا نمونہ نظر آئیگا۔ ممالک متحدہ کی گورنمنٹ بھی اپنا جائے اقامت الہ آباد کے بجائے لکھنؤ کو قرار دینا چاہتی ہے اور رفتہ رفتہ لکھنؤ کو منتقل ہو رہی ہے۔ حضرات شیعہ لکھنؤ کو بہت پسند کرتے ہیں، اور فی الواقع یہ مقام اُن کا مرکز بھی ہے، لیکن میرحسن اسکو کوفہ کا ہمعد بتاتے ہیں حالانکہ خود شیعہ ہیں۔ اب ایک سُنّی المذہب لکھنؤ کی تعریف میں یوں زمزمہ سنج ہے:۔ ؎

کہاں ہونگی امیر ایسی ادائیں حور وغلماں میں
رہیگا خلد میں بھی یاد ہم کو لکھنؤ برسوں

میر بہادر علی حسینی

آپ کے حالات کا کچھ پتہ نہیں چلتا۔ صرف اس قدر معلوم ہے کہ فورٹ ولیم کالج کلکتہ کے شعبۂ تصنیف وتالیف میں آپ بھی دوسرے اصحاب کی طرح کتاب نویسی کی خدمت پر مامور تھے اور ہیڈ منشی تھے۔ چنانچہ آپ نے میرحسن دہلوی کی مشہور ومعروف مثنوی سحر البیان (قصّۂ بدرِ منیر و بے نظیر) کو اُردو نثر میں لکھا، اور اس کا نام نثرِ بے نظیر رکھا، آپ نے ایک اور کتاب اخلاقِ ہندی کے نام سے لکھی ہے، اس کتاب کا

ماخذ فارسی کتاب مفرح القلوب ہے جو اصل میں سنسکرت تصنیف ہتوپادیشا سے لیگئی ہے۔ یہ دونوں کتابیں ۱۸۰۲ء میں لکھی گئی تھیں۔ افسوس ہے اِن کتابوں کا کوئی نسخہ ہمیں دستیاب نہ ہوا، ورنہ اُن کا نمونہ ہدیۂ ناظرین کیا جاتا۔ اور شاید مصنف کے مزید حالات بھی معلوم ہوجاتے۔ ع اُنچہ مادر کار داریم اکثرے درکار نیست۔

اِن کتابوں کے علاوہ آپ نے ڈاکٹر گلکرائسٹ کی اُردو صرف ونحو کا خلاصہ گلکرائسٹ اُردو رسالہ کے نام سے کیا جو کلکتہ میں ۱۸۱۶ء میں شائع ہوا۔

(*)

میر امّن دہلوی

آپ کا اصلی نام میر امان ہے اور امّن تخلص ہے۔ اگرچہ کہیں کہیں اشعار میں اپنا تخلص لطف بھی ظاہر کیا ہے۔ بڑے نامور اور خاندانی شخص گزرے ہیں۔ فنِ شعر میں کسی سے اصلاح نہیں لی۔ اپنی طبیعت کی موزونی سے آپ ہی آپ شاعر بن گئے۔ بقول مسٹر فیلن میر امّن خود فرمایا کرتے تھے کہ شاعری میرا پیشہ نہیں ہے۔ نہ میں کسی شاعر کا بھائی۔ میری اُردو ٹکسالی اُردو ہے کیونکہ میں دلی (شاہجہان آباد) کا روڑا ہوں اور یہیں کا پرورش یافتہ ہوں۔

آپ نے اپنے بزرگوں کا حال حسب ذیل الفاظ میں بیان کیا ہے۔ اور کچھ باتیں اپنے متعلق بھی کہہ گئے ہیں:-

"پہلے اپنا حال یہ عاصی میر امّن دلی والا بیان کرتا ہے کہ میرے بزرگ ہمایوں بادشاہ کے عہد سے ہر ایک بادشاہ کی رکاب میں پشت بہ پشت جانفشانی بجالاتے رہے اور وہ بھی پرورش کی نظر سے قدردانی جتنی چاہیے فرماتے رہے۔ جاگیر، منصب اور خدمات کی عنایت سے مالا مال اور نہال کردیا، اور خانہ زاد موروثی اور منصب دار قدیمی، زبان مبارک سے فرمایا چنانچہ یہ لقب بادشاہی دفتر میں داخل ہوا۔ جب ایسے گھر کی کہ سارے گھر اُسکے سبب سے آباد تھے

یہ نوبت پہنچی، ظاہر ہے۔ عیاں را چہ بیاں۔ تب سورج مل جاٹ نے جاگیر کو ضبط کر لیا اور احمد شاہ درانی نے گھر بار تاراج کیا۔ ایسی تباہی اُٹھا کر ایسے شہر سے کہ جنم بھوم میرا ہے اور آنول نال وہیں گڑا ہے، جلا وطن ہوا اور ایسا جہاز کہ جس کا ناخدا، خدا تھا غارت ہوا، میں بیکسی کے سمندر میں غوطے کھانے لگا۔ ڈوبتے کو تنکے کا سہارا بہت ہوتا ہے۔ کئی برس بلدۂ عظیم آباد میں دم لیا۔ کچھ بنی کچھ بگڑی، آخر وہاں سے بھی پاؤں اُکھڑے، روزگار نے موافقت نہ کی عیال و اطفال کو چھوڑ کر تن تنہا کشتی پر سوار ہوا۔ اشرف البلاد کلکتہ میں آب و دانہ کے زور سے آ پہنچا۔ چندے بیکاری میں گزری۔ اتفاقاً نواب دلاور جنگ نے بلوا کر اپنے چھوٹے بھائی میر محمد کاظم خاں کی اتالیقی کے لیے مقرر کیا۔ قریب دو سال کے وہاں رہا۔ جب نباہ اپنا نہ دیکھا، تب منشی میر بہادر علی کے وسیلہ سے حضور جان گلکرائسٹ صاحب بہادر سے رسائی ہوئی۔ بارے طالع کی مدد سے ایسے جوانمرد کا دامن ہاتھ لگا ہے، چاہیے کہ دن کچھ بھلے آویں، نہیں تو یہی غنیمت ہے کہ ایک ٹکڑا کھا کر پاؤں پھیلا کر سو رہتا ہوں اور گھر میں دس آدمی بڑے، چھوٹے پرورش پا کر دعا اُس قدردان کو کرتے ہیں۔ خدا قبول کرے۔"

آپ نے چار درویش کا قصہ اُردو میں ترجمہ کیا اور باغ و بہار نام رکھا۔ یہ ترجمہ اس قدر مقبول ہوا ہے کہ صدہا مرتبہ مختلف مطبعوں میں چھپ چکا ہے، اور اب تک چھپے جاتا ہے۔ اُس زمانہ کے مذاق کے لحاظ سے یہ قصہ نہایت دلچسپ ہے اور سب کو مرغوب ہے۔ اس کی زبان نہایت صاف، شستہ اور بامحاورہ ہے اور دو چار جگہ سے قطع نظر کر کے تمام کتاب آجکل کے روزمرّہ کے موافق ہے۔ اس کی اُردو فصیح اور مستند ہے۔ باغ و بہار کی تالیف ۱۲۱۵ھ ہجری میں شروع ہوئی اور ۱۲۱۷ھ ہجری میں ختم ہوئی اور یہ اس کتاب کا تاریخی نام ہے۔ ان کی نثر کو میر تقی میر کی نظم کے ہم پلہ مانا گیا ہے۔ سر سید نے بھی آثار الصنادید میں یہی رائے ظاہر کی ہے۔

آپ نے [illegible] کے علاوہ اخلاق محسنی کا بھی اُردو میں آزاد ترجمہ کیا جو ایک قابل قدر

کتاب ہے لیکن کمیاب ہے اور گنج خوبی کے نام سے مشہور ہے۔ بسنہ ۱۸۰۲ء میں لکھی گئی تھی میرامن نے باغ و بہار کے ترجمہ کا سبب یہ بیان کیا ہے کہ:-

"یہ قصہ چہار درویش ابتدا میں امیر خسرو دہلوی نے اس تقریب سے کہا کہ حضرت نظام الدین اولیاء زری بخش جو اُن کے پیر تھے اور درگاہ اُن کی دہلی میں قلعہ سے تین کوس لال دروازہ کے باہر، مٹیا دروازہ کے آگے لال بنگلہ کے پاس ہے، اُن کی طبیعت ماندی ہوئی، تب مرشد کامل کا دل بہلانے کے واسطے امیر خسرو یہ قصہ ہمیشہ کہتے اور تیمارداری میں حاضر رہتے، اللہ نے چند روز میں شفا دی، تب اُنہوں نے غسل صحت کے دن یہ دعا دی کہ جو کوئی اس قصہ کو سُنے گا خدا کے فضل سے تندرست رہیگا؛ جب سے یہ قصہ فارسی میں مروج ہوا۔ اب خداوند نعمت، صاحب مروت، نجیبوں کے قدرداں جان گلکرسٹ صاحب نے کہ ہمیشہ اقبال اُن کا زیادہ رہے، جب تک گنگا جمنا بہے، لطف سے فرمایا کہ اس قصہ کو اُردو زبان میں جو ہندوستان کے لوگ ہندو، مسلمان، عورت، مرد، لڑکے بالے، خاص و عام آپس میں بولتے چالتے ہیں ترجمہ کرو۔ موافق حکم حضور کے میں نے بھی اسی محاورہ سے لکھنا شروع کیا، جیسے کوئی باتیں کرتا ہے۔"

کن لوگوں کی زبان مستند ہے؟ آپ اس کا جواب یہ دیتے ہیں کہ:-

"جو شخص دلی کا روڑا ہو کر رہا اور دس پانچ پشتیں اسی شہر میں گزریں، اور اُس نے دربار اُمراء کے دیکھے، اور میلے ٹھیلے، عُرس، چھڑیاں، سیر و تماشا اور کوچہ گردی اُس شہر کی ہوگی اور وہاں سے نکلنے کے بعد اپنی زبان کو لحاظ میں رکھا ہوگا، اُس کا بولنا البتہ ٹھیک ہے۔"

افسوس تقریباً ۵۰ سال کے بعد مرزا غالب اپنے ایک خط میں اہلِ دہلی کی زباندانی کے متعلق میر مہدی مجروح کو لکھتے ہیں:-

"اے میر مہدی! تجھے شرم نہیں آتی۔ میاں یہ اہلِ دہلی کی زبان ہے، ارے

اب اہلِ دہلی ہندو ہیں۔ اہلِ حرفہ ہیں یا خاکی ہیں یا پنجابی یا گورے ہیں، ان میں سے تو کس کی زبان کی تعریف کرتا ہے۔ لکھنؤ کی آبادی میں کچھ فرق نہیں آیا، ریاست تو جاتی رہی باقی ہر فن کے کامل لوگ موجود ہیں۔ .... اللہ اللہ دلی والے اب تک یہاں کی زبان کو اچھا کہے جاتے ہیں۔ واہ رے حسنِ اعتقاد۔ ارے بندۂ خدا۔ اُردو بازار نہ رہا، اُردو کہاں دلی کہاں، واللہ اب شہر نہیں ہے، کیمپ ہے، چھاؤنی ہے، نہ قلعہ، نہ شہر، نہ بازار نہ نہر......"

باغ و بہار میں سے ذیل کی عبارت بطور نمونہ نقل کی جاتی ہے:۔

سیر دوسرے درویش کی

"جب دوسرے درویش کے کہنے کی باری آئی وہ دوزانو ہو بیٹھا اور بولا ؎

اے یارو اس فقیر کا کچھ ماجرا سنو   میں ابتدا سے کہتا ہوں تا انتہا سنو

جس کا علاج کر نہیں سکتا کوئی حکیم   ہوگا ہمارا اور دنیٹ لا دوا سنو

اے دلق پوشو! یہ عاجز بادشاہزادہ ملک فارس کا ہے، ہر فن کے آدمی وہاں پیدا ہوتے ہیں۔ چنانچہ اصفہان نصف جہان مشہور ہے ہفت اقلیم میں اُس اقلیم کے برابر کوئی ولایت نہیں کہ وہاں کا ستارہ آفتاب ہے اور وہ ساتوں کواکب میں نیرِ اعظم ہے، آب و ہوا وہاں کی خوش اور لوگ روشن طبع اور صاحبِ سلیقہ ہوتے ہیں، میرے قبلہ گاہ نے جو بادشاہ اُس ملک کے تھے، لڑکپن سے قاعدے اور قانون سلطنت کے مرتب کرنے کے واسطے بڑے بڑے دانا اُستاد، ہر ایک علم و کسب کے چُن کر، میری اتالیقی کے واسطے مقرر کیے تھے تا تعلیم کامل ہر ایک نوع کی پاکر قابل ہوں، خدا کے فضل سے چودہ برس کے سن و سال میں سب علم سے ماہر ہوا۔ گفتگو معقول، نشست و برخاست پسندیدہ اور جو کچھ بادشاہوں کو لایق و درکار ہے سب حاصل کیا اور یہی شوق شب و روز تھا کہ قابلوں کی صحبت میں قصے ہر ایک ملک کے اور احوال و لوازم بادشاہوں اور نام آوروں کا سُنا کروں۔ ایک روز

ایک مصاحب نے کہ خوب تواریخ داں اور جہاں دیدہ تھا مذکور کیا کہ اگرچہ آدمی کی زندگی کا کچھ بھروسہ نہیں لیکن اکثر وصف ایسے ہیں کہ ان کے سبب سے انسان کا نام قیامت تک بخوبی زبانوں پر چلا جاویگا۔ میں نے کہا اگر تھوڑا سا احوال اُس کا مفصل بیان کرو تو میں بھی سُنوں اور اُس پر عمل کروں، تب وہ شخص حاتم طائی کا ماجرا اس طرح سے بیان کرنے لگا۔

قصہ حاتم طائیؒ کا

حاتم طائی۔ ورست میں ایک بادشاہ عرب کا نوفل نام تھا۔ اُسکو حاتم کے ساتھ بسبب نام آوری کے دشمنی کامل ہوئی۔ بہت سی فوج ولشکر جمع کر کے لڑائی کی خاطر چلا آیا حاتم تو خدا ترس اور نیک مرد تھا۔ یہ سمجھا کہ اگر میں بھی جنگ کی تیاری کروں، تو خدا کے بندے مارے جائینگے اور بڑی خونریزی ہوگی، اس کا عذاب میرے نام لکھا جائیگا۔ یہ سوچکر تن تنہا اپنی جان لیکر ایک پہاڑ کی کھوہ میں جا چھپا۔ جب حاتم کے غائب ہونے کی خبر نوفل کو معلوم ہوئی، حاتم کا سب اسباب قرق کیا اور منادی کرادی کہ جو کوئی حاتم کو پکڑ لائے، پانسو اشرفی انعام پائے۔ یہ سنکر سب کو لالچ آیا اور جستجو حاتم طائی کی کرنے لگے، ایک روز ایک بڑھیا اور اُس کا بُوڑھا، دو تین بچے ساتھ لیے ہوئے لکڑیاں توڑنے کے لیے اُس غار میں جہاں حاتم پوشیدہ تھا پہنچے، اور لکڑیاں چُننے لگے، بڑھیا بولی کہ اگر ہمارے دن بھلے آتے تو حاتم کو کہیں دیکھ پاتے اور اُسکو نوفل پاس لیجاتے، وہ پانسو اشرفیاں دیتا تو آرام سے کھاتے اور دُکھ دھندے سے چھوٹ جاتے۔ بوڑھے نے کہا کیا بڑ بڑ کرتی ہے، ہمارے طالع میں یہی لکھا ہے کہ روز لکڑیاں توڑیں اور سر پہ دھر کر بازار میں بیچیں، تب روٹی میسر آئے ...... سلے اپنا کام کر، حاتم ہمارے ہاتھ کاہے کو آئیگا کہ بادشاہ سے اتنے روپئے دلادیگا عورت ٹھنڈا سانس بھر کر چپ ہو رہی، ان دونوں کی باتیں حاتم نے سُنیں، مردمی اور مروت سے بعید جانا کہ آپ کو چھپائے اور جان کو بچائے، اور ان بیچاروں کو مطلب تک نہ پہنچائے سچ ہے جس آدمی میں رحم نہیں وہ انسان نہیں قصائی ہے ؎

دردِ دل کے واسطے پیدا کیا انسان کو ورنہ طاعت کیلئے کچھ کم نہ تھے کروبیاں

غرضکہ حاتم نے قبول نہ کیا کہ اپنے کانوں سے سنکر چپکا ہو رہے۔ وہیں باہر آکر بوڑھے سے کہا کہ اے عزیز حاتم میں ہی ہوں مجھکو نوفل پاس لے چل، وہ مجھکو دیکھکر جو کچھ روپیہ دینے کا اقرار کیا ہے تجھے دیگا، بڈھے نے کہا سچ ہے۔ اس صورت میں بھلائی اور بہبودی میری البتہ ہے لیکن نہ معلوم وہ تیرے ساتھ کیا سلوک کرے۔ اگر مار ڈالے تو میں کیا کروں۔ یہ مجھ سے ہرگز نہو گا کہ تجھ سے انسان کو اپنی خاطر جمع کے لیے دشمن کے حوالے کروں۔ وہ مال کتنے دن کھاؤنگا اور کتنے دن جیؤنگا۔ آخر مروں گا تو خدا کو کیا جواب دونگا۔ حاتم نے بہتیری منت کی کہ مجھے لے چل، میں خوشی سے کہتا ہوں اور ہمیشہ اسی آرزو میں رہتا ہوں کہ میری جان و مال کسی کے کام آئے تو بہتر ہے لیکن وہ بوڑھا کسی طرح حاتم کو لیجانے پر راضی نہ ہوا، آخر ناچار ہوکر حاتم نے کہا کہ اگر تو مجھے نہیں لیجاتا تو میں خود ہی بادشاہ پاس جاکر کہتا ہوں کہ اس بوڑھے نے مجھکو پہاڑ کی کھو میں چھپا رکھا تھا وہ بوڑھا ہنسکر بولا کہ اگر بھلائی کے بدلے برائی ملے تو یا نصیب۔ اس سوال و جواب میں اور آدمی بھی آگئے، انہوں نے معلوم کیا کہ حاتم یہی ہے، حاتم کو ترت پکڑ لیا اور لے چلے، وہ بوڑھا بھی افسوس کرتا ہوا پیچھے پیچھے ہو لیا۔ جب نوفل کے پاس لے گئے تو اُس نے پوچھا کہ ان کو کون پکڑ کر لایا ہے ایک بدذات بولا کہ یہ کام سوائے میرے اور کون کرسکتا ہے؟ یہ فتح ہمارے نام ہے اور ہم نے جھنڈا عرش پر گاڑا ہے، ایک اور لنترانی والا ڈینگ مار کر بولا کہ میں کئی دن سے دوڑ دھوپ کرکے جنگل سے پکڑ لایا ہوں، میری محنت پر نظر کیجیے۔ اسی طرح اشرفیوں کے لالچ سے ہر کوئی کہتا تھا کہ یہ کام مجھ سے ہوا، وہ بوڑھا چپکا کھڑا سب کی شیخیاں سن رہا تھا، اور حاتم کی خاطر کھڑا رو رہا تھا۔ جب اپنی اپنی مردانگی سب بگھار چکے تو حاتم نے کہا کہ سچ بات یہ ہے کہ وہ بوڑھا جو سب سے الگ کھڑا ہے مجھے لایا ہے۔ اگر قیافہ سے جاننا چاہتے ہو تو دریافت کرلو اور میرے پکڑنے جانے کی خاطر جو قول کیا ہے پورا کرو کہ سارے ڈیل میں زبان حلال ہے۔ مرد کو چاہیے کہ جو کہے سو کرے، یوں تو جیبھ حیوان کو بھی خدا نے دی ہے، پھر انسان اور حیوان میں کیا تفاوت ہے؟

نوفل نے اُس بوڑھے کو پاس بُلا کر پوچھا کہ سچ کہہ، اصل کیا ہے؟ حاتم کو کون پکڑ کر لایا ہے؟
اُس نے تمام حال کہہ سُنایا اور کہا حاتم میری خاطر آپ ہی چلا آیا ہے نوفل، حاتم کی یہ ہمت
سُنکر متعجب ہوا کہ بل بے تیری سخاوت، اپنی جان کا خطرہ نہ کیا۔ جتنے لوگ جھوٹے دعوے
حاتم کے پکڑ لانے کے کرتے تھے حکم دیا کہ ان کے پانسو اشرفی کے عوض پانسو جوتیاں انکے
سروں پر لگاؤ کہ ان کا بھیجا نکل پڑے، وہیں تڑ تڑ بیزاریں پڑنے لگیں، ایک دم میں اُنکے
سر گنجے ہو گئے۔ سچ ہے جھوٹ بولنا ایسا ہی گناہ ہے کہ کوئی اسکو نہیں پہنچ سکتا۔ خدا سب کو اس
بلا سے محفوظ رکھے اور جھوٹ بولنے کا چسکا نہ دے۔ بہت لوگ جھوٹا موٹا بکے جاتے ہیں
لیکن آزمائش کے وقت سزا پاتے ہیں۔ غرض اُن سب کو موافق اُن کے انعام دیکر
نوفل نے اپنے دل میں خیال کیا کہ حاتم سے شخص سے فیض پہنچتا ہے اور محتاجوں کی خاطر اپنی
جان تک سے دریغ نہیں کرتا اور خدا کی راہ میں سرتاپا حاضر ہے دشمنی رکھنی اور اُس کا مُدعی
ہونا آدمیت اور انسانیت سے بعید ہے، تواضع اور تعظیم کرکے پاس بٹھایا اور حاتم کا ملک
و املاک اور مال و اسباب جو کچھ ضبط کیا تھا وہیں چھوڑ دیا، نئے سر سے سرداری قبیلۂ طے
کی اُسے دی اور اُس بوڑھے کو پانسو اشرفیاں اپنے خزانہ سے دلوادیں، وہ دعائیں دیتا ہوا
چلا گیا۔

جب یہ ماجرا حاتم کا میں نے سُنا جی میں غیرت آئی اور یہ خیال گزرا کہ حاتم اپنی قوم کا
فقط رئیس تھا جس نے ایک سخاوت کے باعث یہ نام پیدا کیا کہ آجتک مشہور ہے۔ میں خدا
کے حکم سے بادشاہ تمام ایران کا ہوں، اگر اس نعمت سے محروم رہوں تو بڑا افسوس ہے۔ دنیا
میں داد و دہش سے بڑا کوئی کام نہیں۔ اس واسطے کہ آدمی جو کچھ دیتا ہے اسکا عوض عاقبت میں
لیتا ہے، اگر کوئی ایک دانہ بوتا ہے تو اُس سے کتنا کچھ پیدا ہوتا ہے، یہ دل میں ٹھان کر میر عمارت
کو بُلوا کر حکم دیا کہ ایک عالیشان عمارت جس کے چالیس دروازے بلند اور بہت کشادہ ہوں
باہر شہر کے جلد بنوا کر اطلاع دے، تھوڑے عرصہ میں ویسی ہی وسیع عمارت، جیسا کہ دل چاہتا تھا

بنکر تیار ہوئی اور اُس مکان میں ہر روز ہر وقت فجر سے شام تک محتاج اور بیکسوں کو روپیہ اشرفیاں دیتا اور جو کوئی جس چیز کو چاہتا اُسے مالامال کر دیتا۔ غرض چالیسوں دروازوں سے حاجتمند آتے اور جو چاہتے سو لیجاتے، ایک روز کا ذکر ہے کہ ایک فقیر نے سرائے کے دروازہ پر آکر سوال کیا۔ میں نے اُسے ایک اشرفی دی۔ پھر وہی دوسرے دروازہ پر آیا اور دو اشرفیاں مانگیں۔ میں نے پہچانکر درگزر کی اور دیں، اسی طرح اُس نے ہر ایک دروازہ سے آنا اور ایک ایک اشرفی بڑھانا شروع کیا اور میں بھی جان بوجھکر انجان ہوا اور اُسکے سوال کے موافق دیا۔ آخر چالیسویں دروازہ کی راہ سے آکر چالیس اشرفیاں مانگیں، وہ بھی میں نے دلوا دیں، اتنا کچھ لیکر وہ درویش پھر پہلے دروازہ سے گھس آیا اور سوال کیا۔ مجھے بہت بُرا معلوم ہوا اور کہا اے لالچی تو کیسا فقیر ہے کہ فقر کے تینوں حرفوں سے بالکل واقف نہیں، فقیر کا عمل اُن پر چاہیئے۔ فقیر بولا بھلا داتا تمہیں بتاؤ۔ میں نے کہا فؔ سے فاقہ، قؔ سے قناعت، رؔ سے ریاضت نکلتی ہے جس میں یہ باتیں نہیں وہ فقیر نہیں۔ اتنا جو تجھے ملا ہے اس کو کھا پی کر آئیو اور جو مانگے گا لیجائیو یہ خیرات احتیاج رفع کرنے کے لیے ہے نہ جمع کرنے کے لیے۔ اے حریص چالیس دروازوں سے تو نے چالیس اشرفیاں تک لیں اس کا حساب تو کر کہ ریوڑی کے پھیر کی طرح کتنی اشرفیاں ہوئیں اور اس پر بھی حرص تجھے پھر پہلے دروازہ سے لے آئی، اتنا مال جمع کر کے کیا کریگا......

اب حیاء و شرم کر اور صبر و قناعت کو کام فرما...... فقیر میری باتوں کو سُنکر خفا اور بدماغ ہوا اور جتنا مجھ سے لیکر جمع کیا تھا زمین پر ڈال دیا اور بولا بس بابا اتنا گرم مت ہو، اپنی کائنات رکھ چھوڑ اور پھر سخاوت کا نام نہ لیجیو...... سخی کے بھی تین حرف ہیں پہلے اُن پر عمل کرو تب سخی کہلاؤ گے...... سؔ سے سمائی اور خؔ سے خوفِ الٰہی اور یؔ سے یاد رکھنا اپنی موت کو۔"

مولوی شیخ حفیظ الدین احمد دہلوی

آپ دہلی کے رزیڈنٹ کے منشی تھے، بعد میں فورٹ ولیم کالج میں ملازم ہوگئے ۱۸۰۳ء میں آپ نے علامی ابوالفضل کی کتاب عیار دانش کا ترجمہ اُردو میں کیا۔ اور خرد افروز اس کا نام رکھا۔ (سنِ تالیف ۱۸۰۳ء) اصل کتاب سنسکرت میں ہے، اور عربی میں کلیلہ دمنہ کے نام سے مشہور ہے۔ فارسی میں اس کا ترجمہ انوارِ سہیلی کے نام سے شہرت پذیر ہوا ہے جو ملا حسین واعظ نے کیا ہے۔ اُردو کا یہ ترجمہ اب نہیں ملتا شاید فقیر محمد خاں گویا کے ترجمہ کے مقابلہ میں جو اُنھوں نے بستانِ حکمت کے نام سے کیا ہے یہ زیادہ عرصہ تک زندہ نہ رہ سکا۔ ہم نے اس زمانہ کے مصنفین و مؤلفین کی ادنیٰ خدمتِ اُردو بھی نظرِ استحسان سے دیکھی ہے، اور یہی وجہ ہے کہ باوجود قلتِ حالات وعدم موجودگیِ کتب اُن کے نامِ نامی کو زمرۂ مصنفینِ اُردو میں شامل کردیا ہے اور اُن کا ذکرِ خیر کرنا اپنے لیے موجبِ افتخار سمجھا ہے ؂



میر شیر علی افسوس

آپ میر مظفر خاں کے بیٹے تھے جو میر قاسم نواب بنگالہ کے داروغۂ توپ خانہ تھے۔ آپ کا سلسلۂ نسب امام جعفر صادق ؑ تک پہنچتا ہے، میر مظفر خاں کا اصلی وطن نارنول صوبۂ آگرہ تھا مگر چونکہ وہ خود اور اُن کے بھائی سید غلام علی خاں نواب عمدۃ الملک امیر خاں کی رفاقت میں اوقات بسر کرتے رہے اِس لیے دہلی میں توطن اختیار کرلیا تھا، اور میر شیر علی دہلی ہی میں پیدا ہوئے۔ سید غلام علی خان صاحبِ اقتدار تھے اور عارضی طور پر عمدۃ الملک کی وفات کے بعد الٰہ آباد کے صوبہ بھی رہے۔ بھائی کی وفات کے بعد

سید مظفر خاں ترک ملازمت کر کے بارہ برس خانہ نشین رہے۔ انجام کار نواب خان عالم نواب بقار اللہ خاں نے اُنہیں بلا کر نواب شجاع الدولہ کی سرکار میں تین سو روپے کا ملازم کر دیا اُس زمانہ میں میر شیر علی کی عمر گیارہ برس کی تھی۔ اپنے والد کے ہمراہ لکھنؤ پہنچے، وہاں کی صحبتوں نے بچپنے ہی میں شعر کا شوق پیدا کر دیا۔ میر حیدر علی حیراں دہلوی کو اپنا کلام دکھانے لگے، عربی اور علم حکمت کی تحصیل علمانہ تھی۔

آپ کے والد لکھنؤ پہنچ کر کئی برس بعد حسب الطلب نواب میر جعفر خاں مرشد آباد جا کر توپخانہ کی دارو غگی کے منصب جلیلہ پر سرفراز ہوئے چنانچہ جب شجاع الدولہ اور میر قاسم سرکار انگلشیہ کے مقابل صف آرا ہوئے تو یہ بھی اُن کے ہمرکاب تھے۔ میر جعفر کی وفات کے بعد ملازمت ترک کر کے دکن چلے گئے اور وہیں انتقال کیا۔ میر افسوس خود ابتدا میں نواب سالار جنگ اور اُن کے لڑکے نوازش علی خاں کے پاس گیارہ برس تک رہے، پھر مرزا جواں بخت ولیعہد نے جو اُن دنوں میں لکھنؤ رونق افروز تھے کلام سُنکر از راہ قدر دانی طلب فرمایا اور اپنے مصاحبوں میں داخل کر لیا۔ جب صاحب عالم کچھ عرصہ کے بعد دہلی جانے لگے تو یہ ہمراہ نہ جاسکے اور نواب سرفراز الدولہ حسن رضا خاں نائب آصف الدولہ کے پاس چلے آئے۔

چند سال بعد نواب موصوف الصدر نے لارڈ ولزلی گورنر جنرل سے ان کی سفارش کی چنانچہ حسب الارشاد گورنر جنرل کلکتہ گئے اور ڈاکٹر گلکرائسٹ کے ماتحت فورٹ ولیم کے مدرسہ میں اُردو کتابوں کی تصنیف اور تالیف کا سر رشتہ آپ کے سپرد ہوا۔ دو سو روپیہ ماہوار مشاہرہ مقرر ہوا۔ ۱۸۰۹ء میں اس عالم فانی سے عالم جاودانی کو رخصت ہوئے۔ آپ سے دو کتابیں باغِ اُردو جو گلستاں کا ترجمہ ہے اور آرائشِ محفل جس میں ہندوستان کے تاریخی حالات درج ہیں یادگار ہیں۔ آخر الذکر کتاب کا ماخذ سجان رائے کی کتاب خلاصۃ التواریخ ہے۔ ۱۸۰۰ء میں آپ کلکتہ پہنچے تھے اور آپ نے ۱۸۰۲ء میں سعدی کی گلستاں کا ترجمہ کیا تھا۔

آجکل دونوں کتابیں نایاب ہیں۔ راقم نے خواجہ غلام الثقلین مرحوم کے کتب خانہ
میں گلستاں کا ترجمہ (قلمی) دیکھا تھا، افسوس ہے وہ بھی دستیاب نہ ہوا۔ جہاں تک خیال
ہے افسوس نے فارسی اشعار کا ترجمہ بھی اُردو اشعار میں کیا ہے، یہ نایاب اور قابلِ قدر
ترجمہ اگر طبع ہو جائے تو بہت اچھا ہو۔ اتفاق سے خواجہ صاحب نے اپنے رسالہ
عصرِ جدید نومبر ۱۹۰۸ء میں خود اِس کتاب کا ذکر کیا ہے اور اُس کا دیباچہ نقل کیا ہے۔
لہذا عصرِ جدید سے دیباچہ نقل کرتا ہوں اور دیباچے سے پہلے دو حکایتوں کا ترجمہ بھی جو رسالہ
مذکور میں درج ہے بطور نمونہ پیش کرتا ہوں۔

باب دوم (حکایت گلستاں)

یکے از بزرگاں پارسائے را گفت کہ
چہ گوئی در حقِ فلاں عابد کہ دیگراں در
حقِ او بطعنہ سخنہا گفتہ اند۔ گفت
بر ظاہرش عیب نمی بینم و در باطنش
عیب نمی دانم۔ پس بر وے طعنہ چگونہ کنم ؎

ہر کسے را کہ پارسا بینی — پارسا دان و نیک مرد انگار
ور ندانی کہ در نہانش چیست — محتسب را درونِ خانہ چہ کار

ترجمہ شیر علی افسوس

ایک بزرگ نے کسی پرہیزگار سے پوچھا کہ
فلانے عابد کے حق میں آپ کیا کہتے ہیں کہ اکثر
اشخاص اُسکے حق میں طعنہ آمیز باتیں کہتے
ہیں۔ کہا اُس نے کہ بظاہر اسمیں کچھ عیب نہیں
دیکھتا اور باطن سے آگاہ اللہ ہے ؎

جسکو ظاہر میں متقی دیکھے — اُسکے تقویٰ کا تو نہ کر انکار
کھوج مت کر کسیکے باطن کا — محتسب را درونِ خانہ چہ کار

باب دوم (حکایت ہشتم)

بزرگے را در محفلے ہمی ستودند
و در اوصافِ جمیلش مبالغہ
می نمودند۔ سر بر آورد و گفت
من آنم کہ من دانم۔

شعر

(ترجمہ) آٹھویں حکایت

ایک بزرگ کے تئیں کسی مجلس میں اکثر
شخص سراہتے تھے اور اُسکے وصفوں کی خوبی
میں مبالغہ نہایت کرتے تھے اُسنے سر اُٹھایا
اور فرمایا۔ اے عزیزاں میں جیسا کہ ہوں
اپنے تئیں پہچانتا ہوں۔ شعر

كيفيتَ اذىٰ يامَن تعُدُّ محاسني	دیکھ ظاہر مدح کی ہیں تمہار انقص کیا
علیٰ نيتي هذا اولم تدر باطني	حالِ باطن کا مرے مطلق نہیں تم پر کھلا

قطعہ

شخصم بچشم عالمیاں خوب منظر است	ظاہر لگے ہے خوب مرا جسم خلق کو
وز خبثِ باطنم سرِ خجلت نہادہ پیش	باطن ولے نجس جو ہے ہوں اُس سے منفعل
طاؤس را بنقش و نگارے کہ ہست خلق	نقش و نگار مور کے سب ہیں سراہتے
تحسیں کنند و او خجل از پائے زشتِ خویش	زشتی سے اپنے پاؤں کی لیکن وہ ہے خجل

پہلا دیباچہ تعریف میں لاڈ صاحب کی اور احوال مترجم کا اور بعضے عذر و ں میں کتاب کے

نہالِ حمد پہلے اُس میں بو تو
رہے سرسبز جو نت باغِ اُردو
لگا پھر نعت کا اے دوست پودا
کہ تا محشر رہے یہ باغ پھولا
پھر اُس کے بعد نخلِ منقبت کو
لگا رونق جو اُس کی بیشتر ہو

تازگی گلستانِ سخن کی حمد باغبانِ حقیقی کی ہے کہ اُس نے بوستانِ عالم کو طرح طرح کے درختوں سے آرائش دی اور رنگ برنگ کے پھولوں سے زینت بخشی اور اُس کے ابرِ رحمت کی بارش سے ہر ایک گل تر و تازہ ، نسیم فیض سے اُسکے ہر ایک درخت ہرا بھرا ہر گل کی زبان وا ہے اُسکے ذکر میں ، جو غنچہ ہے سر بجیب ہے اُسی کے فکر میں ، قمری اُسی کے طوقِ بندگی میں اسیر ، تدرو اُسی کے بندِ عشق سے پا بہ زنجیر ، شربتِ شوق نے اُسی کے گلہائے چمن سیراب گلستاں ہیں ، اور اُسی کی گرمیِ محبت سے ہر ایک خارِ خشک لب سہے بیاباں ہیں ، فاختہ خاکستری لباس سے اُسکی طلب میں کوکو کناں ، چنار اُسی کے سوزِ عشق سے گلشنِ دہر میں سوزاں ؎

جو ابرِ کرم اُس کا برسے ذرا
تو ہر خارِ صحرا ہو گلبرگ سا

....

....

....

بعد اس حمد و نعت کے عاصی شیر علی ابن سید علی مظفر خاں بن میر غلام مصطفیٰ مرحوم و مغفور متخلص بہ افسوس کہتا ہے۔ اصل اس حقیر کی ملک ِ قافنا ہے اور قوم سادات لیکن آبا و اجداد جو ہندوستان میں آئے اور توطن اُنہوں نے اپنا قصبۂ نارنول میں کیا اس سبب نارنولی مشہور ہوئے مگر جد و پدر اُسکے عہد میں بادشاہ محمد شاہ فردوس آرامگاہ کی شاہجہاں آباد میں وارد ہوئے اور رفاقت نواب عمدۃ الملک امیر خاں جنت مکاں کی اختیار کی۔ چنانچہ کمال ثروت اُن کو اُس سرکار میں ہوئی۔ تب اُنہوں نے استقامت اور سکونت شہر مذکور میں کی اور اُس کا مولد نیا شہر ہے۔ بعد برہم ہونے سلطنت کے اور وفات نواب صاحب مغفور کے، ایک مدت مدید والد مرحوم خانہ نشین رہے۔ آخر دلی چھوڑا اور روزگار بنگالے کے صوبہ داروں کا کیا، اُن میں فقیر کا سن گیارہ برس کا تھا گلستاں پڑھتا تھا اور سیر دیوانِ ولی کی اکثر کرتا، طبیعت موزوں اُن ایام میں بھی تھی چنانچہ کئی شعر اوقات مذکور رہ میں بوضع قدما کہے تھے، یہ مطلع بھی اُنہی میں سے ہے۔ بیت

ارے پیارے ترے اُس حُسنِ رنگیں کا خدا حافظ

تری اس زُلفِ پرپیچ کا محمد مصطفےٰ حافظ

قصّہ کوتاہ والد ماجد نواب جعفر علی خاں بہادر مرحوم کے واقعہ تک بھی عظیم آباد میں تھے۔ بعد اس سانحے کے لکھنؤ میں آئے اور حقیر اُن سے دو برس پہلے یہاں آچکا تھا۔ آخر وہ تو حیدر آباد تشریف لے گئے اور بعد چند روز کے وہیں بقضائے الٰہی بہشت نصیب ہوئے لیکن میں نے بود و باش اپنی یہیں ٹھہرائی اور ابتدائے جوانی سے سرکار میں نواب سالار جنگ بہادر مرحوم کے پرورش پائی ملکہ جب تک مرشد زادۂ آفاق صاحب عالم جہاندار شاہ جنت

آرامگاہ رونق افزائے لکھنؤ کے رہے اُسی سرکار میں بعہدۂ مصاحبت سرفراز تھا۔ اُن دنوں بھی فکرِ سخن تھی لیکن تحصیلِ عربیہ میں نہایت مصروف تھا۔ مشقِ سخن اس خام طبع کی اہلِ سخن کے نزدیک پختگی کو پہنچ چکی تھی اور دیوان بھی قریب ہو چکا تھا، چنانچہ کلام اس ہیچمدان کا مرشد زادۂ آفاق کو نہایت پسند آیا اور خواصانِ حضور میں بعہدۂ شاعری سرفراز فرمایا بسبب اُن کی قدردانی کے پھر بسا اوقات بندہ فکرِ سخن ہی میں رہتا تھا۔ غرض جب اُنھوں نے رحلت فرمائی تب میں نے شعر و سخن ترک کیا بلکہ مشاعرے کی صحبت میں آنا جانا بھی چھوڑ دیا مگر درس و تدریس سے سروکار تھا اور سب کاموں سے بیکار۔ خرچ روزمرہ نواب سرفراز الدولہ حسن رضا خاں بہادر کی بدولت جو کچھ کہ مقدور تھا پہنچے جاتا تھا اور تکلیف نوکری کی کچھ نہ تھی۔ غرض اُس بزرگ کے اخلاق اور خوبیوں کے بیان سے زبان قاصر ہے۔ خدا اُسکو جزائے خیر دیوے اور جنت الماوٰی میں درجۂ اعلیٰ عطا کرے کہ ستائیسویں تاریخ روز جمعہ کہ وہی سترھویں ماہ اکتوبر کی تھی سن ہجری بارہ سے پندرہ ۱۲۱۵ تھی اور ۱۸۰۰ء کہ صاحب جلیل القدر کرنل اسکاٹ بہادر نے مجھے بلوا بھیجا اور کلام میرا سنا۔ پھر الطاف نوازش سے فرمایا کہ تو سرکار کمپنی دام دولتہم کے ملازموں میں اسی تاریخ سے سرفراز ہوا۔ بدل جمعی عام کلکتہ کو روانہ ہو کہ صاحب عالی شان دام ظلہم زبان اُردو کا محاورہ اور صحت دریافت کیا چاہتے ہیں۔ بنا بر اس کے تجھے طلب کیا ہے۔ یہ ہیچمدان اگرچہ لیاقت موافق اساتذۂ سابق کے نہ رکھتا تھا اور اس فن سے بھی دل برداشتہ تھا، قدردان جو اُس بزرگ کو دیکھا اور صاحبوں کو جوہر شناس سمجھا۔ فی الواقع قدردانِ اہلِ فن اور عزت بخش صاحبانِ سخن ان سے بہتر کوئی نہیں اور ان کی سرکار مجمع علماء و طلباء ہے عازم اُس ملک کا ہوا اور آب و دانہ یہاں لے آیا۔ غرض صاحبانِ ذوی الاحترام کی قدردانی جیسی سنی تھی اُس سے دوچند دیکھی۔ واقعی بلکہ میں انھی کے سبب اس ہیچمدان کی اس قدر عزت ہوئی اور اُس کے کلام نے اس قدر رونق پکڑی ورنہ یہ کس قطار میں اور اس کا کلام کس شمار میں لیکن تعلق میرا جو مدرسۂ ہندی سے ہوا، بنا بر اس کے بسا اوقات خدمت میں صاحب عالی

طبیعت والافطنت مدرس ہنری مسٹر جان گلکرائسٹ صاحب دام ثروتہ کے کہ جامع قوانین اس زبان کے ہیں حاضر ہونے لگا۔ ایک دن صاحب موصوف نے مہربانی سے فرمایا کہ گلستان سعدی شیرازی کا زبانِ اردو میں ترجمہ کریں میں نے دھیان کیا کہ عبارت اُس کی بظاہر صاف و بباطن پیچدار ہے۔ علاوہ اس کے عبارت کا اختلاف بے شمار ہے اور رتبہ اپنی قوتِ تالیف کا اور شیخ مرحوم کی تصنیف کا جو خیال کیا تو کسی طرح کی نسبت نہ پائی۔ مصرع

چہ نسبت خاک را با عالمِ پاک

ارادہ کیا کہ اس سے پہلو تہی کروں اور سرِ عجز آگے دھروں۔ پھر دل میں سوچ آیا کہ مبادا خاطرِ خیال میں اُن کے گزرے کہ اس نے ہمارا کہنا نہ مانا اور اس بات کو سہل جانا تب قصد کیا کہ ایک حکایت طولانی کہ نظم و نثر اُس میں کثرت سے ہو اُسے ترجمہ کروں۔ اگر بخوبی سرانجام ہوئی اور اہلِ معانی کی پسند پڑی تو فبہا۔ والا صاحبِ ممدوح سے اس امر کی معافی چاہوں گا چنانچہ قاضی ہمدان کی حکایت کا ترجمہ کیا اور وہ علماء و عقلاء و شعرا کہ یہاں تھے اُن کے پسند پڑا تب اس ضعیف نے کمرِ ہمت بقوت باندھی، درستی بلیغ کی۔ یارے فضلِ ایزدی اور لطفِ سرمدی سے تمام کتاب زبانِ اردو میں لکھی اور وہ مقبولِ خاص و عام ہوئی۔ نام اُس کا باغِ اُردو رکھا۔ چنانچہ اُس کی شروع کی تاریخ بھی اسی میں سے نکلتی ہے۔ قطعہ

کہوں کھول دل جب یا آئینِ نیکو	میں تاریخ اُس کی جو چاہا سے نام
ہے آغازِ اُردی باغِ اُردو	کہ اس میں ہاتفِ غیبی یہ بولا

(تیسری بار سے میں دوسرا مصرع "کہوں دل کھول یا آئینِ نیکو" اور چوتھا مصرع "کہ ہے آغازِ اُردی باغِ اُردو" پڑھنا چاہیے تاکہ ایک بحر میں قطعہ ہو جائے۔ "آغازِ اُردی" سے ۱۲۲۳ھ تاریخ اختتام اور "باغِ اُردو" سے تاریخ آغاز یعنی ۱۲۱۷ھ نکلتی ہے۔ نظامی)

لیکن فی الحقیقت یہ کتاب جب مقبول ہو گی جو حضور میں امیر والا تدبیر، عادلِ بے نظیر پشت پناہ کہتر و مہتر غریب پرور، قدر افزائے علما و شعرا، راحت رسانِ سینہ ریشاں، چارہ سازِ بیچارگان و درویشاں، بانیٔ مدرسۂ علم و فضل، ماحیٔ بنیادِ ظلم و جہل۔

مثنوی

حمایت اگر اُس کی پشہ بھی پائے — تو ہاتھی کو ہرگز نہ خاطر میں لائے

جو ابرِ کرم اُس کا برسائے زر — تو ہر ایک گدا لیوے دامن کو بھر

بیاں کیا کروں دانش و عقل کو — فلاطون بھی اُس سے تعلیم ہو

سخاوت شجاعت کرامت کرم — عیاں اُن میں ہیں سب بوجہ اتم

زبدۂ نوئیان عالی شان، مشیر خاص شاہ کیواں بارگاہ انگلستان مارکوئس ولزلی گورنر جنرل بہادر دام اقبالہٗ کے قبول ہوئی۔ بیت

پسند آئی اُس کو جو اس کی بہار — رہے تازگی اُسکی لیل و نہار

اگرچہ اس باغ کے گل اور پھول بے مقدار ہیں اور کمتر از خار لیکن توقع اُس ابرِ کرم سے یہ ہے کہ متوجہ اس پر ہووے اور اپنے تفضلات کی بارش سے شاداب کرے کہ مینہ ہر جگہ برستا ہے گل و خار اُس کے فیض سے کوئی محروم نہیں رہتا۔ شعر

کرم سے ہوں تیرے یہ امیدوار — نظر مہر کی اُس پہ ہو ایک بار

یہ کئی سطریں عذروں میں ہیں۔ اربابِ فطنت و صاحبانِ طبیعت پر ظاہر ہووے کہ فقیر نے اُس کی نظم و نثر کا مطلب مع عربی موافق اپنے مقدور کے نہیں چھوڑا مگر زیادہ کمی کہیں کہیں ہے اور حسن نظم و نثر میں اختلافِ نسخ دیکھا ہے یا اختلافِ معانی، بعضے جا تو ہر ایک کا ترجمہ کیا ہے اور بعضے مقام میں جس کی ترجیح اپنے نزدیک ٹھہری ہے اُس کا کیا ہے اور مرجوع کو ترک کسی مقام میں ہو بہو کرنے میں آیا ہے کہ محاورے سے اندک تفاوت ہو گیا ہے، پر اکثر رعایت محاورے ہی کی منظور رہی ہے بسبب اس کا اہلِ سخن اور صاحبانِ فہم پر اندک تامل میں کھل جائے اور چند موضع میں لفظ تو کہ فارسی ہے یا یائے خطاب جیسے گفتی سفتی میں ہے معروف کیا گیا۔ اگرچہ صاحبانِ اردو گفتگو میں بیچ اوّل موضعوں کے اُسکو نہیں بولتے بلکہ تعظیماً لفظ استعمال کرتے ہیں۔ بنا بر اسکے کہ کتاب اور اشعار میں ہے، چنانچہ اکثر کلام شعرا کا قصائد

مدت میں اسی پر شاہد ہے۔ یہ ہیچمدان نہیں کہتا کہ کلام میں میرے کہیں غلطی نہیں ہے یا کوئی
اس کتاب کے مطالب ریختے کی زبان میں بیان نہ کرسکے گا۔ لاکن اتنا البتہ کہ یہ خالی مطالب
سے نہیں ہے اور جو کوئی ایسا ارادہ کرے گا تو قدر اس بے مقدار کی جانے گا۔ اب امید
اہل نظر سے یہ ہے اگر کہیں کہیں قبائح اس میں دیکھیں تو اُن کو دامن کرم سے چھپا دیں
اور زبان پر نہ لاویں کہ انسان کا کلام ممکن نہیں جو بے عیب ہو۔ بخصوص مجھ سے ناقص
کا کہ اپنے کمال کو بھی نقصان جانتا ہوں اور جس کا معقول ہو مانتا ہوں۔ غرض دشمنوں
کی آنکھوں میں یہ خار ہے اور دوستوں کی نظروں میں گلزار۔

مثنوی

رہے گا سدا گل میں یہ بوستاں ۔۔۔ ثبات اپنا لیکن ہمیشہ کہاں
بقا نقش کا غذ کو ہے سالہا ۔۔۔ اور انساں کے نقشہ کو ہر دم فنا
مصنف مؤلف کو کب ہے قیام ۔۔۔ نشاں اُن کا رہتا ہے بس اک کلام
یہ ہے طالبوں سے مجھے التجا ۔۔۔ کریں میرے حق میں وہ اتنی دعا
بعشرت کروں باغ دنیا کی سیر ۔۔۔ ہو آخر مری عاقبت بھی بخیر
شکر ہے لاانتہا اللہ کا ۔۔۔ ختم کس خوبی سے دیباچہ ہوا"



سید انشاء اللہ خاں انشاؔ

حسب و نسب اور پیدائش

سید انشاء اللہ خاں حکیم ماشاء اللہ خاں کے بیٹے تھے۔ ان کے بزرگ ہندوستان میں نجف اشرف سے آئے تھے اور بعض کہتے ہیں کہ خطۂ کشمیر کے سادات صحیح النسب سے ہیں۔ وہاں کسی زمانہ میں سمرقند سے آئے تھے۔ پھر دلی میں آکر سکونت اختیار کی۔ رفتہ رفتہ امرائے شاہی میں داخل ہوئے اور بعض اُن میں طبیب

نقارہ سے بلند آوازہ ہوئے۔ میر ماشاء اللہ خاں دربار شاہی میں طبیب تھے اور زمرۂ امرا میں داخل تھے۔ ان کے خاندان کی خوبیوں اور گھر کے چال چلن کو دلی اور لکھنؤ کے شرفا سب مانتے تھے سلطنت مغلیہ کے ضعف کی وجہ سے میر ماشاء اللہ خاں کو مرشد آباد جانا پڑا۔ وہاں بھی اعزاز و اکرام سے رہے اور سید انشا وہیں پیدا ہوئے۔

تعلیم اور شاعری

جس طرح اگلے وقتوں میں خاندانی امیرزادوں کی تعلیم ہوتی تھی اسی طرح سید انشا کو بھی علوم مروجہ سے ماہر کیا گیا۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ سید انشا نہایت طباع اور عالی دماغ آدمی تھے۔ ان کی طبیعت ایک ہیولی تھی کہ ہر قسم کی صورت پکڑ سکتی تھی۔ باوجود اسکے شوخی[1] اس قدر کہ سیماب کی طرح ایک جا قرار نہ تھا۔ حالانکہ طبابت پیشۂ آبائی تھا اُسے چھوڑ کر شاعری کی طرف توجہ کی اور مرشد آباد سے دلی میں آئے۔ اس وقت دلی کا دربار ایک ٹوٹی پھوٹی درگاہ اور اسکے سجادہ نشیں شاہ عالم بادشاہ تھے۔ سید انشا اہل دربار میں داخل ہوئے اور یہ عالم ہوا کہ شاہ عالم کو ایک دم ان کی جدائی ناگوار ہوگئی۔ کچھ عرصہ تک بادشاہ کی خدمت میں حاضر رہے، آخر دلی سے دل اُچاٹ ہوا اور آصف الدولہ کی سخاوتوں نے اُنہیں لکھنؤ کھینچ بلایا۔ جاتے ہی علم و فضل کے زور اور کمال کے شور سے وہ نقارے بجا دیے کہ تمام مشاعرے گونج اُٹھے۔ چندے مرزا سلیمان شکوہ کی خدمت میں رہے جو شاہ عالم کے بیٹے تھے اور لکھنؤ میں رہتے تھے۔ آخر علامہ تفضل حسین خاں کی وساطت سے نواب سعادت علی خاں کے مصاحب خاص ہو گئے جو اُس وقت اَوَدھ کے مختارِ کل تھے۔ یہاں بھی ملازمت ہوتے ہی سید انشا ایسے شیر و شکر ہو گئے کہ پھر نواب کو اُن کے سوا کسی کی بات میں مزا ہی نہ آتا تھا۔ سید انشا کے سپرد کوئی خاص خدمت نہ تھی۔ مگر درباروداری کے ساتھ ہر دم کی مصاحبت تھی۔ اس زمانہ میں انہوں نے عامۂ خلائق خصوصاً

[1] لڑکپن میں طالبعلمی کرتے تھے مگر ساتھ ہی گانے کا بھی شوق تھا۔ کافیہ حفظ کرتے تھے اور ستار پر بجاتے تھے کہ الکلمۃ لفظ کلمۃ لفظ۔ وضع لمعنی مفردًا دِر دِ مفردًا دِر دِ۔ یہ حالات آبحیات سے ماخوذ ہیں۔

اہلِ کمال اور اہلِ خاندان کی کاربرآری سے نیکی اور نیکنامی کی دولت کمائی۔ ہزاروں
کو مراتبِ اعلیٰ پر پہنچا دیا مگر آپ شاعری رہے، آخر اسی مصاحبت سے ہنسی ہنسی میں مخالفت
پیدا ہوگئی جس کا انجام یہ ہوا کہ وہ چہکتا ہوا بلبل اپنے گھر کے پنجرے میں بند کیا گیا اور وہاں سے
اس گمنامی کے ساتھ پیوندِ زمین ہوا کہ کسی کو خبر نہ ہوئی۔ بسنت سنگھ نشاط کی تاریخ سے معلوم ہوتا
ہے کہ ۱۲۳۳ھ میں فوت ہوئے۔

خبرِ انتقالِ میر انشا — دلِ غمدیدہ تا نشاط شگفت
سالِ تاریخ او زجانِ اجل — عرفی وقت بود انشا گفت

۱۲۳۰ + ۳ = ۱۲۳۳ھ

تصانیف تصانیف جو سید انشا سے یادگار ہیں حسبِ ذیل ہیں:-

(۱) کلیاتِ انشا جس میں کلامِ ذیل شامل ہے:- (۱) اُردو کا دیوان (۲) دیوانِ ریختی (۳) قصائد (جس میں ایک قصیدہ منقبت بے نقط و اشعارِ ترکی وغیرہ بھی درج ہیں) (۴) دیوانِ فارسی (۵) مثنوی شیر برنج فارسی (۶) مثنوی بے نقط (لوحِ سرخی بھی بے نقط و موزوں) (۷) مثنوی شکار نامہ (۸) مثنویات در ہجو زنبور، کھٹمل، پشہ، مگس (۹) مثنوی شکایتِ زمانہ (۱۰) مثنوی فیل (۱۱) مثنوی در ہجو گیانچند ساہوکار (۱۲) اشعار متفرقہ و رباعیات و قطعات و تاریخہائے متفرقہ (۱۳) چیستانیں اور پہیلیاں مخمس وغیرہ (۱۴) دیوانِ اُردو بے نقط مع رباعیات و نثر بے نقط (۱۵) شرح مائۃ عامل نظم فارسی (۱۶) مثنوی مرغ نامہ۔

(۲) ایک داستان جو نثرِ اُردو میں ایسی لکھی ہے کہ ایک نقطہ بھی عربی فارسی کا نہیں آنے دیا باوجود اس کے اُردو کے رتبہ سے کلام نہیں گرا۔ ہاں وہی چہچہے اور وہی چہلیں اس میں بھی چلی جاتی ہیں جو اُن کے کلام کا خاصہ ہے حقیقتاً ظرافت اُن کی طبیعت ثانیہ ہوگئی ہے۔ یہ کتاب مقدار میں پچاس صفحہ کی ہوگی۔ عبارتِ ذیل نمونہ کے طور پر درج کی جاتی ہے:-

"اب یہاں سے کہنے والا یوں کہتا ہے۔ ایک دن بیٹھے بیٹھے یہ بات اپنے دھیان چڑھی

کوئی کہانی ایسی کہیے، جس میں ہندی چھٹ اور کسی بولی کی پُٹ نہ ملے ۔ باہر کی بولی اور گنواری کچھ اُس کے بیچ میں نہ ہو۔ تب میرا جی پھول کر کلی کے روپ کھلے۔ اپنے ملنے والوں میں سے ایک کوئی بڑے پڑھے لکھے، پرانے دھرانے ٹھاگ بڑے ڈھاگ یہ کھٹراگ لائے۔ سر ہلا کر، منہ تھتا کر، ناک بھوں چڑھا کر، گلا پھلا کر، لال لال آنکھیں پتھرا کر کہنے لگے "یہ بات ہوتی دکھائی نہیں دیتی، ہندوی پن بھی نہ نکلے اور بھاکا پن بھی نہ ٹھس جائے۔ جیسے بھلے مانس اچھوں سے اچھے لوگ آپس میں بولتے چالتے ہیں، جوں کا توں وہی سب ڈول رہے اور چھاؤں کسی کی نہ پڑے یہ نہیں ہونے کا" میں نے اُن کی ٹھنڈی سانس کی پھانس کا ٹہوکا کھا کر جھنجھلا کر کہا میں کچھ ایسا بڑ بولا نہیں جو رائی کو پربت کر دکھاؤں اور جھوٹ سچ بول کر انگلیاں نچاؤں اور بے سری بے ٹھکانے کی الجھی سلجھی تانیں لیے جاؤں۔ مجھ سے نہ ہو سکتا تو بھلا منہ سے کیوں نکالتا جس ڈھب سے ہوتا اس بکھیڑے کو ٹالتا۔ اب اس کہانی کا کہنے والا یہاں آپ کو جتاتا ہے۔ اور جیسا کچھ اُسے لوگ پکارتے ہیں کہہ سناتا ہے، اپنا ہاتھ منہ پر پھیر کر موچھوں کو تاؤ دیتا ہوں اور آپ کو جتاتا ہوں، جو میرے داتا نے چاہا تو وہ تاؤ بھاؤ اور راؤ چاؤ اور کود پھاند اور لپٹ جھپٹ دکھاؤں آپ کے دھیان کا گھوڑا جو بجلی سے بھی بہت چنچل اچپلاہٹ میں ہے دیکھتے ہی ہرن کے روپ اپنی چوکڑی بھول جائے۔ ٹک گھوڑے پر اپنے چڑھ کے آتا ہوں میں

کرتب جو جو ہیں سب دکھاتا ہوں میں	گھوڑے پر اپنے چڑھ کے آتا ہوں میں
کہتا جو کچھ ہوں کر دکھاتا ہوں میں"	اُس چاہنے والے نے جو چاہا تو ابھی

عبارت متذکرۂ بالا سے سید انشا کا کمال ظاہر ہے، آج کوئی شخص ایسا ایک صفحہ بھی نہیں لکھ سکتا۔ اور سید انشا نے جب قلم اُٹھایا تو اُس زمانے میں تمام عادات و اطوار اور زبان پر فارسی احاطہ کیے ہوئے تھی، دفتری زبان فارسی تھی، خط و کتابت فارسی میں ہوتی تھی، طلبا فارسی پڑھتے تھے، اُردو نثر کا تو کوئی نام بھی نہ لیتا تھا۔

(۳) دریائے لطافت۔ اِس میں اُردو صرف و نحو، منطق، عروض و قافیہ، معانی و بیان

وغیرہ کا ذکر ہے۔ پہلا حصّہ یعنی اُردو صرف و نحو تو سید انشاء اللہ کی تصنیف ہے اور دوسرا حصّہ یعنی منطق، عروض و قافیہ و معانی و بیان مرزا محمد حسن قتیل کا تالیف کیا ہوا ہے۔ کتاب کی جان پہلا ہی حصّہ ہے۔ یہ پہلی کتاب ہے جو ایک ہندی اہلِ زبان نے اُردو صرف و نحو پر لکھی ہے اور حق یہ ہے کہ عجیب جامع و بے مثل کتاب ہے۔ بقول مولوی عبدالحق "جو لوگ اُردو زبان کا محققانہ مطالعہ کرنا چاہتے ہیں یا اُسکی صرف و نحو یا لغت پر کوئی محققانہ تالیف کرنا چاہتے ہیں اُن کے لیے اس کا مطالعہ ضروری ہی نہیں بلکہ ناگزیر ہے"۔

سید انشا نے عربی فارسی زبان کا تتبع چھوڑ کر اُردو زبان کی ہیئت و اصلیت پر غور کیا اور اُس کے قواعد وضع کیے۔ اگرچہ اپنے اظہارِ خیال کے لیے فارسی کا ذریعہ اختیار کیا ہے لیکن یہ تصنیف بوجہ اصل مضمون فارسی نہیں کہلائی جا سکتی۔ سید انشا نے یہ کتاب لکھکر اُردو زبان پر بہت بڑا احسان کیا ہے اور جبکہ اُنکے زمانے میں اُن کے ہم عصر فضول قصّہ کہانیوں کی تصنیف میں مشغول تھے۔ سید صاحب کا ایک کام کی بات پر قلم اُٹھانا اور بھی قابلِ شکریہ اور لائق فخر ہے۔

الفاظ کی فصاحت و غیر فصاحت پر سید انشا کی رائے

سید انشا کے اعلیٰ دماغ اور ذوقِ زبان کا صحیح اندازہ اُن کی اُس رائے سے ہوتا ہے جو اُنھوں نے الفاظ کی فصاحت و غیر فصاحت اور صحت و غیر صحت کے متعلق حسبِ ذیل الفاظ میں ظاہر کی ہے:۔

"ہر لفظ جو اُردو میں مشہور ہو گیا، عربی ہو یا فارسی، ترکی ہو یا سریانی، پنجابی ہو یا پوربی ازروئے اصل غلط ہو یا صحیح وہ لفظ اُردو کا لفظ ہے۔ اگر اصل کے موافق مستعمل ہے تو بھی صحیح ہے اور اگر خلافِ اصل مستعمل ہے تو بھی صحیح ہے، اُسکی صحت و غلطی اُردو کے استعمال پر موقوف ہے، کیونکہ جو کچھ خلافِ اُردو ہے غلط ہے، گو اصل میں وہ صحیح ہو اور جو کچھ موافقِ اُردو ہے صحیح ہے، گو اصل میں صحت نہ رکھتا ہو"۔

مثال کے طور پر سید موصوف نے بہت سے عربی الفاظ کو جو اُردو میں کچھ کے کچھ ہو گئے ہیں صحیح

بتلایا ہے ۔ مثلاً برقا اُردو کا صحیح لفظ ہے اگرچہ خلاف اصل ہے یا قدر اگرچہ اصل میں بسکون دال ہے لیکن بفتح دال اُردو کا صحیح لفظ ہے۔

دریائے لطافت کے پہلے باب میں حروفِ ابجد کا ذکر ہے اور اُن کی تعداد کے تعین میں بھی سید انشا نے جدت طرازی کی ہے ۔ اس تقسیم کے بعد انہوں نے اُن حروف کو لیا ہے جو کسی خاص حرف سے ملکر ایک آواز پیدا کرتے ہیں مثلاً سترہ حروف ایسے ہیں جو ہ کے ساتھ ملکر ایک آواز پیدا کر دیتے ہیں جیسے بھاگنا، پھنسا وغیرہ ۔ یہ حروف اب کہیں اُردو قاعدوں میں بڑھائے گئے ہیں حالانکہ سید انشا مدتوں پہلے لکھ چکے ہیں۔

سترہ حروف ایسے ظاہر کیے ہیں جو نون کے ساتھ ملکر ایک آواز پیدا کرتے ہیں، مثلاً پنڈول، رنگیلا، ہنسنا وغیرہ ۔ اب تک ان حروف کو اُردو قاعدوں میں نہیں دکھلایا گیا اسی طرح بعض حروف ایسے ہیں جو ی کے ساتھ ملکر ایک ہو جاتے ہیں مثلاً کیا (حرفِ استفہام) دھیان، پیارا وغیرہ ۔ القصہ سید انشا نے اُردو حروفِ تہجی کی کل تعداد پچاسی بتائی ہے۔

دوسرے باب میں دہلی کے محلوں کی زبان کے متعلق بہت دلچسپ بحث کی ہے اور یہ دکھلایا ہے کہ کس کس محلہ کی زبان فصیح اور کس کس محلہ کی زبان غیر فصیح ہے اور اُنکی وجوہات بھی دی ہیں ۔ مثلاً مغلوں (اہل مغلپورہ) سادات بارہہ، پنجابیوں، پُربیوں کی زبان کیسی ہے اور اُن کی وجہ سے الفاظ کے تلفظ اور لہجہ اور زبان میں کیا فرق پیدا ہوا ہے، یہ سب امور تفصیل اور مثالوں کے ساتھ بیان کیے گئے ہیں۔

تیسرے باب میں بعض فصحا کا ذکر ہے، اور بعض ایسے الفاظ کا بیان کیا گیا ہے جو اُردو نہیں یا متروک ہیں اور میر تقی یا مرزا رفیع السودا نے اُن کو استعمال کیا ہے ۔ اسی باب میں نواب عماد الملک، بھاڑ امل، مرزا صدر الدین صفاہانی اور ملا عبد الفرقان کی نہایت دلچسپ تقریریں ہیں اور بی نورن اور میر غفر غینی کی تقریریں خصوصاً نہایت پر لطف ہیں ۔ اپنی شوخی مزاج کو

نہایت عمدہ پیرایہ میں ظاہر کیا ہے۔ میر غفر غینی کی نسبت لکھا ہے کہ وہ لام اور رے کی
بجائے غین بولتے تھے۔ نمونہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے:۔

اجی بی نوغن یہ بات کیا فغماتی ہو تم تو اپنے جیوغے کی چین ہو یغ کیا کہیں جب سے
دغی چھوٹی ہے کچھ جی افسغدہ ہو گیا ہے۔

صاف اُردو میں یہ عبارت اس طرح پڑھی جائیگی:۔ اجی بی نورن! یہ بات کیا فرماتی ہو تم تو
اپنے جیوڑے کی چین ہو پر کیا کہیں جب سے دلی چھوٹی ہے کچھ جی افسردہ ہو گیا ہے۔

یہ تقریریں ایسی پاک صاف شستہ زبان میں ہیں کہ حیرت ہوتی ہے۔ سید انشا نے
کیسی فصاحت کے قالب میں ان کو ڈھالا ہے، سودا کا آخری زمانہ تھا اور سید انشا کا
عنفوانِ شباب تھا کچھ بہت فرق نہ تھا، تاہم مرزا کے دیوان کا دیباچہ اُس زبان میں ہے
جو آجکل سمجھنی دشوار ہے اور سید انشا کے کمال کی یہ ادنیٰ صنعت ہے کہ یہ تقریریں ایسی فصیح
اور روزمرہ اُردو میں لکھی ہیں کہ آج بھی ان خیالات کو اس سے بہتر اُردو کا جامہ نہیں پہنایا
جا سکتا۔

باب چہارم میں مصطلحاتِ دہلی اور باب پنجم میں مصطلحاتِ زنانِ دہلی کا ذکر ہے
یہ دونوں باب محققینِ زبان و مؤلفینِ لغت کے لیے نہایت مفید اور کار آمد ہیں۔ اسکے
بعد اُردو صرف و نحو سے بحث کی ہے۔

بہر حال یہ کتاب لکھکر سید انشا ء اللہ خاں نے اُردو زبان پر جیسا کہ ہم پیشتر کہہ چکے ہیں
بہت بڑا احسان کیا ہے، اور جب تک اُردو زبان زندہ ہے اس کے مطالعہ اور اس سے استفادہ
اور سند لینے کی ضرورت باقی رہیگی۔

اب ہم نواب عماد الملک، بھاڑا مل، اور بی نورن اور میر غفر غینی کی پوری تقریریں
نقل کرتے ہیں تاکہ ناظرین ہماری رائے پر استصواب و عدم استصواب کا فتوے صادر
کر سکیں۔

سوال از طرف نواب عماد الملک

اجی لالہ بھاڑا مل! تمہارے احوال پر باللہ کہ ہم سخت متاسف ہوتے ہیں کہ حق تعالیٰ نے اپنی عنایات سے تمہیں میاتِ الوف کا مالک کیا اور اوقات تمہاری یہ کہ احدمن الناس جس مسلمان کو فرض کیجیے اُسکے برابر ذائقہ صاحب کا لذت آشنا نہیں۔ بڑا تعجب ہے کہ آدمی باوصف تیسر نعمائے الٰہی سے محروم رہے اور نام اُس کا رحم اور شفقت رکھے۔ ہم لوگ بھی تو اپنے ہاتھ سے بکری سوائے عید قرباں کے حلال نہیں کرتے اور یہی اشخاص صاف کرکے گوشت بڑے آدمیوں کے مطابخ میں پہنچاتے ہیں اور بازار میں بیچتے ہیں۔ اگر تم بازار سے لیکر کھاؤ تو کیا مانع ہے؟

جواب از طرف بھاڑا مل

ہہیں پیر و مرشد! ہمارے دھرم ماتہیں جیو کا مارن بڑا دو کہہ ہے۔ ہور کھاؤنا تو ہو بھی بڑا، ہور نکھا تہاری کی بات ہے تم کھاوند لوگ ہو۔ ہمارے تو جو کوئی چونٹی بھی بھولے سے مار گیرہے تو اُسیکے ہاتھ کا پانی پیونڑا گجب ہے۔ ہماڑے بڑے تاؤ سیلرام جی تھے۔ اونڑنے بھولے بسرے تے نکھا کھنکھجوری وہی کے باپ پر ہیر رکھ دیا تھا سو وہی کا باپ مر گیا۔ سو باباجی نے دیکھکر فرمایا پنوتی کے نکھا یو وکی کیا۔ اب دس ہجار روپئے کس کے گھرتے کاڈھوں جو اُس کا دوکھہ اُتاروں۔ ہور پمیشر نے ہماری کھاونڑ پیونڑ واسطے بھی ڈھیر چیجاں پیدا کری ہیں، تو من بھوگ لوچی، کچوری، انرتی، میٹھے سُہال، کچنال، برے، سنبوسے، پراگڑی، کھرے، بالوساہی، گندورڑے، دھوئی مونگ کی دال، دھوئی دھوئی اُرد کی دال، ہور ڈھیر سے ترکاریاں، ہور اچار، ہور مگد کا لڈو، ہور گوند کے پاپڑ جو ہجوری بھی نوس بھر ما دیں تو پھیر نکھا نوس تنڑکی کو بھی بھول جاویں ملکوں بھولے بسرے بھی کھاؤنے میں نہ آوے۔

صاف اُردو میں عبارت متذکرہ بالا کو اس طرح پڑھ سکتے ہیں:-

ہاں ہاں! پیر و مرشد! ہمارے دھرم میں نہیں جیو کا مارنا بڑا دکھ ہے یعنی گناہ ہے۔

اور کھاتا تو اور بھی بُرا۔ اور کہا (میں نے کہا) تمہاری کیا بات ہے تم خاوند لوگ ہو۔ ہمارے تو
جو کوئی چوہی بھی بھولے بسرے مار دیتا ہے تو اُسکے ہاتھ کا پانی پینا غضب ہی۔ ہمارے بڑے
تاؤ سیلرام جی تھے۔ اُنھوں نے بھولے بسرے سے کہا کھنکھجورے پر پیر رکھ دیا تھا سو
کھنکھجورا مر گیا۔ سو باباجی نے دیکھکر فرمایا پتوتی کے (جس کے اولاد ہو یعنی اسے دشمن عقل تو
جلد مارا جائیگا اور تیری ماں بے اولاد ہو جائیگی) کہا یہ کیا کیا؟ اب دس ہزار روپے کس کے
گھر سے نکالوں جو اُس کا گناہ (عذاب) اُتاروں۔ اور پرمیشر نے ہمارے کھانے پینے کیواسطے
بھی بہت چیزیں پیدا کی ہیں، سوہن بھوگ، لوچئی، کچوری، امرتی، میٹھے سُہال، کچنال، پیرے،
سنبوسے، پراگڑی، خرمے، بالوشاہی، گندوڑے، دھوئی مونگ کی دال، دھوئی دھوئی اُڑد
کی دال، اور بہت سی ترکاریاں، اور اچار، اور مگد کا لڈو، اور گوندکے پاپڑ جو حضور بھی نوش
فرماویں تو پھر کہا منش و تنکی کو بھی بھول جاویں بلکہ بھولے بسرے بھی کھانے میں نہ آوے۔
بی نورن جو کہ چہلاتی بیگم کی کسبی ہے اور میر غفر غینی وبائی میں جو دلّی سے لکھنؤ چلے آئے
ہیں اس طرح گفتگو شروع ہوتی ہے:۔

بی نورن کہتی ہیں:۔

"اجی آؤ میر صاحب! تم تو عید کے چاند ہو گئے۔ دلّی میں آتے تھے، دو دو پہر
رات تک بیٹھتے تھے اور ریختے پڑھتے تھے۔ لکھنؤ میں تمہیں کیا ہو گیا کہ کہیں تمہارا اثر آثار
معلوم نہ ہوا۔ ایسا نہ کیجو کہیں آٹھوں[1] میں بھی نہ چلو، تمہیں علی کی قسم آٹھوں میں ضرور چلیو"

میر صاحب (جو اُس زمانہ کے ایک خوش طبع رنگین مزاج شخص تھے کوئی ثقہ، متقی
پرہیزگار نہ تھے) جواب میں فرماتے ہیں:۔

"اجی بی نورن! یہ کیا بات فرماتی ہو۔ تم تو اپنے جوبٹے کی چین ہو۔ یہ کیا کہیں جب سے
دلّی چھوڑی ہے کچھ جی افسردہ ہو گیا ہے، اور شعر پڑھنے کو جو کہو تو کچھ لطف اس میں بھی نہیں رہا

---

[1] آٹھوں کا میلہ لکھنؤ میں بڑی دھوم کا ہوتا تھا۔ ۱۲

کہ مجھ سے سنیئے۔ ریختے میں اُستاد میاں ولی ہوئے۔ ان پر توجہ شاہ گلشن صاحب کی تھی۔ پھر میاں آبرو اور میاں ناجی اور میاں حاتم پھر سب سے بہتر مرزا رفیع السودا اور میر تقی صاحب۔ پھر حضرت خواجہ میر درد صاحب برد اللہ مرقدہٗ جو میرے بھی اُستاد تھے وہ لوگ تو سب مر گئے اور اُن کی قدر دانی کرنیوالے بھی جاں بحق تسلیم ہوئے۔ اب لکھنؤ کے جیسے چھوکرے ہیں ویسے ہی شاعر ہیں۔ اور دلی میں بھی ایسا ہی کچھ چرچا ہے۔ تخم تاثیر صحبت اثر۔ سبحان اللہ یہ کون میاں جرأت بڑے شاعر۔ پوچھو تو تمہارا ارائے مال کس دن شعر کہتا تھا۔ اور رضا بہادر کا کونسا کلام ہے۔ اور دوسرے میاں مصحفی کہ مطلق شعور نہیں رکھتے اگر پوچھیے کہ ضَرَبَ زَیدٌ عَمرًا کی ترکیب تو ذرا بیان کرو تو اپنے شاگردوں کو ہمراہ لیکر لڑنے آتے ہیں۔ اور میاں حسرت کو دیکھو، اپنا عرق بادیان اور شربت انار چھوڑ کے شاعری میں آکے قدم رکھا ہے اور میر انشاء اللہ خاں بچارے میر ماشاء اللہ خاں کے بیٹے آگے پریزاد تھے۔ ہم بھی گھورنے کو جاتے تھے، اب چند روز سے شاعر بن گئے ہیں۔ مرزا مظہر جان جاناں صاحب کے روزمرّہ کو نام رکھتے ہیں، اور سب سے زیادہ ایک اور سُنیئے کہ سعادت یار، طہماسپ کا بیٹا انوری ریختہ آپ کو جانتا ہے۔ رنگین تخلص ہے ایک قصّہ کہا ہے۔ اس مثنوی کا نام دلپذیر رکھا ہے۔ رنڈیوں کی بولی اس میں باندھی ہے میر حسن پر زہر کھایا ہے۔ ہر چند اس مرحوم کو بھی کچھ شعور نہ تھا بدرمنیر کی مثنوی نہیں کہی گویا سانڈے کا تیل بیچتے ہیں۔ بھلا اس شعر کو کیونکر کہیے۔ سارے دلی لکھنؤ کے رنڈی سے لیکر مرد تک پڑھتے ہیں ؎

چلی واں سے دامن اُٹھاتی ہوئی   کڑے کو کڑے سے بجاتی ہوئی

سو اُس بچارے رنگین نے بھی اسی طور پر قصّہ کہا ہے۔ کوئی پوچھے کہ بھائی تیرا باپ رسالدار مسلّم لیکن بچارا برچھی بھالے کا ہلانے والا، تیغے کا چلانے والا تھا، تو ایسا قابل کہاں سے ہوا اور شہدپن جو بہت مزاج میں رنڈی بازی سے آگیا ہے تو ریختہ

کے تئیں چھوڑ کر ایک ریختی ایجاد کی ہے اس واسطے کہ بھلے آدمیوں کی بہو بیٹیاں
پڑھکر مشتاق ہوں، اور اُن کے ساتھ اپنا منھ کالا کرے - بھلا یہ کلام کیا ہے۔

ذرا گھر کو رنگیں کے تحقیق کر لو یہاں سے ہے کے پیسے ڈولی کہارو

مرد ہو کر کہتا ہے۔ع کہیں ایسا نہو کمبخت میں ماری جاؤں - اور ایک کتاب بنائی
ہے اس میں رنڈیوں کی بولی لکھی ہے۔ جس میں اوپر والیاں، چیلیں، اوپر والا چاند،
اُجلی۔ دھوبن وغیرہ وغیرہ

یہ بڈھے میر صاحب تازہ اوضاع واطوار اور نئی رفتار و گفتار پر کیا کیا خیالات رکھتے تھے
اور شعرائے عصر کے کلام پر جو تنقید کی ہے کس قدر ظریفانہ انداز میں اپنے اصلی خیال کو ظاہر کیا ہے
لطف یہ ہے کہ سید انشا نے اس موقع پر اپنے آپ کو اور اپنے دوست رنگین کو بھی نہیں
چھوڑا بلکہ خوب خبر لی ہے۔

مختلف زبانیں جانتے تھے۔ سید انشا مختلف زبانیں جانتے تھے، عربی، فارسی، ترکی، پنجابی، پشتو
پوربی، مرہٹی، ان سب زبانوں میں خوب ماہر تھے اور اُردو کے
اہلِ زباں تھے۔ اُن کے تصرف یا ایجاد اپنی خوش ادائی اور خوشنمائی کے سبب ہر اہلِ زباں
سے تحسین و آفریں کا خراج وصول کرتے ہیں، اگر وہ آج ہمارے زمانہ میں ہوتے تو ہماری
زبان کا طرزِ ادا نہایت عمدگی اور خوبصورتی سے بدلتے، ایک قصیدہ جو جارج سوم کی
تہنیتِ جشن میں کہا ہے، اُس میں انگریزی الفاظ کس خوبصورتی سے بٹھائے ہیں۔ دو چار
شعر بطورِ نمونہ لکھتا ہوں صاحبانِ ذوقِ سلیم اُن کے کمال کا خود اندازہ کر سکتے ہیں۔

بگیاں پھولوں کی تیار کرا اے بوئے سمن کہ ہوا کھانے کو نکلینگے جوانانِ چمن،
کوئی شبنم سے چھڑک بالوں پہ اپنے پوڈر کرسی ناز پہ جلوہ کی دکھائیگا پھبن
شاخِ نازک سے کوئی ہاتھ میں لیکر اک بیت ہو الگ سب سے نکالے گا ترا لا جوبن
نسترن بھی نئی صورت کا دکھاویگا رنگ کورچ پر ناز کی جب پاؤں رکھیگا بن ٹھن

پیتے ہل ہل کے بجاویںگے فرنگی طنبور ‏ لالہ لارے گا سلامی کو بنا کر پلٹن،
کھینچکر تارِ رگِ ابرِ بہاری سے کبھی ‏ خود نسیم سحر آوے گی بجاتی ارگن
اردلی کے جو گرانڈیل ہیں ننگے سب جمع ‏ آن کر اپنا بگل پھونکے گا جب گھدرسن
نکہت آوے گی نکل کھول کلی کا کمرا ‏ ساتھ ہو لے گی نزاکت بھی جو ہے اُسکی بہن

گھوڑے کی تعریف کیا خوب کی ہے :-

ہے اس آفت کا سیک سیر کہ راکب اُسکا ‏ حاضری کھائے جو کلکتہ تو لندن میں ٹفن

حلیہ اُن کا پڑھنا بھی ایک خاص انداز رکھتا تھا جس سے شعر کی شان اور لطف کلام دوبالا ہو جاتا تھا۔ سید انشا رنگت کے گورے، بدن کے فربہ، صورت کے جامہ زیب تھے چال ڈھال اور سج دھج یہ تھی کہ ایک طرف آدابِ معقولیت سے سلام کیا۔ ایک طرف مسکرا دیا۔ ایک طرف منھ چڑا دیا۔ کبھی مقطع مرد معقول، کبھی دلّی کے بانکے، کبھی آدھی ڈاڑھی اُڑا دی کبھی چار ابرو کی صفائی بتا دی، اس میں شک نہیں کہ تفریح و تضحیک کے اعتبار سے کسی جلسہ میں اُن کا آنا بھانڈ کے آنے سے کم نہ تھا مصحفی نے اُن کی ہجو میں کیا خوب کہا ہے :- ع

"واللہ کہ شاعر نہیں تو بھانڈ ہے بھڑوے"

لطائف ایک دن نواب سعادت علی خاں کے ساتھ بیٹھے کھانا کھا رہے تھے، اور گرمی سے گھبرا کر دستار سر سے رکھدی تھی۔ منڈا ہوا سر دیکھکر نواب کی طبیعت میں چہل آئی، ہاتھ بڑھا کر پیچھے سے ایک دھول ماری، آپ نے جلدی سے ٹوپی سر پہ رکھ لی اور کہا۔ سبحان اللہ بچپن میں بزرگ سمجھایا کرتے تھے وہ بات سچ ہے کہ ننگے سر کھانا کھاتے ہیں تو شیطان دھولیں مارا کرتا ہے۔

ایک دن نواب موصوف نے روزہ رکھا اور حکم دیا کہ کوئی آنے نہ پائے سید انشا کو ضروری کام تھا۔ یہ پہنچے۔ پہرہ دار نے کہا کہ آج حکم نہیں۔ آگے آپ مالک ہیں۔ باوجود انتہائے مرحمت کے یہ بھی مزاج سے ہشیار رہتے تھے۔ تھوڑی دیر تامل کیا۔ آخر کمر کھول

دستار سر سے پڑھا تھا اُتار ڈالی اور دوپٹہ عورتوں کی طرح سے اوڑھ کر ایک ناز و انداز کے ساتھ سامنے جا کھڑے ہوئے، جوں ہی اُس کی نظر پڑی آپ اُنگلی ناک پر دھر کے بولے

ہیں تمہے صدقہ نہ رکھ لے مری پیاری رُزہ | بندی رکھیگی تمہے بدلے ہزاری روزہ

نواب بے اختیار ہنس پڑے۔ جو کچھ کہنا سننا تھا وہ کہا اور ہنستے کھیلتے چلے آئے۔

جان بیلی صاحب رزیڈنٹ کے ساتھ علی نقی خاں میر منشی بھی آیا کرتے تھے۔ انکی اُن کی عجیب لطف کی چوٹیں ہوتی تھیں۔ ایک دن اثنائے گفتگو میں کسی کی زبان سے نکلا ع شاید کہ پلنگ خفتہ باشد۔ اُنہوں نے کہا کہ گلستاں کے ہر شعر میں مختلف روایتیں ہیں اور لطف یہ ہے کہ کوئی کیفیت سے خالی نہیں چنانچہ یہ بھی ہو سکتا ہے ع "شاید کہ پلنگ خُفتیہ باشد" سعادت علیخاں نے سید انشا کی طرف دیکھا اُنہوں نے ہاتھ باندھ کر عرض کی کہ حضور! میر منشی صاحب بجا فرماتے ہیں، غلام نے بھی ایک نسخہ گلستاں میں یہی دیکھا تھا۔

تا مرد سخن نہ گفتیہ باشد | عیب و ہنرش نہفتیہ باشد

در بیشہ گماں مبر کہ خالی است | شاید کہ پلنگ خفتیہ باشد

بلکہ وہ نسخہ بہت صحیح اور محشی تھا۔ اُس میں گفتیہ اور نہفتیہ کے کچھ معنی بھی لکھے تھے۔ میر منشی صاحب! آپ کو یاد ہیں؟ وہ نہایت شرمندہ ہوئے۔ جب وہ رخصت ہوتے تو سید انشا کہا کرتے میر منشی صاحب کا اللہ بیلی۔

فائق تخلص ایک فلک زدہ شاعر تھا۔ خدا جانے کس بات پر خفا ہوا کہ ان کی ہجو کہی اور خود لا کر سُنائی۔ انہوں نے بہت تعریف کی۔ بہت اُچھلے۔ بہت کو دے، اور پانچ روپئے بھی دیئے۔ جب وہ چلا تو بولے ذرا ٹھیر یئے گا، ابھی آپ کا حق باقی ہے۔ قلم اُٹھا کر یہ قطعہ لکھا اور حوالہ کیا۔

فائقِ بے حیا چو ہجوم گفت | دلِ من سوخت سوختہ بہ

صلہ اش پنج روپیہ دادم | دہنِ سگ بہ لقمہ دوختہ بہ

انجام اچھا نہ ہوا لیکن افسوس ہے کہ ایسے مرنجان و مرنج اور لطیفہ گو اور بذلہ سنج شخص کا انجام

سعادت علی خاں کے ہاتھوں اچھا نہ ہوا، کوئی ایسی بات بھی نہ تھی جس کی سزا نواب نے سید انشا
کیلئے ایسی سخت تجویز کی۔ واقعہ یہ ہے کہ ایک دن سر دربار بعض شرفائے خاندانی کی شرافت
ونجابت کے تذکرے ہو رہے تھے سعادت علی خاں نے کہا کہ کیوں بھئی ہم بھی نجیب الطرفین
ہیں۔ سید انشا بول اُٹھے کہ حضور بلکہ انجب۔ انجب نجیب کا اسم تفضیل ہے یعنی نہایت
شریف یا سب سے بڑھکر شریف اور دوسرے معنی اسکے یہ ہیں کہ وہ شخص جو حرم کے پیٹ
سے ہو چنانچہ عرب کہتا ہے وَلَدُ الْجَارِیَۃِ اَنْجَبُ۔ اتفاق یہ ہوا کہ سعادت علی خاں حرم
کے شکم سے تھے[1]۔ اُنھوں نے انجب کے معنی یہی لیے، چنانچہ وہ چپ اور تمام دربار درہم ہو گیا
اگرچہ سید انشا نے پھر اور باتیں بنا بنا کر بات کو مٹانا چاہا مگر کمانِ تقدیر سے تیر نکل چکا تھا
وہ کھٹک دل سے نہ نکلی اور نواب اس فکر میں رہنے لگے کہ کوئی بہانہ ان کی سخت گیری کے
لیے ہاتھ آئے، ایک دن سید انشا نے بہت ہی گرم لطیفہ سُنایا سعادت علیخاں نے کہا
کہ انشا اجب کہتا ہے ایسی بات کہتا ہے کہ نہ دیکھی ہو نہ سُنی ہو۔ یہ موجپول پرتاؤ دیکر
بولے کہ حضور کے اقبال سے قیامت تک ایسی ہی کہے جاؤں گا، کہ نہ دیکھی ہو نہ سُنی ہو
نواب تو تاک میں تھے چیں بجبیں ہو کر بولے کہ بھلا زیادہ نہیں! فقط دو لطیفے روز سنا دیا
کیجیے، مگر شرط یہی ہے کہ نہ دیکھے ہوں نہ سُنے ہوں، نہیں تو خیر نہو گی۔ سید انشا سمجھ گئے
کہ یہ انداز کچھ اور ہیں خیر اُس دن سے دو لطیفے روز تو انھوں نے سُنانے شروع کر دیئے
مگر چند روز میں یہ عالم ہو گیا کہ دربار کو جانے لگتے تو جو پاس بیٹھا ہوتا اُسی سے کہتے کہ کوئی
نقل، کوئی چٹکلا یاد ہو تو بتاؤ تاکہ نواب کو سُناؤں۔ اسی اثنا میں ایک دن ایسا ہوا کہ
سعادت علی خاں نے انھیں بُلا بھیجا۔ یہ کسی اور امیر کے ہاں گئے ہوئے تھے۔ چوبدار نے
آ کر عرض کی کہ گھر میں نہیں ملے، خفا ہو کر حکم دیا کہ ہمارے سوا کسی اور کے ہاں نہ جایا کرو۔ اس قید

[1] یہ بھی نواب کی حماقت تھی۔ جب حرم کے شکم سے تھا تو لوگوں سے کیوں نجیب الطرفین کہلانے
کا شائق تھا؟ تنہا

بے زنجیر نے انہیں بہت دق کیا۔ تازہ مصیبت یہ ہوئی کہ تعالی اللہ خاں نوجوان بیٹا مر گیا اس صدمہ سے حواس میں فرق آگیا، یہاں تک کہ ایک دن سعادت علی خاں کی سواری اُن کے مکان کی طرف سے نکلی۔ کچھ غم و غصہ، کچھ دل بے قابو۔ غرض سرِ راہ کھڑے ہو کر سخت و سست کہا۔ اب جنون میں کیا کسر رہی، سعادت علی خاں نے جا کر تنخواہ بند کر دی۔ اگر نواب اِس طریقہ سے بدلہ نہ لیتا تو شاید یہ بات کسی کو معلوم بھی نہ ہوتی کہ سید انشا نے اُسے انجب کہا تھا اور وہ حرم کے شکم سے تھا، با کمال اصحاب کے ساتھ اِس بے رخی اور سختی سے پیش آنا ہمیشہ باعث ننگ و شرم رہا ہے۔ سلطان محمود غزنوی کو فردوسی نے ہجو لکھ کر بدنام کیا کیونکہ سلطان نے شاہنامہ کی تصنیف کا معاوضہ بجائے ساٹھ ہزار اشرفیوں کے ساٹھ ہزار روپیہ دینا چاہا۔ سعادت علیخاں کو سید انشا کیساتھ بدسلوکی کرنے پر ہمیشہ کے لیے دنیائے شعرا میں تنگ نظری اور کم مائگی کی جگہ دی گئی۔ واقعی فردوسی کا شعر سعادتعلیخاں کے مصداق ہے ؎

پرستار زادہ نیاید بکار اگرچہ بود زادۂ شہریار

آخر اسی کا بھائی آصف الدولہ اپنی سخاوت اور حلم و بردباری کی وجہ سے مشہورِ آفاق ہے اور مجبوراً یہی کہنا پڑتا ہے کہ وہ خاندانی سیدزادی کے بطن سے تھا جنکی تمام خاندان بڑی عظمت کرتا تھا اور جن کا نام دلہن بیگم صاحب تھا اور یہ حضرت آخر انجب ہی تھے۔ ع

اصلِ بد از خطا خطا نہ کند

میر تقی میر نے نواب آصف الدولہ کو ایک غزل سُنائی، وہ حوض کے کنارے کھڑے ہوئے مچھلیوں سے کھیل رہے تھے، توجہ سے نہ سُنی۔ میر صاحب ناراض ہو کر چلے آئے اور نواب کے یہاں جانا چھوڑ دیا۔ چند روز کے بعد ایک دن بازار میں میر صاحب چلے جاتے تھے کہ نواب کی سواری سامنے سے آگئی۔ دیکھتے ہی نہایت محبت سے بولے کہ میر صاحب آپ نے بالکل ہمیں چھوڑ دیا۔ کبھی تشریف بھی نہیں لاتے، میر صاحب نے کہا بازار میں باتیں

کرنا واپ شرفا نہیں۔ یہ کیا گفتگو کا موقع ہے۔ کہیں سعادت علی خاں سے یہ گفتگو ہوتی تو بیچارے میر صاحب شہر بدر کردیے جاتے۔

انشا کی زندگی میں انقلابات

الغرض سید انشا کا ایک وہ زمانہ تھا کہ سعادت علی خاں کی ناک کے بال تھے، اپنی کمال لیاقت اور شگفتہ مزاجی کے سبب سے مرجعِ خلائق تھے دروازے پر گھوڑے، ہاتھی، پالکی، نالکی کے ہجوم سے رستہ نہ ملتا تھا، دوسرا زمانہ وہ گزرا جبکہ انجیب کا واقعہ ہوچکا تھا، ظاہر درست تھا مگر درختِ اقبال کی جڑ کو دیمک لگ گئی تھی اور سید انشا کا اپنے گھر سے باہر جانا بند ہوگیا تھا۔ چنانچہ سید انشا نے اپنے دوست میاں رنگین سے کہا تھا۔ "کیا کروں ظالم کی قید میں ہوں، سوا دربار کے گھر سے نکلنے کا حکم نہیں" سید انشا کی تیسری حالت یہ ہوئی جبکہ تنخواہ بند ہوگئی کہ ایک مشاعرہ میں میلی کچیلی روئی دار مرزئی پہنے گئے۔ سر پر ایک میلا سا پھینٹا، گھٹنا پاؤں میں۔ گلے میں پیکیوں کا توبڑا۔ ایک لکڑ کا حقہ ہاتھ میں۔ جاکر سلام علیکم کہا اور بیٹھ گئے۔ کسی کسی نے اُن سے مزاج پرسی کی، انہوں نے اپنے توبڑے میں ہاتھ ڈالکر تمباکو نکالا، اور اپنی چلم پر سلفا جما کر کہا کہ بھئی ذرا سی آگ ہو تو اس پر رکھ دینا۔ اُسی وقت آوازیں بلند ہوئیں اور گڑ گڑی۔ سٹک، پیچوان سے لوگ تواضع کرنے لگے، وہ بے دماغ ہو کر بولے کہ صاحب! ہمیں ہمارے حال پر رہنے دو۔ نہیں تو ہم جاتے ہیں۔ سب نے اُن کے حکم کی تعمیل کی۔ دم بھر کے بعد پھر بولے کہ کیوں صاحب ابھی مشاعرہ شروع نہیں ہوا؟ لوگوں نے کہا جناب لوگ جمع ہوتے جاتے ہیں۔ سب صاحب آجائیں تو شروع ہو۔ وہ بولے کہ صاحب ہم تو اپنی غزل پڑھ دیتے ہیں! یہ کہکر توبڑے میں سے ایک کاغذ نکالا اور غزل[۱] پڑھنی شروع کردی جو اُن کے بالکل حسبِ حال تھی، اور آج بھی زباں زدِ خاص و عام ہے:۔

کمر باندھے ہوئے چلنے کو یاں سب یار بیٹھے ہیں ۔۔۔ بہت آگے گئے باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں

---

[۱] یہ سید انشا کی آخری غزل ہے۔ تنہا

نہ چھیڑ اے نکہتِ بادِ بہاری راہ لگ اپنی
تجھے اٹکھیلیاں سوجھی ہیں ہم بیزار بیٹھے ہیں

تصور عرش پر ہے اور سر ہے پائے ساقی پر
غرض کچھ زور دُھن میں اس گھڑی میخوار بیٹھے ہیں

بسانِ نقشِ پائے رہرواں کوئے تمنا میں
نہیں اُٹھنے کی طاقت کیا کریں لاچار بیٹھے ہیں

یہ اپنی چال ہے اُفتادگی سے اب کہ پہروں تک
نظر آیا جہاں پر سایۂ دیوار بیٹھے ہیں

کہاں صبر و تحمل آہ ننگ و نام کیا شے ہے
میاں رو پیٹ کر ان سب کو ہم یکبار بیٹھے ہیں

نجیبوں کا عجب کچھ حال ہے اس دور میں یارو
جہاں پوچھو یہی کہتے ہیں ہم بیکار بیٹھے ہیں

بھلا گردش فلک کی چین دیتی ہے کسے انشا
غنیمت ہے کہ ہم صورت یہاں دو چار بیٹھے ہیں

وہ تو غزل پڑھ، کاغذ پھینک، سلام علیک کہہ کر چلے گئے مگر زمین و آسمان میں سناٹا ہو گیا اور دیر تک دلوں پر ایک عالم رہا جس کی کیفیت بیان نہیں ہو سکتی۔

چوتھی حالت کا نقشہ میاں رنگین اس رنگ سے کھینچتے ہیں کہ میں لکھنؤ گیا تو پوچھتا ہوا گھر پہنچا۔ افسوس جس دروازہ پر ہاتھی جھومتے تھے وہاں دیکھا کہ خاک اُڑتی ہے اور کتے لوٹتے ہیں۔ ڈیوڑھی پر دستک دی، اندر سے کسی بڑھیا نے پوچھا کہ کون ہے بھائی؟ (وہ اُن کی بی بی تھیں) میں نے کہا کہ سعادت یار خاں دلی سے آیا ہے۔ چونکہ سید انشا سے انتہائی درجہ کا اتحاد تھا اُس عفیفہ نے پہچانا، دروازہ پر آکر بہت روئیں اور کہا کہ بھیا اُن کی تو عجب حالت ہے۔ اے لو میں ہٹ جاتی ہوں، تم اندر آؤ، اور دیکھ لو۔ میں اندر گیا۔ دیکھا ایک کونے میں بیٹھے ہیں۔ تن برہنہ ہے، دونوں رانوں پر سر دھرا ہے۔ آگے راکھ کے ڈھیر ہیں، ایک ٹوٹا سا حقہ پاس رکھا ہے، یا تو وہ شان و شکوہ کے جمگھٹ دیکھے تھے، وہ گرمجوشی اور چہلوں کی ملاقاتیں ہوتی تھیں یا یہ حالت دیکھی۔ بے اختیار دل بھر آیا۔ میں بھی وہیں زمین پر بیٹھ گیا اور دیر تک رویا۔ جب جی ہلکا ہوا تو میں نے پکارا کہ سید انشا۔ سید انشا سر اُٹھا کر اُس نظر حسرت سے دیکھا جو کہتی تھی کہ کیا کروں۔ آنکھ میں آنسو نہیں۔ میں نے کہا کیا

حال ہے؟ ایک ٹھنڈی سانس بھر کر کہا کہ شکر ہے پھر اس طرح سر کو گھٹنوں پر رکھ لیا کہ نہ اٹھایا۔

یہ اردو نظم و نثر کا باکمال استاد اس طرح اپنی زندگی کے آخری ایام گزار کر دنیائے فانی سے عالم بقا کو راہی ہوا، اور اسکی موت اہلِ بینش کے لیے ایک تازیانہ عبرت کا کام دیتی ہے ؎

یہ لاش بے کفن اسدِ خستہ جاں کی ہے   حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا



مولوی شاہ رفیع الدین دہلوی

اٹھارویں صدی عیسوی کے پچھلے نصف حصہ میں اور انیسویں صدی کے پہلے نصف حصہ میں یعنی ایک صدی کے اندر شاہانِ مغلیہ کی عظمت کا خاتمہ ہوگیا تھا، اقبال منہ موڑ چکا تھا، اور ادبار و فلاکت کی گھٹائیں ہر طرف سے چھا رہی تھیں لیکن اس آخری زمانہ میں جو اسلام کا ہندوستان میں آخری دور تھا آسمانِ علم و ادب کا آفتاب دہلی میں طلوع ہوا، اور اس نے اپنی روشنی سے عالم کو منور کردیا حکومتِ اسلام کو گھن لگ چکا تھا لیکن مذہب اسلام باوازِ بلند پکار رہا تھا کہ وہ حکومت کا تابع نہیں ہے، بلکہ اسکی اپنی خوبیاں سلطنتوں کو تسخیر کرتی ہیں، اور اہلِ عالم کے دلوں کو مسخر کرلیتی ہیں، چنانچہ شاہ ولی اللہ صاحب قدس سرہ العزیز نے اپنی لاجواب کتاب حجۃ اللہ البالغہ سے جو فارسی زبان میں تحریر فرمائی ہے ہمارے قول کی تائید کردی ہے۔ مولانا شبلی نعمانی اپنی کتاب علم الکلام میں فرماتے ہیں کہ "اخیر زمانے میں جب کہ اسلام کا نفسِ بازپسیں تھا، شاہ ولی اللہ جیسا شخص پیدا ہوا جسکی نکتہ سنجیوں کے

ملہ (۱) واقعاتِ دارالحکومت دہلی مصنفہ مولوی بشیر الدین احمد دہلوی سے شاہ رفیع الدین و شاہ عبدالقادر و مولوی اسمٰعیل کے کچھ حالات اخذ کیے گئے ہیں۔ منہ

آگے غزالی، رازی، ابن رشد کے کارنامے بھی ماند پڑ گئے۔ شاہ صاحب نے علم کلام کے عنوان سے کوئی تصنیف نہیں کی اور اس بنا پر اُن کو متکلمین کے زمرے میں شمار کرنا بظاہر موزوں نہیں لیکن ان کی کتاب حجۃ اللہ البالغہ جس میں اُنھوں نے شریعت کے حقائق اور اسرار بیان کیے ہیں درحقیقت علم کلام کی روحِ رواں ہے ......"

ظاہر ہے کہ شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ اعلیٰ پایہ کے اہلِ علم تھے جو علامہ شبلی سے ان الفاظ میں خراجِ تحسین وصول کرتے ہیں:۔ ان کے بعد ان کے تین صاحبزادے علی التواتر مذہب اسلام کی خدمت کرتے رہے، مولوی شاہ عبدالعزیز صاحبؒ بڑے بیٹے تھے جنکی کتاب فارسی زبان میں ازالۃ الخفا کے نام سے مشہور ہے اور جو آسمانِ علم پر ماہتاب ہو کر چمکے۔ انکے بعد مولوی شاہ رفیع الدین کا نمبر ہے جو شاہ ولی اللہ صاحبؒ کے دوسرے بیٹے تھے ۱۱۶۳ھ ہجری میں پیدا ہوئے تھے۔ اپنے والدِ ماجد کی آغوشِ عاطفت میں علوم مروجہ حاصل کیے اور حدیث شریف کی سند بھی اُسی صاحبِ کمال کے دستِ شفقت سے حاصل کی۔ علم اور تقوے میں اپنے باپ اور بھائی کے قدم بقدم تھے جب بڑے بھائی حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب بوجہ کبر سنی و کثرتِ امراض و ضعفِ مزاج، دماغی محنت و تعلیم و تدریس کے زیادہ متحمل نہ ہو سکے تو یہ کام شاہ رفیع الدین صاحبؒ ہی کے زیادہ تر ذمہ کیا گیا۔

آپ کے اوصاف کا احاطہ کرنا مشکل ہے، کس باپ کے بیٹے اور کس بھائی کے بھائی تھے۔ شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کی وفات پر جو قطعۂ تاریخ حکیم مومن خاں مومن نے لکھا ہے اُس سے اُنکے مذہبی تقدس اور علم و فضل کا ایک حد تک اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ یہاں صرف دو شعر پر اکتفا کرتا ہوں:۔ ؎

جانبِ ملکِ عدم تشریف فرما کیوں ہوئے ... آگیا تھا کیا کہیں مُرد و شکے ایماں میں خلل
دستِ بیدادِ اجل سے بے سر و پا ہو گئے ... فقر و دیں، فضل و ہنر، لطف و کرم علم و عمل
۱۲۳۹ ہجری

پس شاہ رفیع الدین صاحبؒ بھی صاحبِ علم و فضل اور باکمال ہونے کے علاوہ صاحبِ باطن اور

مخیر بھی تھے۔ آپ سے اکثر نظمیں اور کچھ نثر بھی یادگار ہے۔ لیکن سب سے اہم اور بڑا کام کلام مجید کا تحت اللفظ اُردو ترجمہ ہے جو آجتک مقبولِ انام ہے۔ مختصر نمونہ مولوی نذیر احمد صاحب کے حالات میں درج کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ بھی آپ کی کئی تصنیفات ہیں۔ آخر عمر تک آپ خدمتِ دین میں منہمک رہے اور ستر برس کی عمر میں ۱۲۳۳ھ ہجری میں انتقال کیا اور اپنے والدِ بزرگوار کے قریب پائینتی کی طرف دفن ہوئے۔



مولوی شاہ عبدالقادر صاحب دہلوی

شاہ ولی اللہ صاحب قدس سرہ العزیز کے تیسرے صاحبزادے مولوی شاہ عبدالقادر صاحب تھے۔ آپ ۱۱۶۷ھ ہجری میں شمع افروزِ بزمِ جہاں ہوئے اور اپنے وجودِ باجود سے عالم کو روشن کر دیا۔ ابتدائی تعلیم و تربیت اپنے والدِ مکرم کے سایۂ عاطفت میں پائی اور علم فقہ و حدیث و تفسیر میں تمام پیدا کیا۔ تحصیلِ علم سے فراغت پاکر اکبر آبادی مسجد کے حجرے میں تمام عمر بسر کر دی اور دنیا میں بالکل ایک مسافرانہ حالت سے رہے۔ کُنْ فِی الدُّنیا کَاَنَّکَ غَرِیبٌ اَوْ عَابِرُ سَبِیلٍ پر آپ کا عمل رہا۔ حقیقتاً صرف یہی لوگ ایسے نفوسِ قدسی تھے جو عالم باعمل تھے، یوں تو دنیا کو سب سرائے فانی اور چند روزہ اقامت گاہ کہتے ہیں لیکن اپنے عمل اور طرزِ ماند و بود سے اپنے قول کی تائید نہیں کرتے بلکہ اسکے خلاف وہ طریقۂ زندگی اختیار کرتے ہیں جس سے وہ یہاں ابدالآباد تک رہنے کی فکر میں مبتلا پائے جاتے ہیں۔

شاہ صاحبؒ عالم، فاضل، متقی، پرہیزگار، مستغنی المزاج اور متوکل تھے۔ دنیا سے نفرت تھی، اور گوشہ نشینی پسندِ خاطر تھی۔ رات دن ذکرِ خدا میں مشغول رہتے تھے۔ اہلِ دنیا کی طرف مطلق التفات نہ فرماتے۔ اسی سبب سے تصنیف و تالیف کی طرف بھی چنداں توجہ نہ کی۔ قرآن شریف کا بامحاورہ ترجمۂ اُردو یا موضح القرآن آپ سے یادگار ہے جن پر

بلا مبالغہ ہزاروں کتابیں نثار ہیں۔ ترجمہ ظاہر میں سیدھا سادہ ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اُس سے صاحب ترجمہ کی بالغ نظری بھی عیاں ہے۔ جواہر کوٹ کوٹ کر بھرے ہیں، اس کا لطف وہی جانتے ہیں جو ادب اور علم تفسیر و حدیث سے بہرۂ وافی رکھتے ہیں۔ آپ کا یہ ترجمہ کثرت سے رائج ہے اور بہت مقبول ہے۔ ہم نے آپ کے ترجمہ کی بھی دو چار سطریں شاہ رفیع الدین صاحبؒ کے ترجمہ کے ساتھ ساتھ مولوی نذیر احمد صاحب کے ترجمۃ القرآن کے تحت میں لکھی ہیں۔ ناظرین کو اس ترجمہ کے محاسن کا اندازہ خود مولوی نذیر احمد صاحب کی تحریر سے بخوبی ہو جائیگا۔ اور اُن کی رائے اس بارے میں ایک خاص وقعت رکھتی ہے کیونکہ وہ بھی خود مترجم القرآن ہیں اور جو خوبیاں اُنکو اپنے ترجمہ کے وقت اس ترجمہ میں نظر آئیں اُنہوں نے اپنے الفاظ میں اُن کا اظہار کر دیا ہے۔

شاہ عبدالقادر صاحبؒ کے فیض باطن کا یہ حال تھا کہ اُس زمانہ میں ایسا مکاشف صحیح اور کوئی نہ تھا۔ سنا جاتا ہے کہ جو کچھ اُن کی زبان سے نکل جاتا تھا بلا کم و کاست وہی ظہور میں آتا تھا، باوجود اس کے بسبب کثرت اخلاق کبھی کسی کے حق میں کچھ ارشاد نہ فرماتے اور نہ کبھی کسی سے یہ کہتے کہ اِدھر بیٹھو یا اُدھر لیکن منجانب اللہ لوگوں کے دلوں میں آپ کا ایسا رُعب چھایا ہوا تھا کہ رؤسائے شہر جب آپ کی خدمت میں حاضر ہوتے تو ادب کی وجہ سے دور دور خاموش بیٹھتے اور آپ کی تحریک کے بغیر مجال سخن نہ رکھتے تھے۔ اور اس پر بھی ایک دو بات سے زیادہ اُن کے مُنہ سے نہ نکلنے پاتی تھی۔ آپ کی کرامات بے شمار ہیں۔ آپ نے سنہ ۱۲۳۰ ہجری میں بعمر ۶۳ سال وفات پائی اور اپنے جدِ امجد شاہ عبدالرحیم صاحبؒ کے پائین میں مدفون ہوئے۔

مولوی نذیر احمد کی رائے ترجمۃ القرآن پر

مولوی نذیر احمد صاحب نے اپنے ترجمۃ القرآن کے ساتھ ایک مبسوط دیباچہ لکھا ہے اُس میں ترجمے کی ضرورت کو بہت خوبی کے ساتھ دکھلایا ہے، جہاں تک شاہ عبدالقادر صاحبؒ اور اُن کے ترجمے کا اُنکا

تعلق ہے وہ عبارت ہم ذیل میں نقل کرتے ہیں:-

"قرآن کا سب سے پہلا ترجمہ وہ ہے جو ۱۱۵۰ ہجری میں مولانا شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے کیا تھا۔ میں کہتا ہوں کہ یہ بزرگ زمانہ کے حالات پر کیسی وسیع نظر رکھتے تھے کہ ۱۱۵۰ ہجری میں باپ نے فارسی ترجمے کی ضرورت معلوم کی پھر سو نہیں دو سو نہیں صرف پچپن برس بعد اُن کے بیٹے شاہ عبدالقادر صاحبؒ کو معلوم ہوا کہ عام مسلمان فارسی بھی کم سمجھتے ہیں کہ ۱۲۰۵ھ میں اُنھوں نے اُردو ترجمہ کیا جو موضح القرآن کے نام سے مشہور ہے اور اُردو کا بہتر سے بہتر ترجمہ سمجھا جاتا ہے، اور وہ فی الواقع اپنے وقت میں بہتر سے بہتر تھا بھی۔ اس سے کہ ۱۱۵۰ھ میں مولانا شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے فارسی ترجمہ کیا اور ۱۲۰۵ ہجری میں مولانا شاہ عبدالقادر صاحبؒ نے اُردو صاف ظاہر ہے کہ ۱۲۰۵ ہجری ہی میں فارسی کا رواج اتنا کم ہو چلا تھا کہ مولانا شاہ عبدالقادر صاحبؒ کو قرآن کا اُردو ترجمہ کرنا پڑا تو اب ۱۳۱۲ھ میں فارسی کا کیا حال ہوا ہوگا۔ بے شک عربی کی طرح فارسی معدوم نہیں ہوئی مگر یہ بیچاری بھی مہمان چند روزہ ہے۔ ع اگر ماند شبے ماند شب دیگر نمی ماند ...... گو زمانے کے انقلاب نے مولانا شاہ ولی اللہ صاحب کے ترجمے کو بیکار سا کر دیا مگر ترجمہ تو حقیقت میں ایسا مستند ہے کہ جو شخص قرآن کے لفظ لفظ میں تیرے وہی اُس کی قدر جان سکتا ہے۔ فی الحقیقت قرآن کے مترجم ہونے کے لیے جتنی باتیں درکار ہیں ترجمے سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ سب مولانا شاہ ولی اللہ صاحبؒ میں علی الوجہ الکمال پائی جاتی تھیں، اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ مولانا صاحب کی نظر تفاسیر اور احادیث اور دین کی کتابوں پر ایسی وسیع ہے کہ بس اُنہی کا حصہ تھا۔ اب کوئی ایک عمر صرف کرے تو اُس کو یہ بات نصیب ہو اور وہ بھی شاید۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہر ایک آیت بلکہ ہر ایک لفظ کی نسبت مفسرین کے جتنے اقوال ہیں وہ سب اُن کے پیش نظر ہیں اور وہ اُن میں جس کو راجح پاتے ہیں اختیار کر لیتے ہیں جب ایک خاندان کے ایک چھوڑ تین تین ترجمے لوگوں کو مل گئے، ایک فارسی مولانا شاہ ولی اللہ صاحبؒ

کا۔ اکٹھے دو دو اُردو، ایک شاہ عبدالقادر صاحبؒ کا اور ایک شاہ رفیع الدین صاحبؒ کا تو اب ہر ایک کو ترجمے کا حوصلہ ہو گیا۔ مگر خاندان شاہ ولی اللہ صاحبؒ کے سوا کوئی شخص مترجم ہونے کا دعوے نہیں کر سکتا۔ وہ ہرگز قرآن کا مترجم نہیں بلکہ مولانا شاہ ولی اللہ صاحبؒ اور اُن کے بیٹوں کے ترجموں کا مترجم ہے کہ اُنہی ترجموں میں اُس نے کچھ ردو بدل تقدیم و تاخیر کر کے جدید ترجمے کا نام کر دیا۔۔۔۔۔ مولانا شاہ عبدالقادرؒ اور مولانا شاہ رفیع الدینؒ کے ترجمے زبان کے پُرانے ہونے کی وجہ سے ایسے اُکھڑے اُکھڑے نہیں معلوم ہوتے جیسے بے ترتیبیِ الفاظ کی وجہ سے۔ یہ نہیں کہ ان بزرگوں کو بے ترتیبیِ الفاظ کا علم نہیں ہوا، یا ان کے وقت میں ایسی بے ترتیب اُردو فصیح سمجھی جاتی تھی۔ نہیں یہ لوگ بجائے خود اُردو کے لیے سند تھے۔ مگر بات یہ ہے کہ ایک طرف ترتیبِ الفاظِ قرآن کا پاس اور دوسری طرف اُردو کی فصاحت۔ ان کی دینداری نے اجازت نہ دی کہ ترتیب الفاظِ قرآن کے مقابلہ میں اُردو کی فصاحت کا پاس کریں۔۔۔۔۔۔ ترجمہ تو ترجمہ کثرت سے عربی پڑھتے پڑھتے اُن کے مذاقِ اُردو پر یہ اثر کیا تھا کہ باوجودیکہ ترجمہ نہیں مگر الفاظ کی بے ترتیبی اُن کی اپنی اُردو میں بھی ہے۔۔۔۔۔۔۔ ہم مولانا شاہ عبدالقادر صاحبؒ کے دیباچہ کی عبارت اس جگہ نقل کرتے ہیں کیونکہ اُنہی کا ترجمہ با محاورہ سمجھا جاتا ہے اور مولانا شاہ رفیع الدین صاحبؒ کے ترجمے کے مقابلہ میں وہ ایسا ہی ہے۔ فرماتے ہیں "الٰہی شکر تیرے احسان کا ادا کروں کس زبان سے کہ ہماری زبان کو گویائی اپنے نام کر، اور دل کو روشنی دی اپنے کلام کر، اور اُمت میں کیا اپنے رسول مقبول کی جو اشرف الانبیاء اور نبی الرحمۃ جسکی شفاعت سے امیدوار ہیں ہم، کہ پاویں دو جہان کی نعمت۔ الٰہی اس نبی اُمت پرور کو اپنی رحمت کامل سے درجات اعلیٰ نصیب کر جو حد نہ ہو کسی مخلوق کی اور اپنی عنایت اُن پر ہمیشہ افزوں کر کہ دنیا اور آخرت میں"۔۔۔۔۔ یہ نمونہ ہے مولانا شاہ عبدالقادر صاحبؒ کی آزاد و طبع زاد اُردو کا، اسی پر قیاس کرنا چاہیے ان کے ترجمے کو جس میں چار و ناچار پابندی کرنی پڑتی ہے۔ اگرچہ ہم

دیباچہ کی زبان کو "گویا کی" اور "اپنے نام کر" اور "اپنے کلام کر" کی خوبیوں کو نہ سمجھیں، مگر باایں ہمہ ترجمہ اپنے وقت میں اور اپنی شان میں بے نظیر تھا۔"



مولوی اسمعیل دہلوی

شہید راہِ خدا

آپ جامع کمالاتِ صوری و معنوی تھے، نکتہ سنجی، کلام الٰہی، اور حدیث نبوی کے ماہر تھے، عالم معقول و منقول تھے، آپ کو مولانا شاہ عبدالعزیز صاحبؒ و شاہ رفیع الدین صاحب و شاہ عبدالقادر صاحب غفر اللہ لہم کے ساتھ برادر زادگی کی نسبت تھی، چونکہ آپ کے والد کا انتقال آپ کی صغر سنی ہی میں ہو گیا تھا اس لیے شاہ عبدالعزیز صاحبؒ نے انکو اپنے فرزندوں کی طرح پرورش کیا تھا اور اپنی نواسی بھی ان سے منسوب کی تھی۔ ان کی تعلیم و تربیت میں بھی خاص اہتمام ملحوظِ خاطر رکھا گیا۔ آپ پندرہ سولہ برس کی عمر میں تحصیلِ علوم سے فارغ ہو گئے تھے۔ آپ نے علم معقول کی بیشتر کتب پر حواشی تحریر کیے، اور ایک رسالہ منطق میں لکھا۔ ایک رسالہ قرۃ العینین فی اثباتِ رفع یدین تالیف فرمایا۔ اسی طرح متعدد رسالے آپ سے یادگار ہیں۔ اوائلِ عمر میں چونکہ فیضِ باطن کے حصول کا بہت خیال تھا اس لیے جناب میر سید احمد صاحب قدس سرہ العزیز کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اعتقاد بہم پہنچا کر اُن سے کسبِ فیضِ باطن پر آمادہ ہوئے۔ بعد ازاں پیر کی رفاقت ہی میں مناسکِ حج ادا کیے اور وہاں سے ہندوستان واپس آکر ہدایت و ارشاد سے خلق اللہ کو راہ راست دکھائی وعظ و نصیحت سے اہلِ غفلت کے کان کھول دیے اور اعلامِ سُنّت و ہدم بنیانِ شرک و بدعت کا آوازہ سب کے کانوں تک پہنچ گیا، بعض لوگوں نے آپ کی مخالفت شروع کی اور در پئے اذیت ہو گئے، کیونکہ اُن کی طرف سے کچھ لوگ ضعیف العقیدت ہو چلے تھے، لیکن وہ حق اور

راہِ راست پر تھے، ہدایت وارشاد سے باز نہ آئے۔ بحر خلق کو یہاں تک اختیارِ سنتِ نبوی اور ترکِ بدعات واحداث کی توفیق ہوئی کہ لوگ وحدانیت کے رنگ میں رنگے گئے مفسدوں کا بازار سرد ہوگیا اور لوگوں نے جان لیا کہ یہ لوگ مخالفین، طمع دنیاوی کی غرض سے ہم کو سبز باغ دکھاتے تھے۔ خدا کے فضل وکرم سے لوگوں کو نماز کی اس درجہ توفیق ہوئی کہ مسجد جامع میں نمازِ جمعہ کے واسطے ایسی کثرت ہونے لگی جیسی نمازِ عیدین پر عیدگاہ میں ہوتی ہے، آپ کا معمول تھا کہ ہر جمعہ اور سہ شنبہ کو مسجد جامع میں وعظ فرماتے تھے۔ بعض بدعتی لوگ آپ کو بھڑکا دیتے تھے تو وعظ میں ایسی زبردست اور مدلل تقریر فرماتے کہ لوگوں کے تمام شکوک رفع ہوجاتے۔

بعد ازاں آپ نے جہاد کی فضیلت میں تقریریں شروع کردیں انکا یہ اثر ہوا کہ مسلمانوں کا آئینۂ باطن مصفا اور مجلّی ہوگیا۔ راہِ حق میں وہ ایسے سرگرم ہوئے کہ بے اختیار اُن کے دل میں یہ آرزو پیدا ہوئی کہ اُن کا سر راہِ خدا کی نذر ہو اور اُن کا مال ومتاع "اعلائے لوائے دینِ محمدی میں صرف ہو۔ چنانچہ اپنے پیر کی طلب پر دہلی سے تشریف لے گئے اور باتفاقِ ممدوح جہاد پر کمر باندھکر کوہستان چلے گئے، وہاں سے اطرافِ ہندوستان میں طلبی کے خطوط بھیجے، اس نواح سے لوگ بکثرت روانہ ہوگئے اور کوہستانیوں کے علاوہ صرف ہندوستانی ایک لاکھ سے زائد آپ کی خدمتِ بابرکت میں جمع ہوگئے۔ اور راہِ خدا میں کارِ نمایاں بروئے کار آئے۔ تائیدِ الٰہی سے آپ کا رُعب کفار کے دلوں میں ایسا جاگزین ہوا کہ تابِ مقابلہ نہ رکھتے تھے اور نام سنکر فرار ہوجاتے تھے۔ لیکن قلعہ بالاکوٹ کے نواح میں ہمراہِ پیرِ طریقت اور اکثر مسلمین غزاۃ، شہیدِ راہِ خدا ہوئے جب اِس شکست کی خبر دلی میں آئی تو شاہ نصیر نے تمسخرانہ انداز میں ایک طولانی قصیدہ کہا جس کے تین شعر نقل کیے جاتے ہیں

کلام اللہ کی صورت ہوا دل اُنکا سیپارہ	نہ یاد آئی حدیث اُنکو نہ کوئی نصِ قرآنی
ہرن کی طرح میدانِ وغا میں چوکڑی بھولے	اگرچہ تھے وہم تمغہ سے وہ شیرِ نیستانی

مولوی صاحب کے طرفدار مجاہدوں کا دلی میں لشکر تھا، بہت سے بہادروں نے آکر شاہ صاحب کا گھر گھیر لیا۔ مرزا خانی کوتوال شہر تھے۔ وہ سنتے ہی دوڑے اور آکر بچا یا۔ شاہ صاحب نے اشعار مذکورہ کو قصیدہ کر دیا اور کوتوال صاحب کا بہت شکریہ ادا کیا۔ اُس میں کا ایک شعر یہ ہے:

نصیر الدین بیچارہ تو رستہ طوس کا لیتا نہ ہوتے شحنۂ دہلی اگر یاں میرزا خانی

آپ کی تصانیف متعدد ہیں، جن میں زیادہ تر متداول تقویت الایمان ہے۔

عبارتِ ذیل تقویت الایمان سے نقل کی جاتی ہے۔ مولوی اسمٰعیل صاحب اپنے کلام کی تائید میں قرآنِ پاک اور احادیثِ نبوی کا برابر حوالہ دیتے جاتے ہیں اور اہلِ اسلام کے لیے اُس سے زیادہ مدلل اور کوئی تقریر یا تحریر نہیں ہوسکتی جس کی بنیاد کلامِ پاک اور احادیث رسول ؐ پر ہو۔ طرزِ ادا بھی کس قدر دلچسپ اور با اثر ہے، اور معلوم ہوتا ہے کہ ایک دریائے ذخّار اُمڈا چلا آتا ہے۔ واوٗ عطف آجکل کی زبان کے مطابق چند مقامات پر غلط استعمال کیا گیا ہے اور بعض جگہ بے ترتیبیِ الفاظ اُس زمانہ کی تحریر کا نشان دے رہی ہے۔

"ہر خاص و عام کو چاہیے کہ اللہ و رسول ہی کے کلام کو تحقیق کریں اور اُسی کو سمجھیں اور اُسی پر چلیں اور اُسی کے موافق اپنے ایمان کو ٹھیک کریں۔ سو سُننا چاہیئے کہ ایمان کے دو جزو ہیں۔ خدا کو خدا جاننا اور رسول کو رسول سمجھنا۔ اور خدا کو خدا سمجھنا اسی طرح ہوتا ہے کہ اُس کا شریک کسی کو نہ سمجھے اور رسول کو رسول سمجھنا اس طرح ہوتا ہے کہ اس کے سوائے کسی کی راہ نہ پکڑے اِس پہلی بات کو توحید کہتے ہیں اور اس کے خلاف کو شرک، اور دوسری بات کو اتباعِ سُنّت کہتے ہیں اور اُس کے خلاف کو بدعت۔ سو ہر کسی کو چاہیے کہ توحید اور اتباعِ سُنّت کو خوب پکڑے اور شرک و بدعت سے بہت بچے، کہ یہ دونوں چیزیں اصل ایمان میں خلل ڈالتی ہیں اور باقی گناہ اُن سے پیچھے ہیں کہ وہ اعمال میں خلل ڈالتے ہیں اور چاہیے جو کوئی توحید اور اتباعِ سُنّت میں بڑا کامل ہو اور شرک و بدعت سے بہت دور، اور لوگوں کو اُس کی صحبت سے یہ بات حاصل ہوتی ہو اُسی کو اپنا پیر و اُستاد سمجھے۔ سو اسی لیے

کئی آیتیں اور حدیثیں کہ جن میں بیان توحید کا اور اتباع سُنّت کا ہے اور بُرائی شرک و بدعت کی اس رسالہ میں جمع کیں اور ان آیتوں و حدیثوں کا ترجمہ اُس کے حاصل معنی کا بیان، زبانِ ہندی سلیس میں کر دیا، تا عوام الناس اور خاص اس سے فائدہ برابر لیویں۔ جس کو اللہ توفیق دے وہ سیدھی راہ پر ہو جاوے اور بتانے والے کو وسیلہ نجات کا ہو وے آمین یا الٰہ العالمین۔ اور اس رسالہ کا نام تقویت الایمان رکھا اور اس میں دو باب ٹھہرائے پہلے باب میں بیان توحید کا اور بُرائی شرک کی اور دوسرے باب میں اتباع سُنّت کا اور بُرائی بدعت کی۔

پہلا باب توحید و شرک کے بیان میں - اول سُننا چاہیے کہ شرک لوگوں میں بہت پھیل رہا ہے اور اصل توحید نایاب۔ لیکن اکثر لوگ توحید و شرک کے معنی نہیں سمجھتے اور ایمان کا دعوے رکھتے ہیں، حالانکہ شرک میں گرفتار ہیں۔ سو اوّل معنی شرک و توحید کے سمجھنا چاہیے تا بُرائی اور بھلائی اُن کی قرآن و حدیث سے معلوم ہو۔ سُننا چاہیے کہ اکثر لوگ پیروں کو اور پیغمبروں کو اور اماموں کو اور شہیدوں کو اور فرشتوں کو اور پریوں کو مشکل کے وقت پکارتے ہیں اور اُن سے مُرادیں مانگتے ہیں اور اُن کی مَنّتیں مانتے ہیں اور حاجت برآئی کے لیے اُن کی نذر و نیاز کرتے ہیں اور بلا کے ٹلنے کے لیے اپنے بیٹوں کو اُن کی طرف نسبت کرتے ہیں۔ کوئی اپنے بیٹے کا نام عبدالنبی رکھتا ہے، کوئی علی بخش، کوئی حسین بخش کوئی پیر بخش کوئی مدار بخش، کوئی سالار بخش، کوئی غلام محی الدین، کوئی غلام معین الدین اور اُن کے جینے کے لیے کوئی کسی کے نام کی چوٹی رکھتا ہے، کوئی کسی کے نام کی بدھی پہناتا ہے کوئی کسی کے نام کے کپڑے پہناتا ہے، کوئی کسی کے نام کی بیڑی ڈالتا ہے، کوئی کسی کے نام کے جانور کرتا ہے، کوئی مشکل کے وقت دوہائی دیتا ہے، کوئی اپنی باتوں میں کسی کے نام کی قسم کھاتا ہے، غرض کہ جو کچھ ہندو اپنے بتوں سے کرتے ہیں وہ سب کچھ یہ جھوٹے مسلمان انبیاء اور اولیاء سے اور اماموں اور شہیدوں سے اور فرشتوں اور پریوں سے کر گزرتے ہیں اور

دعویٰ مسلمانی کا کیے جاتے ہیں سبحان اللہ یہ منھ اور یہ دعوے۔ سچ فرمایا ہے اللہ صاحب نے سورۂ یوسف میں (اصل میں عربی عبارت موجود ہے لیکن ہم اُسے یہاں ترک کیے دیتے ہیں اور صرف ترجمہ پر اکتفا کرتے ہیں اور آئندہ بھی ایسا ہی کرینگے۔ تنہا) ترجمہ اور نہیں مسلمان ہیں اکثر لوگ مگر کہ شرک کرتے ہیں یعنی اکثر لوگ جو دعوے ایمان کا رکھتے ہیں سو وہ شرک میں گرفتار ہیں، پھر اگر کوئی سمجھانے والا اُن لوگوں سے کہے کہ تم دعویٰ ایمان کا رکھتے ہو اور افعال شرک کے کرتے ہو سو یہ دونوں راہیں ملائے دیتے ہو، اُس کا جواب دیتے ہیں، کہ ہم تو شرک نہیں کرتے۔ بلکہ اپنا عقیدہ انبیاؤ اولیاء کی جناب میں ظاہر کرتے ہیں۔ شرک جب ہوتا کہ ہم اُن انبیا اور اولیاء کو اور پیروں اور شہیدوں کو اللہ کے برابر سمجھتے سو یوں تو ہم نہیں سمجھتے بلکہ ہم اُن کو اللہ ہی کا بندہ جانتے ہیں اور اُسی کا مخلوق، اور یہ قدرت تصرف اُسی نے اُن کو بخشی ہے، اُس کی مرضی سے عالم میں تصرف کرتے ہیں اور اُن کا پکارنا عین اللہ ہی کا پکارنا ہے۔ اُن سے مدد مانگنی عین اُسی سے مدد مانگنی ہے اور وہ لوگ اللہ کے پیارے ہیں جو چاہیں سو کریں۔ اور اُسکی جناب میں ہمارے سفارشی ہیں اور وکیل، اُن کے ملنے سے خدا ملتا ہے اور اُن کے پکارنے سے اللہ کا قرب حاصل ہوتا ہے، اور جتنا ہم اُن کو مانتے ہیں اُتنا ہم اللہ سے نزدیک ہوتے ہیں اور اسی طرح کی خرافاتیں بکتے ہیں، اور ان باتوں کا سبب یہ ہے کہ خدا اور رسول کے کلام کو چھوڑ کر اپنی عقل کو دخل دیا اور جھوٹی کہانیوں کے پیچھے پڑے اور غلط غلط رسموں کی سند پکڑی، اور اگر اللہ ورسول کا کلام تحقیق کرتے تو سمجھ لیتے کہ پیغمبر خدا صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے بھی کافر لوگ ایسی ہی باتیں کرتے تھے۔ اللہ صاحب نے اُن کی ایک نہ مانی اور اُن پر غصہ کیا اور اُن کو جھوٹا بتایا۔ چنانچہ سورۂ یونس میں اللہ صاحب نے فرمایا ہے .... ترجمہ:- اور پوجتے ہیں ورے اللہ کے ایسی چیز کو کہ نہ کچھ فائدہ دیوے اُن کو نہ کچھ نقصان اور کہتے ہیں یہ لوگ ہمارے سفارشی ہیں اللہ کے پاس کہہ کیا بتاتے ہو تم اللہ کو جو نہیں جانتا وہ آسمانوں میں اور نہ زمین میں۔ سو وہ نرالا ہے اُن سے جنکو یہ شریک

بتاتے ہیں (فائدہ) یعنی جن کو لوگ پکارتے ہیں اُن کو اللہ تعالیٰ نے کچھ قدرت نہیں دی، نہ فائدہ پہنچانے کی نہ نقصان کر دینے کی اور یہ جو کہتے ہیں کہ یہ ہمارے سفارشی ہیں اللہ کے پاس۔ سو یہ بات اللہ نے تو نہیں بتائی۔ پھر کیا تم اللہ سے زیادہ خبردار ہو، سو اُسکو بتاتے ہو جو وہ نہیں جانتا۔ اس آیت سے معلوم ہوا کہ تمام آسمان اور زمین میں کوئی کسی کا ایسا سفارشی نہیں ہے کہ اُسکو مانے اور اُسکو پکارے تو کچھ فائدہ یا نقصان پہنچے۔ بلکہ انبیاؤ اولیاء کی سفارش جو ہے سو اللہ کے اختیار میں ہے، اُن کے پکارنے نہ پکارنے سے کچھ نہیں ہوتا اور یہ بھی معلوم ہو کہ جو کوئی کسی کو سفارشی بھی سمجھکر پوجے وہ بھی مشرک ہوتا ہے اور اللہ صاحب نے سورۂ زمر میں فرمایا ہے ...... ترجمہ۔ اور جو لوگ کہ ٹھہراتے ہیں ورے اللہ سے اور حمایتی کہتے ہیں پوجتے ہیں ہم اُن کو سو اسی لیے کہ نزدیک کر دیں ہم کو اللہ کی طرف مرتبہ میں۔ بے شک اللہ حکم کرے گا ان میں، اُس چیز میں کہ اُس میں اختلاف ڈالتے ہیں۔ بے شک اللہ راہ نہیں دیتا جھوٹے ناشکرے کو (فائدہ) یعنی جو بات سچی تھی کہ اللہ بندے کی طرف سب سے زیادہ نزدیک ہے۔ سو اُس کو چھوڑ کر جھوٹی بات بنائی کہ اوروں کو حمایتی ٹھہرایا اور یہ جو اللہ کی نعمت تھی کہ وہ محض اپنے فضل سے بغیر واسطے کسی کے سب مرادیں پوری کرتا ہے اور سب بلائیں ٹال دیتا ہے سو اُس کا حق نہ پہچانا اور اُسکا شکر نہ ادا کیا، بلکہ یہ بات اوروں سے چاہنے لگے۔ پھر اُس اُلٹی راہ میں اللہ کی نزدیکی ڈھونڈتے ہیں، سو اللہ ہرگز اُن کو راہ نہیں دیگا اور اس راہ سے ہرگز اُس کی نزدیکی نہ پاویں گے۔ بلکہ جوں جوں اس راہ میں چلیں گے اُس سے دور ہو جاویں گے۔ اس آیت سے معلوم ہوا کہ جو کوئی کسی کو اپنا حمایتی سمجھے گو کہ یہی جانکر کہ اُسکے پوجنے کے سبب سے خدا کی نزدیکی حاصل ہوتی ہے، سو وہ بھی مشرک ہے، اور جھوٹا اور اللہ کا ناشکرا اور اللہ صاحب نے سورۂ مومنون میں فرمایا ہے .... ترجمہ:۔ کہہ کون ہے وہ شخص کہ اُس کے ہاتھ میں ہے تصرف ہر چیز کا اور وہ حمایت کرتا ہے اور اُس کے مقابل کوئی حمایت نہیں کر سکتا۔ جو تم جانتے ہو سو وہ بھی کہدینگے کہ

اللہ ہے۔ کہہ پھر کہاں سے خبطی ہو جاتے ہو۔ (فائدہ) یعنی جب کافروں سے بھی پوچھئے کہ سارے عالم میں تصرف کس کا ہے اور اس کے مقابل کوئی حمایتی کھڑا ہو سکے تو وہ بھی یہی کہیں گے کہ یہ اللہ ہی کی شان ہے، پھر اوروں کو ماننا محض خبط ہے۔ (فائدہ) اس آیت سے معلوم ہوا کہ اللہ صاحب نے کسی کو عالم میں تصرف کرنے کی قدرت نہیں دی اور کوئی کسی کی حمایت نہیں کر سکتا۔ اور یہ بھی معلوم ہو کہ پیغمبر خدا کے وقت میں کافر بھی اپنے بتوں کو اللہ کے برابر نہیں جانتے تھے بلکہ اسی کا مخلوق اور اسی کا بندہ سمجھتے تھے، اور ان کو اس کے مقابل کی طاقت ثابت نہیں کرتے تھے۔ مگر یہی پکارنا اور منتیں ماننی اور نذر و نیاز کرنی اور ان کو اپنا وکیل اور سفارشی سمجھنا یہی ان کا کفر و شرک تھا۔ سو جو کوئی کسی سے یہ معاملہ کرے گو کہ اسکو اللہ کا بندہ و مخلوق ہی سمجھے، سو ابوجہل اور وہ شرک میں برابر ہے، سو سمجھنا چاہیے کہ شرک اسی پر موقوف نہیں کہ کسی کو اللہ کے برابر سمجھے اور اس کے مقابل جانے بلکہ شرک کے معنی یہ کہ جو چیزیں اللہ نے اپنے واسطے خاص کی ہیں اور اپنے بندوں کے ذمہ نشان بندگی کے ٹھہرائے ہیں وہ چیزیں اور کسی کے واسطے کرنی جیسے سجدہ کرنا اور اس کے نام کا جانور کرنا اور اسکی منت ماننی اور مشکل کے وقت پکارنا اور ہر جگہ حاضر و ناظر سمجھنا اور قدرت تصرف کی ثابت کرنی سو ان باتوں سے شرک ثابت ہو جاتا ہے گو کہ پھر اللہ سے چھوٹا ہی سمجھے اور اسی کا مخلوق اور اسی کا بندہ، اور اس بات میں اولیاؤ انبیا میں اور جن و شیطان میں اور بھوت و پری میں کچھ فرق نہیں یعنی جس سے کوئی یہ معاملہ کرے گا وہ مشرک ہو جاویگا خواہ انبیاؤ اولیاء سے خواہ پیروں و شہیدوں سے، خواہ بھوت و پری سے۔ چنانچہ اللہ صاحب نے جیسا بت پوجنے والوں پر غصہ کیا ہے ویسا ہی یہود اور نصاریٰ پر حالانکہ وہ اولیاء و انبیاء سے معاملہ کرتے تھے۔

نہال چند لاہوری

حالات آپ کا مولد شاہجہان آباد (دہلی) ہے لیکن معلوم ہوتا ہے کہ آپ ترک وطن کرکے لاہور میں اقامت گزیں ہو گئے ہیں، اسی وجہ سے آپ اپنے آپ کو لاہوری لکھتے ہیں ڈاکٹر جان گلکرائسٹ کے ماتحت جو شعبۂ تصنیف و تالیف کلکتہ میں قائم ہوا تھا۔ آپ بھی وہاں پہنچے اور ایک قصہ کو جو فارسی زبان میں تھا اُردو میں ترجمہ کیا اور اُسکا نام مذہب عشق معروف بہ گل بکاؤلی رکھا۔ مذہب عشق تاریخی نام ہے جسکے اعداد (۱۲۱۷) ہوتے ہیں۔ پس یہ کتاب ۱۲۱۷ھ ہجری میں ترجمہ ہو کر اختتام کو پہنچی، فارسی میں اِس قصہ کو شیخ عزت اللہ بنگالی نے لکھا تھا۔ جو غرۂ ذی الحجہ ۱۱۳۴ھ ہجری میں فوت ہوا۔ یہ قصہ اب تک تین جون بدل چکا ہے پہلے فارسی تھا۔ نہال چند لاہوری نے اسکو اُردو نثر کیا۔ اس کے بعد پنڈت دیاشنکر نسیم نے اس کو نظم اُردو کا لباس پہنایا۔ اور یہ مثنوی گلزار نسیم مقبول خاص و عام ہوئی۔ زیادہ تر لوگ اسکو نظم ہی میں پڑھتے ہیں، اگرچہ نثر کا قصہ بھی سوا سو برس پُرانا ہوگیا ہے تاہم برابر چھپے جاتا ہے اور بازار میں فروخت ہوتا ہے۔ مترجم کے حالات کا پتہ اِس سے زیادہ نہیں ملتا جو وہ خود اپنی کتاب مذہب عشق کے ابتدائی صفحات میں (دو چار سطریں) لکھ گئے ہیں۔ چنانچہ وہ سبب تالیف میں لکھتے ہیں:۔

"اشرف البلاد کلکتہ میں آب و خورش کھینچکر لائی اور یہ خاکسار کپتان ولورٹ صاحب بہادر کی خدمت میں سابق سے بندگی رکھتا تھا۔ اُن کی دستگیری سے صاحب گلکرائسٹ بہادر مدظلہ کے دامنِ دولت تک دسترس پایا۔ غرضکہ صاحب بہادر کے تفضلات سے بخوبی اس ضعیف کی اوقات بسر ہونے لگی اور امید زیادہ تر ہونے لگی کہ اگر بخت مددگار رہے اور یہ دامنِ دولت اپنے ہاتھ سے تو حشمت قدم کے ساتھ ہے۔ پھر ایک روز خداوندِ نعمت نے ارشاد کیا کہ تاج الملوک اور بکاؤلی کا قصہ فارسی میں ہے، ہندی ریختہ کے محاورہ میں ترجمہ کر کہ تیری یادگار اور سرخروئی کا موجب اور ہماری خوشنودی کا سبب ہو چنانچہ اس نحیف نے حسب الارشاد فیض بنیاد اپنے

حوصلے کے موافق فلاطوں فطنت .... مارکوئس ولزلی کے عہد میں ترجمہ کیا اور نام اسکا مذہب عشق رکھا"

کتاب کے آخر میں یہ تین شعر درج کیے ہیں، پہلا شعر خاتمۃ الکتاب سمجھنا چاہیئے اور بقیہ دو شعر قطعۂ تاریخی خیال کرنے چاہئیں۔

غرض جس طرح سے کیا اُن کو شاد ۔۔۔ ہماری بھی دے یا الٰہی مُراد

یہ قصہ ہوا جب بخوبی تمام ۔۔۔ تو پھر فکرِ تاریخ تھی صبح و شام

یکایک سُنی میں نے آوازِ غیب ۔۔۔ کہ ہے مذہبِ عشق تاریخی نام

ان اشعار سے معلوم ہوتا ہے کہ کبھی کبھی آپ فکرِ سخن بھی کر لیتے تھے، اگرچہ اس فن میں آپ مبتدی معلوم ہوتے ہیں، البتہ نثر آپ خوب لکھتے ہیں۔ نمونہ حسبِ ذیل ہے۔ میر شیر علی افسوس کی اصلاح کے بعد یہ ترجمہ چھپا ہے۔

نمونہ از مذہبِ عشق "معمارِ سرائے کارخانۂ سخن اس داستان کی بنا کا حال اس طرح کہتا ہے کہ تاج الملوک کے غلاموں میں ساعد تمام اُس بیابان میں سیر کرتا پھرتا تھا، ناگاہ اُس کی نظر گئی، لکڑہاروں پر کہ لکڑیوں کے بوجھ لیے جاتے تھے جا پڑی، اُس نے پوچھا کہ تم کون ہو اور یہ لکڑیاں کہاں لیے جاتے ہو۔ انھوں نے جواب دیا کہ ہم شہرِ شرفستان کے لکڑہارے ہیں۔ یہی ہمارا کسب ہے اسی سے ہمارے لڑکے بالے جیتے ہیں، دانہ پانی کھاتے پیتے ہیں، اُس نے کہا کہ آج تم یہ گٹھے میرے آقا کے باورچی خانہ میں لے چلو، دولت خانہ اُسکا نزدیک ہے، اُس نے اس ویرانہ میں ایک شہر آباد کیا ہے۔ واجبی قیمت ملیگی بلکہ ایسا انعام پاؤگے کہ پھر کہیں اور لکڑیاں بیچنے نہ جاؤگے اُنھوں نے کہا کہ ہماری تمام عمر اسی کام میں اور اسی بیابان سے لکڑیاں لیجاتے گزرتی ہے، لیکن آبادی کا یہاں نشان نہ دیکھا، نہ سُنا۔ ساعد نے کہا ذرا تم آگے بڑھکر دیکھو، اگر میرے کہنے کا کچھ اثر ظاہر ہو تو بہتر نہیں تو تمہارے پھر آنے کا کوئی مانع نہ ہوگا۔ لکڑہارے انعام کے لالچ سے ساعد کے آگے ہو لیے۔ پھر تھوڑی ہی دور جاکر، سب ایکبارگی پکار اُٹھے کہ نعوذ باللہ من الشیطان الرجیم

اے میاں! تم ہم کو آگ میں جھونکنے کو لیے جاتے ہو۔ چولہے میں جائے انعام اور بھاڑ میں پڑے اکرام۔ بس ہمیں معاف کرو، ہم نے بھر پایا۔ ساعد نے کہا یہ شعلۂ آتش نہیں، حویلی کے جواہرات چمک رہے ہیں، تم ہرگز اندیشہ نہ کرو اور میرے ساتھ چلے آؤ، وہ اُس کے کہنے سے کچھ اور بھی بڑھے۔ آگے ساری زمین سونے کی نظر آئی۔ سب نے اُسکی بات سچی پائی، قدم اُٹھائے بدھڑک چلے۔ آخر وہ حضور میں اُن کو لے گیا۔ تاج الملوک نے ایک ایک تھان بیش قیمت ہر ایک کو دیکر رخصت کیا اور فرمایا کہ اگر تم یہاں آیا کرو تو اس سے دونا ہر روز پایا کرو، لکڑہاروں نے جب پہلے دن ایسا انعام پایا اور آئندہ کی بھی اُمید بندھی تو اپنا وطن چھوڑ کر ہر ایک وہاں آرہا یہ خبر اُن کے ہمسایہ میں پھیلی اور جابجا مشتہر ہوئی۔ غرض جو کوئی شہر کے دیکھنے کو جاتا۔ ہرگز وہاں سے پھر کر گھر نہ آتا اور وہیں رہتا، کوتوال شہر فتان کا رعیت کے بھاگنے کی خبر روز وزیر کے حضور میں کہتا چنانچہ ایک دن اُس نے خبر دی کہ آج رات ہزار گھر اہلِ حرفہ کے خالی ہوئے اور وہ بھاگ گئے، وزیر نے کہا کہ کچھ یہ بھی تو جانتا ہے کہ کہاں جاتے ہیں۔ تب وہ بولا کہ غلام نے سُنا ہے کہ کسی نے درندوں کے جنگل میں دس کوس تک سونے کی زمین بنا کر اُس پر اس طرح کا شہر آباد کیا ہے اور ایک قصر اور باغ بھی جواہر کا ایسا بنایا ہے کہ روئے زمین پر ویسا دوسرا نہیں ہے۔ جو دیکھتا ہے یہ مطلع پڑھتا ہے ؎

اگر فردوس بر روئے زمین ست
ہمین ست و ہمین ست و ہمین ست

میرزا کاظم علی جوان

آپ کا نام کاظم علی اور جوان تخلص ہے۔ آپ بھی دہلی کے تھے۔ بعد ازاں لکھنؤ میں آئے اور وہاں سے سنہ ۱۸۰۰ء میں کلکتہ کے فورٹ ولیم کالج میں آئے۔ آپ نے سنہ ۱۸۰۲ء میں شکنتلا کا قصہ اُردو میں لکھا اور اُسکا نام شکنتلا ناٹک رکھا۔ یہ کتاب سنہ ۱۸۰۲ء میں چھپکر

شائع ہوئی۔ نواز یشٌ نے جو برج بھاکا میں (۱۷۱۶ء) شکنتلا کی کہانی لکھی تھی اُس کا یہ ترجمہ ہے۔ آپ نے ایک بارہ ماسہ بھی لکھا ہے، اور اس میں ہندو مسلمانوں کے تیوہاروں کا ذکر ہے، جس کا نام دستور ہند ہے اور جو ۱۸۱۲ء میں چھپا۔ افسوس ہے آپ کی دونوں کتابیں دستیاب نہیں ہوئیں، لہذا نمونہ پیش کرنے سے معذوری ہے۔ جوان نے تاریخ فرشتہ سے خاندان بہمنی کا ترجمہ بھی ہندوستانی میں کیا (۱۸۰۹ء) نیز للولال کی شرکت میں سنگھاسن بتیسی کا ترجمہ ہندوستانی زبان میں کیا (۱۸۰۵ء)*



سری للولال کوی

سری للولال کوی گجرات کا برہمن تھا جو شمالی ہند میں آکر آباد ہو گیا تھا، اُس نے فورٹ ولیم کالج کی نگرانی میں ہندی کی بعض کتابیں مثلاً پریم ساگر، راج نیتی ولطائف ہندی ترجمہ یا تالیف کیں۔ سنگھاسن بتیسی، سری للولال اور کاظم علی جوان نے ملکر ۱۸۰۱ء میں لکھی، جو آدھی اُردو آدھی ہندی ہے۔

پریم ساگر بازار میں فروخت ہوتی ہے۔ لیکن سری للولال کی اصل کتاب نہیں ملتی، منشی نولکشور کے مطبع سے آجکل کی زبان میں شائع ہوئی ہے۔ لہذا اُس کا اقتباس اصل کتاب کا اقتباس نہیں کہلایا جا سکتا۔ اس لیے ہم نے موجودہ پریم ساگر کا نمونہ نہیں دیا۔ کیونکہ وہ ہمارے مقصد کے اظہار میں کوئی مدد نہیں دے سکتا۔

سری للولال نے فصیح ہندی نثر کی بنیاد ڈالی اور متعدد کتابیں لکھیں اور فی الحقیقت ہندی نثر کے حق میں مسیحائی کی۔ اگرچہ آپ کا سارا کام ہندی نثر سے متعلق ہے لیکن یہاں آپ کا ذکر اس وجہ سے کیا گیا کہ ہندی سے جو بعض ترجمے اُردو میں ہوئے اُن میں آپ نے مدد دی۔ مثلاً شکنتلا ناٹک میں مرزا کاظم علی جوان کو آپ سے مدد ملی۔ اسی طرح مظہر علی ولا اور آپ نے مل کر

بیتال پچیسی لکھی جس کی زبان اُردو ہندی کا خوبصورت میں ہے۔ نیز آپ نے ولا کو برج بھاشا سے مادھونل کے قصے کے ترجمے اور تالیف میں بہت مدد دی۔ آپ نے لطائف ہندی جس کا ذکر اوپر کیا گیا مرتب کی، اُس میں پُرلطف قصے کہانیاں، لطیفے، امثال، ضلع جگت وغیرہ درج ہیں، یہ کتاب ہندوستانی اور ہندی دونوں زبان میں ہے۔ کتاب کے آخر میں ہندوستانی انگریزی الفاظ کی فرہنگ بھی ہے (سنہ ۱۸۱۰ء) +



مولوی اکرام علی

حالات آپ نے سنہ ۱۸۱۰ء میں رسائل اخوان الصفا میں سے ایک رسالہ کا ترجمہ عربی سے اُردو میں کیا جس میں شاہِ اجنہ کے سامنے انسان وحیوان کا جھگڑا درپیش ہے کہ ہم دونوں میں کون افضل ہے، یہ منجملہ اُن رسائل کے ہے جو بصرہ کی مشہور سوسائٹی اخوان الصفا کے اہتمام سے لکھے گئے تھے، آپ کلکتہ مولوی تراب علی صاحب اپنے بھائی کی طلبی پر گئے تھے اور وہاں مسٹر ابراہیم لاکٹ نے فورٹ ولیم کالج میں ملازم کرا دیا تھا۔ چنانچہ کپتان جان ولیم ٹیلر کے ایماء سے رسالہ مذکور کا ترجمہ کیا۔ کتاب کے دیباچہ میں لکھتے ہیں:- " فرمایا کہ رسالہ اخوان الصفا کہ انسان و بہائم کے مناظرے میں ہے تو اس کا زبانِ اُردو میں ترجمہ کر لیکن نہایت سلیس کہ الفاظ مغلق اُسمیں نہ ہو دیں بلکہ اصطلاحات علمی اور خطبے بھی اُس کے کہ تکلف سے خالی نہیں ہیں قلم انداز کر صرف خلاصہ مضمون مناظرے کا چاہیے۔ راقم نے بموجب فرمانے کے فقط حاصلِ مطلب کو محاورہ اُردو میں لکھا، خطبوں کو نکال ڈالا اور اکثر اصطلاحاتِ علمی کہ مناظرے سے اُن کو علاقہ نہ تھا ترک کیں مگر بعضے خطبے اور اصطلاحات ہندی وغیرہ کہ اصل مطلب سے متعلق تھے باقی رکھے .... مصنفین اس کے ابوسلیمان، ابوالحسن، ابواحمد وغیرہ دس آدمی باتفاق یکدیگر بصرے میں رہتے تھے اور ہمیشہ علم و دین کی تحقیق میں اوقات اپنی بسر کرتے چنانچہ

اکاون رسالے تصنیف کیے بیشتر علوم عجیبہ وغریبہ اُن میں لکھے - یہ ایک رسالہ اُن میں سے انسانوں اور حیوانوں کے مناظرے میں ہے طرفین کی دلائل عقلی ونقلی اس میں بخوبی بیان کیں آخر بہت قیل وقال کے بعد انسان کو غالب رکھا، اور غرض انکو اس مناظرے سے فقط کمالات انسانی بیان کرنا ہے - چنانچہ اس رسالہ کے آخر میں لکھا ہے کہ جن وصفوں میں انسان حیوان پر غالب آئے وہ علوم معارف الٰہی ہیں کہ اُن کو ہمنے اکاون رسالے میں بیان کیا ہے اور اس رسالہ میں مقصود یہی تھا کہ حقائق ومعارف حیوانات کی زبانی بیان کیجیے تاکہ غافلوں کو اس کے دیکھنے سے کمالات حاصل کرنے کے واسطے رغبت ہو، ترجمہ اس رسالے کا .... نواب گورنر جنرل لارڈ منٹو بہادر دام اقبالہٗ کے عہد حکومت میں کہ ۱۲۲۵ھ ہجری اور ۱۸۱۰ء میں مرتب ہوا۔"

رسالۂ اخوان الصفا پیرزادے رسالۂ اخوان الصفا جو ہمیں نہایت جستجو اور تلاش کے بعد دستیاب ہوا اور ہمارے پیش نظر ہے ۱۸۶۱ء میں مطبع منشی نولکشور سے شائع ہوا تھا غالباً اب عرصہ سے یہ کتاب چھپنی بند ہوگئی ہے - یہی وجہ ہے کہ دہلی اور لکھنؤ کے کتب فروش اس کتاب کا نام سُنکر کانوں پر ہاتھ دھرتے ہیں خیر ہم اپنے ایک دوست کے ممنون ہیں جن کی کوشش سے یہ رسالہ ہمیں مل گیا مضمون نہایت دلچسپ ہے - ایکبار پڑھنا شروع کیجیے تو بغیر ختم کیے کتاب کو چھوڑنا مشکل ہو جاتا ہے، عبارت بھی صاف اور سلیس ہے جیسا کہ دیباچہ میں خود مترجم نے کہا ہے مغلق اور غریب الفاظ سے پرہیز کیا گیا ہے - کتاب عام فہم ہے، اور اس قابل ہے کہ دوبارہ چھپے اور ملک کے ہر گوشہ میں اس کے مضمون سے لوگ استفادہ حاصل کریں -

ذیل میں چند صفحات بطور نمونہ نقل کیے جاتے ہیں :-

فصل مکھیوں کے سردار کے احوال میں

نمونہ از رسالۂ اخوان الصفا "انسان جس وقت اپنے کلام سے فارغ ہوا، بادشاہ نے حیوانوں کی طرف خیال کیا، ناگاہ ایک بھنبھن آواز کان میں پہنچی - دیکھا تو مکھیوں کا سردار یعسوب سامنے اُڑتا اور خدا کی تسبیح وتہلیل میں نغمہ سرائی کرتا ہے، پوچھا تو کون ہے؟ اُس نے کہا میں حشرات الارض

کا بادشاہ ہوں۔ فرمایا تو آپ کیوں آیا جس طرح اور حیوانوں نے اپنے قاصد اور وکیل بھیجے، تو نے اپنی رعیت اور فوج سے کسی کو کیوں نہ بھیجا۔ اُس نے کہا میں نے اُن کے حال پر شفقت اور مہربانی کی تاکہ کسی کو کچھ تکلیف نہ پہنچے۔ بادشاہ نے کہا یہ وصف اور کسی حیوان میں نہیں ہے۔ تجھ میں کیونکر ہوا؟ کہا مجھکو اللہ تعالیٰ نے اپنی عنایت و مرحمت سے یہ وصف عطا کیا۔ اس کے سوا اور بھی بہت سی بزرگیاں اور خوبیاں بخشی ہیں۔ بادشاہ نے کہا بزرگیاں اپنی بیان کر کہ ہم بھی معلوم کریں۔ اُس نے کہا اللہ تعالیٰ نے مجھکو اور میرے جدّ و آبا کو بہت سی نعمتیں بخشیں، کسی حیوان کو اس میں شریک نہیں کیا چنانچہ ملک و نبوت کا مرتبہ ہمکو بخشا اور ہمارے جدّ و آبا کو نسل در نسل اس کا ورثہ پہنچایا۔ یہ دو نعمتیں اور کسی حیوان کو نہیں دیں۔ اس کے سوا اللہ تعالیٰ نے ہم کو علم ہندسہ اور بہت سی نعمتیں سکھائیں کہ اپنے مکانوں کو نہایت خوبی سے بناتے ہیں، تمام جہان کے پھل اور پھول ہم پر حلال کیے۔ بے خلش کھاتے ہیں، ہمارے لعاب سے شہد پیدا کیا کہ جس سے تمام انسانوں کو شفا حاصل ہوتی ہے، اس مرتبے پر ہمارے آیاتِ قرآنی ناطق ہیں اور ہماری صورت و سیرت اللہ تعالیٰ کی صنعت و قدرت پر عاقلوں کے واسطے دلیل ہے کیونکہ خلقت ہماری نہایت لطیف ہے اور صورت بہت عجیب ہے اس واسطے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمارے جسم میں تین جوڑ رکھے ہیں، بیچ کے جوڑ کو مربع کیا، نیچے کے دھڑ کو لمبا، سر کو مدور بنایا۔ چار ہاتھ پاؤں مانند اضلاع شکل مسدس کے نہایت خوبی سے، مناسب مقدار کے بنائے جنکے سبب نشست و برخاست کرتے ہیں اور گھر اپنے اس خوش اسلوبی سے بناتے ہیں کہ ہوا اُن میں ہرگز نہیں جا سکتی کہ جس کے باعث ہم کو یا ہمارے بچّوں کو تکلیف پہنچے، ہاتھ پاؤں کی قوت سے درخت کے پھل، پتے پھول جو کچھ پاتے ہیں اپنے مکانوں میں جمع کر رکھتے ہیں۔ شانوں پر چار بازو بنائے جن کے باعث اُڑتے ہیں، اور ہمارے ڈنک میں کچھ زہر بھی پیدا کیا ہے کہ اس کے سبب دشمنوں کے شر سے محفوظ رہتے ہیں اور گردن پتلی بنائی کہ داہنے بائیں سر کو بخوبی پھیرتے ہیں۔ اور اُس کے دونوں طرف دو آنکھیں روشن عطا کی ہیں کہ اُن کی روشنی سے ہر ایک چیز کو دیکھتے ہیں اور منھ بھی بنایا ہے کہ جس سے کھانے کی

لذت جانتے ہیں۔ دو ہونٹھ بھی دیے جن کے سبب کھانے کی چیزیں جمع کرتے ہیں اور ہمارے پیٹ میں قوت ہاضمہ ایسی بخشی ہے کہ وہ رطوبات کو شہد کر دیتی ہے اور یہی شہد واسطے ہمارے اور اولاد کے غذا ہے جس طرح چار پاؤں کی پستان میں قوت دی ہے کہ اُس کے سبب خون مستحیل ہو کر دودھ ہو جاتا ہے۔ غرضکہ یہ نعمتیں اللہ تعالیٰ نے ہم کو عطا کی ہیں، اس کا شکر کہاں تک کریں اسی واسطے میں نے رعیت کے حال پر شفقت و مہربانی کر کے اپنے اوپر تکلیف روا رکھی، اُن میں سے کسی کو نہ بھیجا جس وقت یعسوب اپنے کلام سے فارغ ہوا۔ بادشاہ نے کہا آفرین۔ تو نہایت فصیح و بلیغ ہے۔ سچ ہے کہ تیرے سوا یہ نعمتیں اللہ تعالیٰ نے کسی حیوان کو نہیں بخشیں۔ بعد اس کے پوچھا کہ تیری رعیت و سپاہ کہاں ہے۔ اُس نے کہا، ٹیلے، پہاڑ درخت پر جہاں سایہ پاتے ہیں رہتے ہیں اور بعضے آدمیوں کے ملک میں جا کر اُن کے گھروں میں سکونت اختیار کرتے ہیں۔ بادشاہ نے پوچھا اُن کے ہاتھ سے کیونکر سلامت رہتے ہیں کہا بیشتر اُن سے چھپ کر اپنے تئیں بچاتے ہیں مگر کبھی جو وہ قابو پاتے ہیں تکلیف دیتے ہیں بلکہ اکثر چھتوں کو توڑ کر بچوں کو مار ڈالتے ہیں۔ اور شہد نکال کر آپس میں کھا لیتے ہیں۔ بادشاہ نے پوچھا پھر تم اس ظلم پر اُن کے کیوں صبر کرتے ہو، اُس نے کہا ہم یہ ظلم سب اپنے اوپر گوارا کرتے ہیں اور کبھی عاجز ہو کر اُن کے ملک سے نکل جاتے ہیں۔ اُس وقت وہ صلح کے واسطے بہت خیلے پیش کرتے ہیں، طرح طرح کی سوغات، عطر و خوشبو وغیرہ بھیجتے ہیں طبل اور دف بجاتے ہیں۔ غرضکہ انواع و اقسام کے تحفے تحائف دیکر ہم کو راضی کرتے ہیں۔ ہمارے مزاج میں شر و فساد نہیں ہے۔ ہم بھی اُن سے صلح کر لیتے ہیں۔ اُن کے یہاں پھر چلے آتے ہیں جس پر بھی وہ ہم سے راضی نہیں ہیں۔ بغیر دلیل و حجت کے دعوے کرتے ہیں کہ ہم مالک یہ غلام ہیں۔

فصل جنوں کی اپنے بادشاہوں اور سرداروں کی اطاعت کے بیان میں

بعد اسکے یعسوب نے بادشاہ سے پوچھا کہ تم اپنے بادشاہ و رئیس کی اطاعت کس طرح کرتے ہیں اس احوال کو بیان کیجئے۔ بادشاہ نے کہا، یہ سب اپنے سردار کی اطاعت و فرمانبرداری بخوبی کرتے ہیں، اور بادشاہ جو حکم کرتا ہے، اُسکو بجا لاتے ہیں یعسوب نے کہا، اس کو مفصل بیان کیجیے۔ بادشاہ نے

کہا جنوں کی قوم میں نیک و بد اور مسلمان و کافر ہوتے ہیں جس طرح انسانوں میں ہیں، جو کہ نیک ہیں وہ اپنے رئیس کی اطاعت و فرمانبرداری اس قدر کرتے ہیں کہ آدمیوں سے بھی نہیں ہو سکتی اس واسطے کہ اطاعت و فرمانبرداری جنات کی مثل ستاروں کے ہے، آفتاب ان میں بمنزلۂ بادشاہ ہے اور سب ستارے بجائے فوج و رعیت کے ہیں۔ چنانچہ مریخ سپہ سالار، مشتری قاضی، زحل خزانچی، عطارد وزیر، زہرہ حرم، ماہتاب ولیعہد ہے اور ستارے گویا فوج و رعیت ہیں، اس واسطے کہ سب آفتاب کے تابع ہیں۔ اُسی کی حرکت سے حرکت کرتے ہیں، وہ جو ٹھہر رہتا ہے سب متوقف ہو جاتے ہیں، اپنے معمول و حد سے تجاوز نہیں کرتے، یعسوب نے پوچھا کہ ستاروں نے یہ خوبی اطاعت و انتظام کی کہاں سے حاصل کی بادشاہ نے کہا یہ فیض اُن کو فرشتوں سے حاصل ہے کہ وہ سب اللہ تعالیٰ کی فوج ہیں اور اُسکی اطاعت کرتے ہیں یعسوب نے کہا فرشتوں کی اطاعت کس طور پر ہے، کہا جس طرح حواس خمسہ، نفسِ ناطقہ کی اطاعت کرتے ہیں، تہذیب و تادیب کے محتاج نہیں یعسوب نے کہا اسکو مفصل فرمائیے، بادشاہ نے کہا کہ حواس خمسہ نفسِ ناطقہ کے واسطے محسوسات کی دریافت معلوم کرتے ہیں۔ محتاج امر و نہی کے نہیں ہیں جس شے کے دریافت کرنے کے لیے وہ متوجہ ہوتا ہے، وہ بے تامل و بلاتاخیر اُس کو دوسری شے سے ممتاز کر کے نفسِ ناطقہ کو پہنچا دیتے ہیں، اسی طرح فرشتے خدا کی اطاعت و فرمانبرداری میں مصروف رہتے ہیں، جو حکم ہوتا ہے اُسکو فی الفور بجالاتے ہیں اور جنوں میں جو کہ بدذات اور کافر ہیں، ہر چند کہ قرار واقعی بادشاہ کی اطاعت نہیں کرتے مگر وہ بھی بدذات انسانوں سے بہتر ہیں۔ اس واسطے کہ بعضے جنوں نے باوجود کفر اور گمراہی کے حضرت سلیمانؑ کی اطاعت میں قصور نہ کیا۔ ہر چند کہ اُنہوں نے عمل کے زور سے بہت رنج و مصیبتیں پہنچائیں پر یہ اُن کی فرمانبرداری میں ثابت قدم رہے اور جو کبھی کوئی آدمی کسی ویرانے یا جنگل میں جن کے خوف سے کچھ دعا اور کلام پڑھتا ہے، جب تک اُس مکان میں رہتا ہے کسی طرح کا رنج اُس کو نہیں دیتے۔ اگر حسب اتفاق کوئی جن کسی عورت یا مرد پر مسلط ہو اور کسی عامل نے وہاں اُسکی رہائی کے واسطے جنوں کے رئیس کی حاضرات اور دعوت کی فی الفور بھاگ جاتے ہیں اسکے

سوا اُن کے حسنِ اطاعت پر یہ دلیل ہے کہ ایکبار پیغمبر آخرالزمان صلے اللہ علیہ وسلم کسی مکان میں
قرآن پڑھتے تھے، وہاں جنوں کا گزر ہوا۔ سنتے ہی سب کے سب مسلمان ہوئے اور اپنی قوم میں
جا کر کتنوں کو اسلام کی دعوت کر کے نعمتِ ایمان سے بہرہ اندوز کیا چنانچہ چند آیاتِ قرآنی اس
مقدمے پر ناطق ہیں۔ انسان ان کے بالعکس ہیں طبیعتوں میں ان کی شرک و نفاق بھرا ہے
سراسر متکبر و مغرور ہوتے ہیں۔ بیشتر اخذِ منفعت کے واسطے طریقِ ہدایت سے منحرف ہو کر
مشرک و مرتد ہو جاتے ہیں ہمیشہ روئے زمین پر قتال و جدال میں مصروف رہتے ہیں بلکہ اپنے
پیغمبروں کی بھی اطاعت نہیں کرتے، باوجود معجزے اور کرامت کے صاف منکر ہو جاتے ہیں۔ اگر
کبھی ظاہر میں اطاعت کرتے ہیں، پر دل اُن کا شرک و نفاق سے خالی نہیں ہے۔ از بسکہ جاہل
و گمراہ ہیں، کسی بات کو نہیں سمجھتے جس پر بھی یہ دعوٰے ہے کہ ہم مالک اور سب ہمارے غلام ہیں۔
انسانوں نے جو دیکھا کہ بادشاہ مکھیوں کے رئیس سے ہمکلام ہو رہا ہے، کہنے لگے نہایت تعجب ہے،
کہ بادشاہ کے نزدیک حشرات الارض کے رئیس کا یہ رتبہ ہے کہ کسی حیوان کا نہیں جنوں کی
قوم سے ایک حکیم نے کہا۔ اس بات کا تم تعجب نہ کرو اس واسطے کہ یعسوب مکھیوں کا سردار
اگرچہ جسم میں چھوٹا او منحنی ہے لیکن نہایت عاقل و دانا اور تمام حشرات الارض کا رئیس و خطیب ہے
جتنے حیوان ہیں سب کو ریاست و سلطنت کے احکام تعلیم کرتا ہے اور بادشاہوں کا یہی معمول
ہے کہ اپنے ہمجنسوں سے جو کہ سلطنت و ریاست میں شریک ہیں ہمکلام ہوتے ہیں اگرچہ وہ
شکل و صورت میں مخالف ہوویں۔ یہ خیال اپنے دل میں نہ لاؤ کہ بادشاہ کسی غرض و مطلب
کے واسطے ان کی طرفداری و رعایت کرتا ہے۔ القصہ بادشاہ نے انسانوں کی طرف متوجہ ہو کر
کہا کہ حیوانوں نے تمہارے ظلم کا جو کچھ شکوہ بیان کیا سب تم نے سُنا اور تم نے جو دعوٰے کیا
اس کا بھی جواب انہوں نے دیا اب جو کچھ تم کو کہنا باقی ہو اُسکو بیان کرو۔ آدمیوں کے وکیل
نے کہا کہ ہم میں بہت خوبیاں اور بزرگیاں ہیں کہ وہ ہمارے صدقِ دعویٰ پر دلالت کرتی
ہیں۔ بادشاہ نے کہا اُنہیں بیان کرو۔ رومی نے کہا کہ ہم بہت سے علوم اور صنعتیں جانتے ہیں،

دانائی اور تدبیریں سب حیوانوں سے غالب ہیں۔ دنیا اور آخرت کے امور بخوبی سرانجام کرتے ہیں، اس سے یہ معلوم ہوا کہ ہم مالک اور حیوان ہمارے غلام ہیں۔ بادشاہ نے حیوانوں سے کہا، اس نے جو اپنی فضیلتیں بیان کیں تم اس کا جواب کیا دیتے ہو۔ حیوانوں کی جماعت نے یہ بات سن کر سر جھکا لیا، کسی نے کچھ جواب نہ دیا۔ مگر بعد ایک گھڑی کے مکھیوں کے وکیل نے کہا کہ یہ آدمی گمان کرتا ہے کہ ہم بہت علوم اور تدبیریں جانتے ہیں جسکے سبب ہم مالک اور حیوان ہمارے غلام ہیں، اگر آدمی فکر و تامل کریں تو معلوم ہو کہ ہم اپنے امور میں کس طور پر انتظام و بند و بست کرتے ہیں۔ دانائی و فکر میں ان سے غالب ہیں، علم ہندسہ میں ایسا یہ مہارت رکھتے ہیں کہ بغیر مسطر اور پرکار کے انواع و اقسام کے دائرے اور شکلیں مثلث اور مربع کھینچتے ہیں، اپنے گھروں میں طرح طرح کے زاویے بناتے ہیں۔ سلطنت و ریاست کے قاعدے آدمیوں نے بھی ہم سے سیکھے، اس واسطے کہ ہم اپنے یہاں دربان اور چوکیدار متعین کرتے ہیں کہ ہمارے بادشاہ کے سامنے بغیر حکم کے کوئی آنے نہیں پاتا۔ درختوں کے پتوں سے شہد نکال کر جمع کرتے ہیں اور فراغت سے اپنے گھروں میں بیٹھکر بال بچوں کے ساتھ کھاتے ہیں، جو کچھ ہمارا جھوٹا بچ رہتا ہے، یہ سب آدمی اُسکو نکال کر اپنے تصرف میں لاتے ہیں۔ یہ ہنر ہم کو کسی نے تعلیم نہیں کیے مگر اللہ کی طرف سے ہم کو الہام ہوتا ہے کہ بغیر مدد اور اعانت اُستاد کے ہم اتنے ہنر جانتے ہیں، اگر انسانوں کو یہ گھمنڈ ہے کہ ہم مالک اور حیوان ہمارے غلام ہیں تو ہمارا جھوٹا کیوں کھاتے ہیں۔ بادشاہوں کا یہ طریق نہیں ہے کہ غلاموں کا جھوٹا کھاویں اور یہ اکثر امور میں ہمارے محتاج رہتے ہیں، ہم کسی امر میں ان سے احتیاج نہیں رکھتے۔ پس یہ دعوے بے دلیل ان کو نہیں پہنچتا ہے۔ اگر چیونٹی کے احوال پر یہ آدمی نگاہ کرے کہ باوجود چھوٹے جسم کے کیونکر زمین کے نیچے طرح طرح کے مکان پیچدار بناتی ہے، کیسی ہی سیلابی ہو پانی اُن میں ہرگز نہیں جاتا۔ اور کھانے کے لیے غلہ جمع رکھتی ہے، اگر کبھی اُس میں سے کچھ بھیگ جاتا ہے نکالکر دھوپ میں سکھاتی ہے جن دانوں میں احتمال جمنے کا ہوتا ہے اُن کے چھلکے دور کر کے دو ٹکڑے کر ڈالتی

ہے۔ گرمیوں میں بہت چیونٹیاں قافلے کے قافلے جمع ہوکر قوت کے واسطے ہر ایک طرف جاتی ہیں۔ اگر کسی چیونٹی کو کہیں کچھ نظر آیا اور گرانی کے سبب اُٹھ نہ سکا۔ تھوڑا اُس میں سے لیکر اپنے مجمع میں آکر خبر کرتی ہے، اُن میں جو آگے بڑھتی ہے وہ اُس چیز سے کچھ تھوڑا پہچان کے واسطے لیکر وہاں جا پہنچتی ہے۔ پھر سب جمع ہوکر کس محنت و مشقت سے اُسکو اُٹھا لاتی ہیں۔ اگر کسی چیونٹی نے محنت میں سستی کی اُسکو مار کر نکال دیتی ہیں۔ پس اگر یہ آدمی تامل کرے تو معلوم ہو کہ چیونٹیاں کیسا علم و شعور رکھتی ہیں۔ اسی طرح ٹڈی جبکہ فصلِ ربیع میں کھا پی کر موٹی ہوتی ہے کسی نرم زمین میں جاکر گڑھا کھود کر انڈا دیتی ہے اور اُسکو مٹی سے چھپا کر آپ اُڑ جاتی ہے، جب اُسکی موت کا وقت آتا ہے طائر کھا جاتے ہیں یا گرمی سردی کی کثرت سے آپ ہلاک ہو جاتی ہے، دوسرے برس پھر فصلِ ربیع میں جن دنوں ہوا معتدل ہوتی ہے اُس انڈے سے ایک چھوٹا بچہ کیڑے کی مانند پیدا ہوکر زمین پر چلتا اور گھاس چرتا ہے جس وقت پر اُس کے نکلتے ہیں اور کھا پی کر موٹا ہوتا ہے، یہ بھی دستور سابق انڈا دیکر زمین میں چھپا دیتا ہے۔ غرض اسی طور سال بسال بچے پیدا ہوتے ہیں۔ اسی طرح ریشم کے کیڑے کہ بیشتر پہاڑوں کے درختوں پر خصوصاً توت کے درخت پر رہتے ہیں۔ ایام بہار میں جبکہ خوب موٹے ہوتے ہیں، اپنے لعاب کو درخت پر تن کر با آرام تمام اُس میں سوتے ہیں جس وقت جاگتے ہیں اُسی حال میں انڈے دیکر آپ نکل جاتے ہیں، اُن کو تو طائر کھا لیتے ہیں، یا آپ خود بخود گرمی یا سردی سے مرجاتے ہیں اور انڈے سال بھر بحفاظت اُس میں رہتے ہیں، دوسرے سال اُن میں سے بچے پیدا ہوکر درخت پر چلتے پھرتے ہیں۔ جب یہ تازے اور توانا ہوتے ہیں اسی طور پر انڈے دیکر بچے پیدا کرتے ہیں، اور بھڑیں بھی دیواروں اور درختوں پر چھتے بنا کر اُن میں انڈے بچے دیتی ہیں مگر یہ کھانے کے واسطے کچھ جمع نہیں کرتی ہیں۔ روز روز اپنی قوت ڈھونڈھ لیتی ہیں اور جاڑے کے دنوں میں غاروں یا گڑھوں میں چھپکر مرجاتی ہیں پوست اُن کا تمام جاڑوں پھر وہاں پڑا رہتا ہے، ہرگز سڑتا گلتا نہیں، پھر فصلِ ربیع میں خدا کی قدرت سے

اُن میں روح آجاتی ہے، بدستور اپنے اپنے گھر بنا کر انڈے بچے پیدا کرتی ہیں۔ غرض اسی طرح تمام حشرات الارض اپنے بچوں کو پیدا کر کے پرورش کرتے ہیں، فقط شفقت و مہربانی سے یہ نہیں کہ اُن سے کچھ خدمت کی توقع رکھتے ہیں۔ بخلاف آدمیوں کے کہ وہ اپنی اولاد سے نیکی اور احسان کے امیدوار رہتے ہیں۔ سخاوت اور جود کہ شیوہ بزرگوں کا ہے، ہرگز اُن میں نہیں۔ پھر کس چیز سے ہم پر فخر کرتے ہیں اور مکھی، مچھر، ڈانس وغیرہ کہ انڈے دیتے اور اپنے بچوں کی پرورش کرتے اور گھر بناتے ہیں، صرف اپنے فائدہ کے واسطے نہیں بلکہ اس لیے کہ بعد اُن کے مرنے کے اور کیڑے آکر آرام پاویں کیونکہ اُن میں سے ہر ایک کو اپنی موت کا یقین کامل حاصل ہے جبکہ موت کے دن پورے ہوتے ہیں، رضامندی اور خوشی سے خود فنا ہو جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اپنی قدرت سے پھر دوسرے سال پیدا کرتا ہے، غرضکہ یہ کسی حال میں اس کا انکار نہیں کرتے جس طرح بعضے آدمی بعث و قیامت سے منکر ہیں۔ اگر آدمی ان حیوانوں کا احوال معلوم کریں کہ یہ اپنی معاش اور معاد میں ان سے زیادہ تدبیریں جانتے ہیں یہ فخر نہ کریں کہ ہم مالک اور حیوان ہمارے غلام ہیں۔

فصل

جس گھڑی مکھیوں کا وکیل اس کلام سے فارغ ہوا، جنوں کے بادشاہ نے نہایت خوش ہو کر اُسکی تعریف کی اور انسانوں کی جماعت کی طرف متوجہ ہو کر فرمایا کہ اس نے جو کہا سب سُنا تم نے اب تمہارے نزدیک کوئی جواب باقی ہے۔ اُن میں سے ایک شخص اعرابی نے کہا کہ ہم میں بہت سی فضیلتیں اور نیک خصلتیں ہیں جن سے دعوے ہمارا ثابت ہوتا ہے۔ بادشاہ نے کہا اُنہیں بیان کرو۔ کہا کہ زندگی ہماری بہت عیش سے گزرتی ہے، انواع و اقسام کی نعمتیں کھانے پینے کی ہم کو میسر ہیں۔ حیوانوں کو وہ نظر بھی نہیں آتیں۔ میووں کا مغز اور گودا ہمارے کھانے میں آتا ہے، پوست اور گٹھلی یہ کھاتے ہیں۔ اس کے سوا طرح طرح کے کھانے، شیرمال، باقرخانی، گاؤ دیدہ، گاؤ زبان، کلیچے، مطنجن، زردہ، بریانی، مزعفر، شیر برنج، کباب، قورما، بورانی، فرنی، دودھ، دہی، گھی، قسم قسم کی مٹھائی، حلوا سوہن، جلیبی، لڈو، پیڑے، برفی، امرتی، لوزیات وغیرہ کھاتے ہیں۔ تفریح

طرح کے واسطے ناچ، رنگ، ہنسی، چہل، قصے کہانی میسر ہیں۔ لباس فاخرہ اور زیور طرح بطرح کے پہنتے ہیں۔ مسند، قالین، چاندنی، جاجم اور بہت سے فرش و فروش بچھاتے ہیں، حیوانوں کو یہ سامان کہاں میسر ہیں؟ ہمیشہ جنگل کی گھاس کھاتے ہیں اور رات دن ننگ دھڑنگ غلاموں کی طرح محنت اور مشقت میں رہتے ہیں۔ یہ سب چیزیں دلیل ہیں اسپر کہ ہم مالک اور یہ غلام ہیں۔ طائروں کا وکیل ہزار داستان سامنے شاخ درخت پر بیٹھا تھا۔ اس نے بادشاہ سے کہا کہ یہ آدمی جو انواع و اقسام کے کھانے پینے پر افتخار کرتا ہے، یہ نہیں جانتا کہ حقیقت میں ان کے واسطے یہ بہت رنج و عذاب ہے۔ بادشاہ نے کہا یہ کیونکر ہے؟ اسے بیان کر۔ کہا اس واسطے کہ اس آرام کے لیے بہت محنتیں اور رنج اٹھاتے ہیں، زمین کھودنا، ہل جوتنا، ہل کھینچنا، پانی بھرنا، اناج بونا، کاٹنا، تولنا، پیسنا، تنور میں آگ جلانا، پکانا، گوشت کے واسطے قصائیوں سے جھگڑنا، بنیوں سے حساب کتاب کرنا، مال جمع کرنے کے لیے محنتیں اٹھانا، علم و ہنر سیکھنا، بدن کو رنج دینا، اور دور ملکوں میں جانا، دو پیسوں کے واسطے امیروں کے سامنے ہاتھ باندھکر کھڑے ہونا غرض اس جد و کد سے مال و اسباب جمع کرتے ہیں، بعد مرنے کے وہ غیروں کے حصے میں آتا ہے اگر وجہ حلال سے پیدا کیا ہے تو اسکا حساب و کتاب ہے، نہیں تو عذاب و عقاب، اور ہم اس رنج و عذاب سے محفوظ رہتے ہیں کیونکہ غذا ہماری فقط گھاس پات ہے، جو چیز زمین سے پیدا ہوتی ہے بے محنت و مشقت اسکو اپنے تصرف میں لاتے ہیں۔ انواع و اقسام کے پھل اور میوے اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت سے ہمارے واسطے پیدا کیے ہیں، کھاتے ہیں اور ہمیشہ اس کا شکر کرتے ہیں، فکر و تلاش کھانے پینے کی ہمارے دل میں کبھی نہیں آتی، جہاں جاتے ہیں فضل الٰہی سے سب کچھ میسر ہو جاتا ہے اور یہ ہمیشہ قوت کی فکر میں غلطاں اور پیچاں رہتے ہیں اور طرح طرح کے کھانے جو یہ کھاتے ہیں، ویسے ہی رنج و عذاب اٹھاتے ہیں، امراض مزمنہ میں مبتلا رہتے ہیں، بخار، دردِ سر، ہیضہ، سرسام فالج، لقوہ، جوڑی، کھانسی، یرقان، تپ دق، پھوڑا پھنسی، کھجلی، داد، خنازیر، پیچش اسہال، آتشک، سوزاک، فیل پا، نکواسا، غرض اقسام اقسام کی بیماریاں ان کو عارض ہوتی ہیں

دوا دارو کے لیے طبیبوں کے یہاں دوڑے پھرتے ہیں جس پر بے حیائی سے کہتے ہیں کہ ہم مالک اور حیوان ہمارے غلام ہیں۔ انسان نے جواب دیا کہ بیماری کی خصوصیت کچھ ہمارے واسطے نہیں ہے، حیوان بھی بیشتر امراض میں مبتلا ہوتے ہیں۔ اُس نے کہا حیوان جو بیمار ہوتے ہیں صرف تمہاری آمیزش اور اختلاط سے، کتے، بلی، مرغ، کبوتر وغیرہ حیوانات کہ تمہارے یہاں گرفتار ہیں، اپنے اپنے طور پر کھانے، پینے نہیں پاتے ہیں۔ اسی واسطے بیمار ہو جاتے ہیں، اور جو حیوان کہ جنگل میں مختار بالطبع پھرتے ہیں، ہر ایک مرض سے محفوظ ہیں۔ کیونکہ کھانے پینے کے وقت ان کے مقررہ میں کمی بیشی اُس میں نہیں آتی، اور یہ حیوانات جو تمہارے یہاں گرفتار ہیں اپنے طور پر اوقات بسر کرنے نہیں پاتے، کھانا بے وقت کھاتے یا مارے بھوک کے اندازے سے زیادہ کھا جاتے ہیں، بدن کی ریاضت نہیں کرتے، اسی سبب کبھی کبھی بیمار ہو جاتے ہیں۔ تمہارے لڑکوں کے بیمار رہنے کا بھی یہی سبب ہے کہ حاملہ عورتیں اور دائیاں حرص سے غیر مناسب کھانے، جن پر تم اتنا فخر کرتے ہو کھا جاتی ہیں۔ اسی لیے اخلاطِ غلیظہ پیدا ہوتے ہیں۔ دودھ بگڑ جاتا ہے، اس کے اثر سے لڑکے بدصورت پیدا ہوتے اور ہمیشہ امراض میں مبتلا رہتے ہیں، انہیں مرضوں کے باعث مرگ مفاجات اور شدت نزاع اور غم، غصے میں گرفتار رہتے ہیں۔ غرضیکہ تم اپنے اعمال کی شامت سے ان عذابوں میں گرفتار ہو اور ہم اُن سے محفوظ ہیں۔ کھانے کے اقسام میں تمہارے یہاں شہد نفیس تر اور بہتر ہے جسکو کھاتے اور دوا میں استعمال کرتے ہو، سو وہ مکھیوں کا لعاب ہے تمہاری صنعت سے نہیں، پھر کس چیز کا فخر کرتے ہو۔ باقی پھل اور دانے ان کے کھانے میں ہم تم شریک ہیں اور قدیم سے ہمارے تمہارے جد و آبا شریک ہوتے چلے آئے ہیں جن دنوں تمہارے جدِ اعلیٰ حضرت آدم و حوا باغِ بہشت میں رہتے تھے، اور بے محنت و مشقت وہاں کے میوے کھاتے، کسی طرح کی فکر و محنت نہ تھی، ہمارے جد و آبا بھی وہاں اس نعمت میں ان کے شریک تھے جب تمہارے بزرگوار اپنے دشمن کے بہکانے سے خدا کی نصیحت بھول گئے اور ایک دانے کے واسطے حرص کی، وہاں سے نکالے گئے۔ فرشتوں نے نیچے اتار کر ایسی جگہ ڈال دیا جہاں پھل

پتے بھی نہ تھے، میووں کا تو کیا دخل؟ ایک مدت تک اس غم میں رویا کیے، آخر کو توبہ قبول ہوئی، خدا نے گناہ معاف کیا، ایک فرشتے کو بھیجا، اس نے یہاں آکر زمین کھودنا، بونا، پیسنا، پکانا، لباس بنانا سکھایا، غرض رات دن اس محنت و مشقت میں گرفتار رہتے تھے، جبکہ اولاد بہت پیدا ہوئی اور ہر ایک جگہ جنگل و آبادی میں رہنے لگے، پھر تو زمین کے رہنے والوں پر بدعت شروع کی، گھر ان کے چھین لیے کتنوں کو پکڑ کر قید کر لیا، بہت سے بھاگ گئے۔ ان کے قید و گرفتار کرنے کے واسطے انواع و اقسام کے پھندے اور جال بنا بنا کر در پے ہوئے، آخر کو نوبت یہاں تک پہنچی کہ اب تم کھڑے ہو کر فخر و مرتبہ اپنا بیان کرتے ہو۔ مناظرے اور مجادلے کے واسطے مستعد ہو اور یہ جو تم کہتے ہو کہ ہم خوشی کی مجلس کرتے ہیں، ناچ رنگ میں مشغول رہتے ہیں، عیش و عشرت میں اوقات بسر کرتے ہیں، لباس فاخرہ اور زیور انواع و اقسام کے پہنتے ہیں، ان کے سوا اور بہت سی چیزیں جو ہم کو میسر نہیں ہیں سچ ہے لیکن ان میں سے ہر ایک چیز کے عوض تم کو عذاب و عقاب بھی ہوتا ہے کہ جس سے ہم محفوظ ہیں؛ کیونکہ تم شادی کی مجلس کے عوض، ماتم خانے میں بیٹھتے ہو، خوشی کے بدلے غم اٹھاتے ہو، راگ و رنگ اور ہنسی کے بدلے روتے اور رنج کھینچتے ہو، نفیس مکانوں کی جگہ تاریک قبر میں سوتے ہو زیور کے عوض گلے میں طوق، ہاتھوں میں ہتھکڑی، پاؤں میں زنجیر پہنتے ہو، تعریف کے بدلے ہجو میں گرفتار ہوتے ہو، غرض ہر ایک خوشی کے عوض، غم بھی اٹھاتے ہو اور ہم ان مصیبتوں سے محفوظ ہیں کیونکہ یہ مجلسیں اور رنج غلاموں اور بدبختوں کے واسطے چاہیے۔ اور ہم کو تمہارے شہروں اور مکانوں کے بدلے یہ میدان وسیع میسر ہے، زمین سے آسمان تک جہاں جی چاہتا ہے اڑتے ہیں، ہرا ہرا سبزہ دریا کے کنارے بے تکلف چرتے چگتے ہیں، بے محنت و مشقت رزق حلال کھاتے اور پانی لطیف پیتے ہیں۔ کوئی منع کرنے والا نہیں۔ رسی ڈول مشک کوزے کے محتاج نہیں، یہ سب چیزیں تمہارے واسطے چاہئیں کہ اپنے کاندھوں پر اٹھا کر جا بجا لیے پھرتے اور بیچتے ہو، ہمیشہ محنت و مصیبت میں گرفتار رہتے ہو۔ یہ سب نشانیاں غلاموں کی ہیں۔ یہ کہاں سے ثابت ہوتا ہے کہ تم مالک ہو اور ہم غلام ہیں؟"

مظہر علی وِلاؔ

حالات وہ شارانِ اُردو جنکا نام ضرور اس بات کا مستحق ہے کہ جب تک ہماری زبان قائم ہے ہمیشہ عزت و احترام کے ساتھ لیا جائے کیونکہ یہی وہ اصحاب تھے جنہوں نے نثرِ اُردو کی بنیاد ڈالی اور بعدازاں اُس پر عمارتیں قائم ہونی شروع ہوئیں، آج گوشۂ گمنامی میں عزلت گزیں ہیں اور بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ اُنہوں نے ابتدا میں ہماری زبان کی کیا کیا خدمات انجام دی ہیں اُس وقت نثرِ اُردو لکھنا ایک قسم کی توہین سمجھا جاتا تھا۔ بالفاظِ دیگر نثرِ اُردو لکھنے کے یہ معنی تھے کہ لکھنے والا فارسی میں اظہارِ خیال کی قدرت نہیں رکھتا۔ وہ زمانہ تو پھر بھی ہم سے بہت دور ہے غدر کے بہت بعد تک عام طور پر یہی حال رہا کہ دوستانہ خط و کتابت معمولی اشخاص بھی فارسی زبان ہی میں کرتے رہے۔ اور اُنیسویں صدی کے اختتام تک بھی اکثر رقعاتِ شادی فارسی زبان میں لکھے جاتے تھے۔ البتہ بیسویں صدی سے یہ سب باتیں داستانِ پارینہ ہوگئیں، صرف نسخہ نویسی ابتک فارسی میں ہوتی ہے۔ جبکہ فارسی زبان کا یہ زور اور اثر ہو، واقعی ہم لوگوں کو اُن کا نہایت احسانمند ہونا چاہیے جنہوں نے اپنی علمیت پر بٹہ لگنے کو قبول کیا اور اُردو نثر میں کتابیں تصنیف و تالیف یا ترجمہ کیں، ان بزرگوں میں **مظہر علی وِلا** کا نام نامی بھی ہمیشہ شامل رہیگا۔ اُنہوں نے **بیتال پچیسی** کو جو محمد شاہ کے زمانہ میں سنسکرت سے برج بھاشا میں آئی تھی اور ۱۸۰۳ء ۱۲۱۸ھ میں عام فہم اُردو یعنی ہندوستانی میں لکھی گئی تھی اُردو میں لکھا۔ افسوس ہے کہ مظہر علی وِلا نے اپنے متعلق ایک لفظ بھی یہاں تک کہ اپنا نام بھی کتاب مذکور میں درج نہیں کیا۔ آج اُن کے حالاتِ زندگی کجا اُن کی سکونت تک کا پتہ نہیں۔ مجبوراً ہم بھی اُن کے حالاتِ زندگی سے قطع نظر کرتے ہیں اور کتابِ مذکور کا بہت مختصر نمونہ ہدیۂ ناظرین کرتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ اب یہ کتاب دلچسپی سے مطالعہ نہیں کی جاسکتی۔ زبان صاف اور سلیس نہیں ہے، علاوہ ازیں بہت سے ہندی الفاظ استعمال کیے گئے ہیں جن میں سے بعض بعید از فہم ہیں۔ اب تک یہ کتاب عام طور پر

بازار میں فروخت ہوتی ہے لیکن اب وہ دن بہت قریب آنے والا ہے جبکہ بیتال پچیسی اور
اس کی ہم عصر بنیں صفحۂ قرطاس سے معدوم ہو جائینگی، کیونکہ اب ان کتابوں کے پڑھنے والے
بہت کم ہو گئے ہیں اور روز بروز اُن کی تعداد گھٹتی جا رہی ہے، عام طور پر ناول پڑھے جاتے
ہیں اور پُرانے قصّوں سے کوئی دلچسپی باقی نہیں رہی۔ آپ نے مادھونل کا ترجمہ بھی اُردو
میں کیا جیسا کہ تخلص سے ظاہر ہے، آپ شاعر بھی تھے اور صاحبِ دیوان تھے۔ تاریخ شیر شاہی
کا ترجمہ بھی آپ نے اُردو میں کیا (۱۸۰۵ء) جو غالباً شائع نہیں ہوا۔

بیتال پچیسی میں پچیس کہانیاں ہیں اور اسی وجہ سے اس کا نام پچیسی ہے، چونکہ کہانیاں
کہنے والا ایک شخص بیتال نامی ہے اس لیے اس کا نام بیتال پچیسی رکھا گیا ہے اور وہ شخص کیا
ہے بلکہ ایک مردہ ہے جو قوم کا تیلی ہے اور جسکو جوگی نے "بسان"[۱] بنا کر رکھا ہے، وہ اس طرح
حکایات بیان کرتا ہے۔

نمونہ از بیتال پچیسی

پہلی کہانی

"ایک راجہ پرتاب مکٹ نام بنارس کا تھا، اور اُس کے بیٹے کا نام بجر مکٹ جسکی رانی کا
نام مہادیبی۔ ایک دن کنور اپنے دیوان کے بیٹے کو ساتھ لے شکار کو گیا اور بہت دور جنگل میں جا نکلا اور
اُسکے بیچ ایک سندر تالاب دیکھا کہ اُس کے کنارے ہنس، چکوی، چکوا، بگلے، مرغابیاں سب کے
سب کلول میں تھے، چاروں طرف پختہ گھاٹ بنے ہوئے، کنول تالاب میں پھولے ہوئے،
کناروں پر طرح طرح کے درخت لگے ہوئے کہ جنکی گھنی چھاہندمیں ٹھنڈی ہوا آتی تھی اور
پنچھی پکھیرو درختوں پر چہچہوں میں تھے اور رنگ برنگ کے پھول بن میں پھول رہے تھے، اُن پر
بھونروں کے جھنڈ کے جھنڈ گونج رہے کہ اس تالاب کے کنارے پہنچے اور منھ ہاتھ دھو کر اوپر آئے۔

[۱] بسان سے یہ مطلب ہے کہ ایک جوگی نے اس تیلی کو مار ڈالا اور پھر اُسکو ایک درخت میں لٹکا دیا، اور بھوت بنا دیا۔ اسی کتاب
میں ایک موقع پر پشاچ کا لفظ استعمال کیا ہے جسکے معنی بھی بھوت کے ہیں۔ تنہا

وہاں ایک مہادیو کا مندر تھا، گھوڑوں کو باندھ، مندر کے اندر جا، مہادیو کا درشن کر باہر نکلے جتنی دیر اُن کو درشن میں لگی تھی اُسی عرصہ میں کسو راجہ کی بیٹی سہیلیوں کا جھنڈ ساتھ لیے ہوئے اُسی تالاب کے دوسرے کنارے پر اشنان کرنے آئی۔ سو اشنان دھیان پوجا کر سہیلیوں کو ساتھ لیے درختوں کی چھانہہ میں ٹہلنے لگی، اُدھر دیوان کا بیٹا بیٹھا اور راجہ کا بیٹا پھرتا تھا۔ کہ اچانک اُس کی اور راجہ کی بیٹی کی چار نظریں ہوئیں، دیکھتے ہی اُس کے روپ کو راجہ کا بیٹا فریفتہ ہوا اور اپنے دل میں کہنے لگا کہ اے چنڈال کام دیو مجھکو کیوں ستاتا ہے اور اُس راج پُتری نے اُس کنور کو دیکھ سر میں جو کنول کا پھول پوجا کر کے رکھا تھا وہی پھول ہاتھ میں لے، کان سے لگا، دانت سے کتر، پاؤں تلے دبا، پھر اُٹھا، چھاتی سے لگا لیا اور سہیلیوں کو ساتھ لے سوار ہو اپنے مکان کو گئی اور یہ راج پُتر نہایت نراس ہو پریم میں ڈوبا ہوا دیوان کے پاس آیا اور ساتھ شرم کے اُسکے آگے حقیقت کہنے لگا۔"

جیسا کہ اوپر ذکر کیا مظہر علی ولاؔ نے ایک اور قصہ مادھونال بھی برج بھاکا سے اردو میں ترجمہ کیا تھا۔ افسوس ہے وہ ہمیں دستیاب نہیں ہوا ورنہ اُس کا بھی نمونہ پیش کرتے۔



مولوی امانت اللہ

آپ نے اخلاقِ جلالی کا ترجمہ اُردو میں کیا اور ایک کتاب ہدایت الاسلام عربی اور ہندوستانی دونوں زبانوں میں لکھی جس میں مذہب اسلام کے ارکان و رسوم کا ذکر ہے (کلکتہ سنہ ۱۸۰۴ء) اس کا ترجمہ ڈاکٹر گلکرائسٹ نے انگریزی زبان میں کیا۔ علاوہ اس کے ایک کتاب صرفِ اُردو منظوم لکھی (سنہ ۱۸۱۰ء) یہ کتابیں آپ کے کارنامے ہیں لیکن افسوس ہے کہ نہ آپ کی کتابیں بآسانی دستیاب ہوتی ہیں اور نہ آپ کے حالاتِ زندگی کا پتہ چلتا ہے ✤ ع ✤ روئے زمیں پہ سینکڑوں آئے چلے گئے ✤

منشی بینی نراین

آپ نے کپتان روبک کے سمجھانے سے دیوانِ جہاں کے نام سے ہندوستانی شعراء کا تذکرہ مع منتخب کلام کے مرتب کیا (سنہ۱۸۱۴ء) علاوہ ازیں آپ نے چار گلشن کا بھی ترجمہ کیا (سنہ۱۸۱۱ء) آپ بھی کلکتہ فورٹ ولیم کالج میں ملازم تھے ۔

میرزا جان طپش

آپ نے مختلف کتابوں کی ترتیب و تالیف میں بمقام فورٹ ولیم کلکتہ مدد دی۔ نیز آپ نے اُردو محاورات پر ایک کتاب لکھی جو فارسی محاورات سے ترجمہ کر کے ہندوستانی میں داخل کر لیے گئے ہیں۔ ساتھ ساتھ شواہد و نظائر بھی دیے ہیں۔ آپ کا کلیات آپ کی زندگی ہی میں کالج کی طرف سے شائع ہوا۔ (سنہ۱۸۱۲ء) طپش نے بہار دانش کے کچھ حصے کا ترجمہ اُردو نظم میں بھی کیا جو شائع ہو چکا ہے ۔

محمد خلیل اللہ خاں اشک

آپ نے سنہ۱۸۰۵ء میں اکبر نامہ کا ترجمہ اُردو میں واقعاتِ اکبر کے نام سے کیا جو شائع نہیں ہوا۔

خاتمہ

اِس دور میں حقیقتاً فورٹ ولیم کالج نے اُردو کی بڑی خدمت کی ہم نے جن متوسلین اصحاب کا ذکر کیا ہے اُن کی کتابوں کے علاوہ کالج کی طرف سے اور کتابیں مثلاً ہفت گلشن

خوانِ الوان، تاریخ امیر حمزہ، گلدستۂ حیدری، حکایات لقمان وغیرہ بھی شائع کی گئیں، کالج کے اثر سے اُس زمانہ میں اور لوگوں نے بھی جن کا کالج سے کوئی تعلق نہ تھا اُردو کتابیں تحریر کیں اور کالج کی مطبوعات کا اُردو زبان پر اور اہلِ زبان کے ذوق پر یہ نتیجہ خیز اثر پڑا کہ لوگوں میں نثر نگاری کا بہت اچھا سلیقہ پیدا ہو گیا ورنہ جو نثر مرزا رفیع السودا اور فضلی مرحوم نے لکھی تھی غالباً عرصہ تک اُسی قسم کی نثر لکھی جاتی اور ایک مدت کے بعد نثر میں کچھ تبدیلی اور ترقی ہوتی۔ کالج کی بدولت سلیس اور با محاورہ اُردو نثر کا جلد رواج ہو گیا۔ اور اسی طرز کو آخر کار مقبولیت حاصل ہوئی۔ دوسرے دور کے نثارانِ اُردو نے مقفّٰی و مسجع عبارت لکھنی پسند کی اور مضبوطی کے ساتھ اُس پر قائم رہے لیکن تیسرے دور کے مصنفین نے پھر اپنا رنگ بدل دیا سلاست کو پھر اپنا نصب العین بنایا اور رنگینی سے دست کشی اختیار کی *

دوسرا دور

سنہ ۱۸۳۶ء سے سنہ ۱۸۵۷ء تک

پہلے دور کے بزرگ اس دنیائے فانی سے منہ موڑ کر عالم بقا کو راہی ہوئے اور دوسرے دور کے نوجوانانِ عالی مقام نثر اُردو کی بزم میں جلوہ افروز ہوئے۔ اگرچہ پہلے دور کے بزرگوں نے اس خیال کو پیدا کرنے کی کوشش کی تھی کہ اب فارسی زبان کا عہدِ حکومت ختم ہوا اور اُردو کا طفلِ مکتب سر ریر آرائے سلطنت ہوا، لیکن ان نوجوانوں کی رگوں میں فارسی زبان خون کی طرح پھیلی ہوئی تھی اور فارسی کو ان سے جدا کرنا گوشت سے ناخن جدا کرنا تھا۔ یہ فارسی کی بچھڑی ہوئی محفلوں کی یاد میں مستِ الست تھے اور ان کو نئی مجلس قائم کرنا دشوار تھا لیکن زمانہ بآوازِ بلند ان سے کہہ رہا تھا کہ نیند کے ماتو! اُٹھو اور اس گری پڑی پریشان چیز یعنی ریختہ کی دستگیری کرو، اب فارسی اور تمہارے درمیان منزلوں کا فاصلہ ہوگیا ہے اور روز بروز تم سے فارسی دور ہوتی جائیگی۔ ملک کی زبان اُردو قرار پائیگی اور اب ہندوستان میں اُردو ہی کا سکہ رواں ہوگا۔ دہلی اور لکھنؤ اس سکہ کے دار الضرب قرار دیے گئے۔ اور ان شہروں کے علاوہ ہر جگہ کی بولی ٹکسال باہر سمجھی گئی۔ آخر کار فقیر محمد خاں گویا، انوار سہیلی کے ترجمہ میں مصروف ہوئے اور میرزا رجب علی سرور فارسی کی تقلید میں نثر اُردو کی نئی طرز نکالنے میں مشغول ہوئے، اِدھر مرزا غالب نے باوجودیکہ فارسی کے حد سے زیادہ دلدادہ تھے وہ عجیب وغریب نثر اُردو کا نمونہ پیش کیا جس پر آج بھی لوگ سر دُھنتے ہیں، عبارت میں سادگی، روانی اور شگفتگی ایسی ہے کہ باید وشاید۔ یہ سچ ہے کہ مرزا کے خطوط اگرچہ کتاب کی شکل میں شائع ہوئے ہیں لیکن کتاب نہیں کہلائے جاسکتے تاہم اُن میں وہ دلآویزی ہے کہ سینکڑوں کتابیں اُن پر نثار ہیں اور اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ ان خطوط نے ہمارے طرزِ مکاتیب نویسی کو بالکل بدل ڈالا اور زبانِ اُردو کی ایک بڑی خدمت ادا کی۔ غلام امام شہید کی عبارت اگرچہ رنگین ہے اور فارسی کا تتبع

پایا جاتا ہے مگر قابلِ تعریف ہے اور اپنے رنگ ڈھنگ سے صاف صاف بزبانِ حال کہتی ہے
کہ میں نہ پہلے دوَر کی سیدھی سادی اُردو ہوں اور نہ تیسرے دَور کی علمی و ادبی زبان ہوں
بلکہ دوسرے دور میں پیدا ہوئی ہوں جبکہ پہلے دَور کی سادگی سے قطع نظر کرکے کسی اور طرز کی
ضرورت تھی تاکہ ہر دلعزیز اور لایقِ تحسین و آفرین ہوں، غلام غوث بیخبر بھی اپنے دَور
کی انشا پردازی سے بے خبر نہ تھے۔ اُنھوں نے بھی اُسی لَے میں اپنی راگنی چھیڑی جو اُس
زمانہ کے لوگوں کو مرغوب خاطر تھی۔ رہے منشی امیر احمد مینائی یہ بھی سرور کے ڈھنگ
پر چلے، ان کی رفتار و گفتار، وضع و قطع بالکل سرور کی سی ہے۔

کبھی یہ لوگ جوان تھے اور انہوں نے اپنی شیریں زبانی سے سب کو مسخر کر رکھا تھا
اب بڑھاپے سے بھی گزر کر کنارِ گور میں آرام سے سو رہے ہیں اور ان کی طرزِ عبارت آرائی
بھی متروک و مفقود ہوگئی ہے۔ البتہ مرزا غالب کا اندازِ بیاں اب بھی محبوبِ دلفریب
ہے بلکہ عجیب بات یہ ہے کہ آپ نے موت کی آبشارے سے گزر کر آبِ حیات کے چشمہ کو پالیا
ہے اور ابدالآباد تک آپ کی طرزِ تحریر کو قبولیت حاصل رہے گی اور آپ کے گلہائے عبارت
مشامِ جان کو ہر زمانہ اور ہر فصل میں اپنی خوشبو سے معطّر کرتے رہیں گے۔

افسوس ہے کہ ہمارا لٹریچر زمانہ کی دست بُرد سے محفوظ نہیں رہا ورنہ ہم نے جن بزرگوں
کا حال اس دَور میں بیان کیا ہے وہ مصنفین کے اُس جمِ غفیر کے سامنے جو اس دور میں ہو گزرے
ہیں معدودے چند معلوم ہوتے ہیں لیکن تمام مصنفین کے حالاتِ زندگی اور اُن کی تصانیف
بہم پہنچانا کارے دارد کا مضمون ہے۔ بے شک انڈیا آفس لائبریری لندن سے اس کمی
کو پورا کیا جاسکتا ہے، جیسا کہ عبارتِ ذیل سے ظاہر ہوگا۔

اتفاق سے ایک روز رسالہ معارف اعظم گڑھ کا جون ۱۹۲۰ء کا نمبر ہماری نظر سے
گزرا اور ہم نے اُس میں ایک مضمون نوشتۂ سید سلیمان صاحب ندوی بعنوان "انڈیا آفس
لائبریری میں اُردو کا خزانہ" دیکھا، چونکہ اس مضمون میں اُردو کی بہت سی کتابوں کا ذکر ہے

جو مضمون نگار نے لنڈن میں دیکھی تھیں اور یہاں یعنی ہندوستان میں ناپید ہیں اس لیے ہم وہ فہرست جہاں تک اسکا تعلق اس دور کی تصنیف شدہ کتابوں سے ہے ذیل میں درج کرتے ہیں اور افسوس کرتے ہیں کہ ہم اُن کتابوں کے نمونے پیش نہیں کر سکتے اور نہ مصنفین کے حالات بہم پہنچا سکتے ہیں۔ اب یہ ہمارے ناظرین کا فرض ہوگا کہ اگر وہ ان نایاب کتابوں میں سے کسی کتاب کے مالک ہوں تو ہم کو اُس کے اقتباس سے بہرہ یاب کریں۔ اور اگر ممکن ہو تو مصنف کے حالات زندگی بھی جو کچھ معلوم ہوں تحریر فرمائیں تاکہ ہم طبع دوم میں اس کمی کو پورا کر سکیں سید سلیمان صاحب لکھتے ہیں :۔

"مطبوعہ اُردو کتابوں کی اہمیت بھی یہاں میری نگاہ میں کچھ کم نظر نہ آئی۔ اور تھوڑی دیر کے لیے مجھے مغرور ہونا پڑا کہ اللہ اللہ ہماری زبان بھی اس قدر ترقی یافتہ ہے کہ تین سو صفحہ میں اُسکی فہرست تمام ہوئی ہے۔ یہ فہرست سنہ ۱۹۰۰ء میں چھپی ہے اس لیے موجودہ بیسویں صدی کی کتابیں اس فہرست میں شامل نہیں ہیں۔ اس فہرست کو دیکھکر یہ تعجب ہوا کہ اُردو زبان غدر کے پہلے ہی سے ایک علمی زبان بن رہی تھی۔ دوسری بات یہ نظر آئی کہ اس زبان کو علمی زبان بنانے میں مسلمان اور ہندو دونوں اہل قلم کا برابر کا ساجھا ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ہندوستانی یونیورسٹیوں کی تاریخ نے ہندوؤں اور مسلمانوں کو دو حصوں میں منقسم نہیں کیا تھا بلکہ جب صرف ایک سالم اور متحد ہندوستان دنیا میں موجود تھا۔

بہرحال اُردو کتابوں کی یہ فہرست، جو صرف مطبوعات پر مشتمل ہے چھ عنوانوں پر منقسم ہے۔ علوم و فنون۔ تاریخ و جغرافیہ۔ ادبیات۔ کتب تعلیمی۔ الٰہیات۔ اور متفرقات ہر ایک عنوان کے تحت میں حسب ذیل تقسیمات ہیں :۔

۱:۔ علوم و فنون

(۱) زراعت و نباتات (۲) صنعت و حرفت (۳) ہیئت و نجوم (۴) علم الطبیع
(۵) نیرنگ و طلسمات (۶) علم المنزل و قواعد صحت (۷) نقشہ کشی (۸) اخلاق

(۹) ورزش وسپہگری
(۱۰) قانون
(۱۱) انگریزی قانون
(۱۲) ہندو قانون
(۱۳) اسلامی قانون
(۱۴) منطق وفلسفہ
(۱۵) طب وتشریح
(۱۶) علم الحرب
(۱۷) موسیقی
(۱۸) لغت
(۱۹) علم السنہ
(۲۰) طبعیات
(۲۱) معاشیات
(۲۲) علم المعانی والبیان
(۲۳) اجتماعیات
(۲۴) طبیب اناث

۲:- تاریخ وجغرافیہ

(۲۵) عام سوانح عمریاں
(۲۶) سوانح محمد صلعم
(۲۷) سوانح ائمہ
(۲۸) حالات قبائل وفرق
(۲۹) علم الانساب
(۳۰) جغرافیہ وتقویم البلدان (ٹاپوگرافی)
(۳۱) عام تاریخ
(۳۲) مقامی تاریخ
(۳۳) سفرنامہ

۳:- ادبیات

(۳۴) دواوین
(۳۵) ڈراما
(۳۶) خطوط ومکاتیب
(۳۷) انتقادات ادبیہ
(۳۸) شاعری
(۳۹) عام شاعری
(۴۰) تذکرۂ شعراء
(۴۱) مذہبی شاعری
(۴۲) مذہبی ہندو شاعری
(۴۳) مذہبی اسلامی شاعری
(۴۴) محاورات وامثال
(۴۵) قصص وافسانہ
(۴۶) قصص منظومہ
(۴۷) قصص منثورہ

۴:- کتب تعلیمی

(۴۸) قواعد
(۴۹) قواعد عربی
(۵۰) قواعد برگسنا (پشتو)
(۵۱) قواعد انگریزی
(۵۲) قواعد ہندی
(۵۳) قواعد ہندوستانی (اُردو)
(۵۴) قواعد کشمیری
(۵۵) قواعد فارسی
(۵۶) علم الخط
(۵۷) ریاضیات
(۵۸) علم الجبر ومقابلہ
(۵۹) علم الحساب
(۶۰) علم الحساب الکلیات والجزئیات
(۶۱) اقلیدس
(۶۲) علم المساحت

(۶۳) علم وزن و پیمائش (۶۴) علم المخروطات والاشکال (۶۵) علم المثلثات

(۶۶) کتب ابتدائیہ (ریڈرس) (۶۷) انتخابات

۵۔ الٰہیات

(۶۸) برہمی اور لامذہبی (۶۹) بودھی (۷۰) عیسائی

(۷۱) بائبل (۷۲) بائبل لٹریچر (۷۳) تاریخ کلیسا

(۷۴) تعلیمات (۷۵) ادعیہ و مزامیر (۷۶) قصص

(۷۷) مناظرہ و موازنہ ادیان (۷۸) ہندو مذہب (۷۹) جینی مذہب

(۸۰) اسلام (۸۱) عبادات (۸۲) عقائد

(۸۳) قرانیات (۸۴) حدیث (۸۵) سکھ مذہب

۶۔ متفرقات

(۸۶) تعلیمات (۸۷) تعلیم النسوان (۸۸) تعلیم الصبیان

(۸۹) مجموعہائے تقریر و مضامین (۹۰) رسائل موقت الشیوع (۹۱) رو داد مجالس

ذیل میں ہر عنوانات سے ان میں سے چند کتابوں کے نام، بقید نام مصنف، و تاریخ طبع لکھے جاتے ہیں۔ اس انتخاب میں قصداً صرف وہی کتابیں لی ہیں جو غدر سے پہلے یا اسکے بعد کسی قریب زمانہ میں لکھی گئی ہیں قصص و منظومات کو ہاتھ نہیں لگایا ہے کہ ہر شخص جانتا ہے کہ اردو میں اس کا بڑا ذخیرہ ہے۔ صرف علمی کتابیں لی ہیں۔ ان پر ایک نظر ڈالنے سے معلوم ہو سکتا ہے کہ علوم جدیدہ کی مختلف شاخوں میں کس سرعت سے اردو اس وقت تک ترقی کر رہی تھی جب تک وہ تمام ملک کی مسلم زبان تھی اور نفاق قومی سے نا آشنا تھی۔

فنِ زراعت

۱۔ چائے لگانے کی کتاب (۷ اصفحات) مطبوعہ لاہور سنہ ۱۸۵۴ء

۲۔ گنگا کی نہر مترجمہ سدا سکھ لال از انگریزی (صفحات ۲۴) سنہ ۱۸۵۴ء مطبوعہ آگرہ

۳:۔ کھیت کرم مصنفہ کالی رائے، تین حصّے، مطبوعہ دہلی ۱۸۴۶ء

۴:۔ پند نامۂ کاشتکاری۔ مصنفہ موتی لال آگرہ ۱۸۵۲ء

۵:۔ ریشم کا کیڑا۔ از موتی لال، لاہور ۱۸۵۳ء

۶:۔ توصیف زراعت از کلب حسین خاں، آگرہ ۱۸۴۸ء

کتب حکمت

۱:۔ بحر الحکمۃ (اسٹیم انجن کا بیان) ریورنڈ پارکن ۱۸۴۷ء لکھنؤ

۲:۔ بخار کی کل " ایشوری لال ۱۸۵۵ء بنارس

۳:۔ نور النواظر احمد علی کانپور ۱۸۵۴ء

۴:۔ قانونِ انطباع (چھاپہ) سیتل سنگھ دہلی ۱۸۴۸ء

کتب نجوم و ہیئت

۱:۔ خلاصۂ نظامِ آسمانی۔ پنڈت داسی دھیرا۔ آگرہ ۱۸۵۲ء

۲:۔ مختصر احوالِ نظامِ آسمانی۔ آگرہ ۱۸۴۰ء

۳:۔ مختصر دقائق النجوم۔ ٹیٹے صاحب گہنا لے۔ مدراس ۱۸۴۸ء

۴:۔ اصولِ علمِ ہیئت۔ رام چندر۔ دہلی ۱۸۴۸ء صفحات ۳۳۵

جغرافیہ

۱:۔ فتح گڑھ نامہ (احوال ضلع فتحگڑھ) کالی رائے دہلی ۱۸۴۹ء صفحات ۲۰۴

۲:۔ علم جغرافیہ مترجمہ میر غلام علی کلکتہ ۱۸۵۱ء صفحات ۲۲۰

۳:۔ جغرافیۂ عالم۔ دہلی ۱۸۵۳ء صفحات ۱۰۹

۴:۔ خلاصۃ الجغرافیہ۔ آگرہ ۱۸۵۴ء

۵:۔ جغرافیہ کا پہلا رسالہ مترجم از انگریزی۔ میر غلام علی، مدراس ۱۸۵۳ء

۶:۔ جغرافیہ ہند از انگریزی، پنڈت سواروپ نراین و شیوا روپ نراین دہلی ۱۸۴۸ء صفحات ۱۲۲

طبعیات

۱:۔ عجائب روزگار ۔ رام چندر دہلی ۱۸۴۷ء

۲:۔ بجلی کی ڈاک ۔ جے ۔ ڈبلیو ۔ بیل، آگرہ ۱۸۵۴ء

۳:۔ ہوا کا بیان، بدری لال بنارس ۱۸۵۴ء

۴:۔ علم حکمت (میکنکس) چارلس فنک کلکتہ ۱۸۴۳ء صفحات ۳۰۱

۵:۔ معدنیات، جواہر لال، آگرہ ۱۸۵۵ء

۶:۔ خلاصۃ الصنائع (ترجمہ از انگریزی) بھولا ناتھ۔ آگرہ ۱۸۵۴ء۔ صفحات ۱۱۲

۷:۔ مرأۃ العلوم، ہری ورمن لال، بنارس، ۱۸۴۹ء

۸:۔ رسالۂ مقناطیس ۔ ترجمہ از انگریزی، سید کمال الدین۔ دہلی ۱۸۵۰ء صفحات ۲۷۱

۹:۔ تحصیل فی جر الثقیل ۔ سید احمد خاں، آگرہ ۱۸۴۴ء

۱۰:۔ اصول علم طبعی، ترجمہ از انگریزی، اجودھیا پرشاد و سیوا پرشاد۔ دہلی ۱۸۴۸ء صفحات ۱۶۹

۱۱:۔ اصول جرثقیل، محمد احسن، بنارس ۱۸۵۴ء

۱۲:۔ اصول قواعد مائیات، ترجمہ انگریزی، اجودھیا پرشاد، دہلی ۱۸۵۰ء صفحات ۲۶۴

۱۳:۔ مقاصد العلوم، ترجمہ انگریزی۔ سید محمد میر ۱۸۴۱ء کلکتہ

۱۴:۔ دائرۂ علم (نیچرل فلاسفی) محمد کرم بخش، لکھنؤ ۱۸۶۹ء

معاشیات (پولیٹکل اکانومی)

۱:۔ ترجمہ معاشیات مل ۔ وزیر علی، دہلی ۱۸۴۴ء صفحات ۱۸۴

۲:۔ اصول علم انتظام مدن ۔ ترجمہ انگریزی ۔ دھرم نرائن ۔ دہلی ۱۸۴۹ء

منطق

۱:۔ ترجمہ شمسیہ، مولوی سید محمد، دہلی ۱۸۴۴ء "

فقیر محمد خاں گویاؔ

حالات آپ کا نام فقیر محمد خاں ہے اور گویاؔ تخلص ہے۔ آپ حضرت ناسخؔ کے ارشد تلامذہ میں شمار کیے جاتے ہیں۔ زمانۂ شاہی میں آپ رسالہ دار تھے۔ اور حسام الدولہ کے خطاب سے مخاطب تھے، اور عمائد اراکین واعیانِ سلطنت اودھ میں سے تھے۔ آپ نے انوارِ سہیلی کا ترجمہ اُردو میں کیا۔ اور اُس کا نام بستانِ حکمت رکھا۔ یہ کتاب چودھویں ذیقعدہ ۱۲۵۱ھ کو خود اُنہی کے الفاظ میں بوقتِ صبح جبکہ ہنوز نیرِ اعظم نے علم نورانی اُفقِ مشرق سے بلند نہیں کیا تھا مقام دارالسلطنت لکھنؤ میں ختم ہوئی، اور شیخ ناسخؔ نے اسکے اختتام پر یہ تاریخ کہی:-

زہے نسخۂ حکمت آمیز ناسخ	کہ ہر باب واکرد، صدبابِ حکمت
مسمّیٰ بہ بستانِ حکمت نمودند	برائے تماشائے اربابِ حکمت
گل و برگ و شاخ و ثمر جملہ حکمت	شد ایں باغ سرسبز با آبِ حکمت
بہ لطفِ سبب کز ریاست شکرش	فراہم شدہ جملہ اسبابِ حکمت
پئے سالِ تاریخِ اتمام ناسخؔ	خرد گفت بستانِ سیرابِ حکمت

ترجمہ پر رائے مترجم ممدوح الصدر نے باتفاق مشورہ چند اُستادانِ نامی و گرامی و زباں آورانِ لکھنؤ خاص کر شیخ امام بخش ناسخؔ و خواجہ وزیر صاحب وزیرؔ یہ ترجمہ فرمایا ہے۔ اُس زمانہ کی تحریر کے مطابق ترجمہ بہت اچھا ہے لیکن عربی فارسی الفاظ بکثرت استعمال کیے ہیں، اکثر جگہ فارسی اشعار بدستور رہنے دیے ہیں اور عربی ضرب الامثال یا مقولے بھی جوں کے توں پائے جاتے ہیں، اسی وجہ سے عبارت آسان اور زود فہم نہیں ہے اور بعض الفاظ ثقیل اور مشکل بھی ہیں۔ کہیں کہیں فارسی اشعار کا اُردو اشعار میں ترجمہ بھی کردیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ کتاب فی الجملہ اصل مضمون کی بدولت قابلِ مطالعہ ہے اور نہایت مفید اور کار آمد ہے۔ اگر یہ کتاب بچوں کو گلستاں اور بوستاں کی طرح اُردو میں بھی پڑھائی جائے تو خاصی لیاقت پیدا ہوجائے اور

پند و نصیحت کی بہت سی باتیں معلوم ہو جائیں۔ اب ہم ذیل میں کچھ عبارت بطور نمونہ درج کرتے ہیں،

بستانِ حکمت کا نمونہ

"اور بلا شک جب تک میرے دم میں دم ہے، امر خیر خواہی میں دریغ نہ کرونگا کہ حق نمک میری گردن پر ہے، گو اس میں جان جانے یا رہے اب انصاف اس کا بادشاہ کے ہاتھ ہے اور اَلْحَقُّ مُرٌّ یہ بات بھی سچ ہے۔ اس صورت میں کب میں کسی کو بھلا معلوم ہونگا۔ بیت

جس جس سے راست بولا وہ مجھسے کج ہوا ہے
خاموش رہ ہمیشہ سچ بولنا برا ہے

اور میں یہ جانتا تھا کہ اہلِ نفاق میرے قتل پر اتفاق کرینگے۔ پر مجھے یہ یقین نہ تھا کہ مکافاتِ خیر خواہی اور نتیجۂ خدمت گزاری یہ ہوگا کہ میری بقا بادشاہ کو متردد اور رنجور رکھیگی۔ جبکہ دمنہ نے یہ بات یہاں تک پہنچائی اور شام قریب آئی، بادشاہ نے حکم دیا کہ دمنہ کو دار القضا میں سپرد کرو، تا قاضی اسکا حال دریافت کرے کہ احکامِ سیاست میں جب تک شرائطِ شرعی تمام ہونگے کچھ حکم نہ کیا جائیگا۔ دمنہ نے کہا کہ کون حاکم راست کار۔ بادشاہ سے زیادہ ہے۔ اور کون قاضی، عادل، شہریار سے بالاتر ہے، الحمد للہ کہ ضمیر منیر بادشاہ، آئینہ ہے باصفا، بلکہ جامِ جہان نما، کہ صورتِ حال ہر ملازم و رعایا کی اُس میں ہویدا ہے۔ رباعی سودا

ایوانِ عدالت میں تمہارے ای شاہ ہے ظلم کو کیا دخل عیاذاً باللہ
شیشے کا اگر طاق سے ٹوٹے ہے پاؤں پتھر سے نکلتی ہے صدا بسم اللہ

اور یہ یقین اتنا جانتا ہوں کہ کشفِ شبہات اور رفع حجاب میں کوئی چیز برابر فراستِ بادشاہ جمجاہ کے نہیں ہے۔ اگر خود شہریار بنفسِ نفیس، رائے جہاں آرا کو قاضی میرے حال کا فرمائے تو کذب اور صدق میرا مانند صبحِ صادق کے، روشن ہو جائے جیسا کہ حافظ رح نے فرمایا بیت

عرضِ حاجت در حریمِ حضرتت محتاج نیست راز کس مخفی نماند بر فروغِ رائے تو

شیر نے کہا کہ اے دمنہ اندیشہ نہ کر کہ اس مہم میں جستجوئے تمام کی جائیگی اور تحقیق اس کام کی

اس طرح پر کہ زیادتی اس سے متصور ہو عمل میں نہ آئیگی۔ **نظم**

جُدا کرینگے ہم اس طرح حق و باطل کو — کہ جیسے دودھ سے مکھی نکال لیتے ہیں

نکال لیتے ہیں جس طرح عطر پھولوں سے — ہر ایک بات کا ہم جی نکال لیتے ہیں

دمنہ نے کہا کہ میں بے گناہی کے سبب مبالغے میں زیادہ اہتمام کرتا ہوں اور یہ بھی جانتا ہوں کہ اس تحقیق سے اخلاص میرا زیادہ تر ظاہر ہوگا۔ اگر میں اس کام میں گنہگار ہوتا تو حاضر درگاہ شہریار نہ رہتا اور فرار اختیار کرتا بلکہ **فسیروا فی الارض** پڑھکر اور اقلیم کی راہ لیتا کہ ملکِ خدا تنگ نہیں اور پاؤں بندے کا لنگ نہیں ہے۔ شیر کی ماں نے کہا کہ اے دمنہ تیرا مبالغہ و غدغے سے خالی نہیں ہے، مگر تو زیرکی سے چاہتا ہے کہ آپ کو بیگناہ کر دکھائے ولیکن اگر کوئی اچھی طرح دریافت کریگا تو اس مضیق سے خلاصی پانا تیرا فکرِ محال اور سودائے باطل ہے۔ دمنہ نے کہا کہ میرے دشمن بے شمار ہیں، امیدوار ہوں کہ میرا کام ایسے امین کو سپرد ہو کہ غرض اور شبہ سے پاک ہو اور جو کچھ کہ راست براست ہو حضور میں باریابانِ بادشاہی کے عرض کیا کرے اور بادشاہ عالیجاہ بعد استماع مشورہ اپنی رائے جہاں آرا کے کہ آئینہ جہاں نما ہے حکم فرمائے۔ تا میں بمجرد شبہے کے مارا نہ جاؤں اور شہریار روزِ جزا خونِ ناحق میں مبتلائے بازخواستِ سلطانِ حقیقی ہو اور یہ مطلع مؤلف کا میرے حال کے موافق ہے:۔

غم نہیں اسکا مجھے میں مر گیا — غم یہ ہے قاتل کا خنجر بھر گیا

سبب ترجمۂ کتاب

جناب گویا نے سبب ترجمۂ کتاب میں یوں زبان گویائی ہے:۔

"اب سنا چاہیے کہ ایک روز بندہ اور خواجہ وزیر اور میاں فرخ شاعر کہ یہ دونوں شاگرد ارشد شیخ ناسخ صاحب کے ہیں اور چند احباب اور بھی باہم بیٹھے ہوئے تھے اور وقت شغل انوار سہیلی کے مطالعے کا تھا اور اُس کے مصنف کی فکرِ رسا پر سب نے زبانِ ثنا کھولی تھی کہ سبحان اللہ مصنف اس کا عجب حکیم بے مثل تھا، اور عجب کتاب تصنیف کی ہے کہ گنجینہ ہے اسرارِ الٰہی کا اور خزینہ ہے فیضِ غیر متناہی کا، بلکہ قرینہ اس پر دال ہے کہ جو کچھ اُس نے

بیان کیا ہے، مظنتہ ہے کہ با مدادِ الہامِ غیبی ہو، ورنہ آرائے انسان ضعیف البنیان، کب کُنہ کو اس قدر جوئیاتِ عالم کے پہنچ سکتی ہے، اگر مطالب اس کتاب کے کوئی بچشمِ غور دیکھے تو کوئی دقیقہ فوائدِ دینی اور دنیوی سے باقی نہیں چھوڑا ہے، اور اگر کوئی غریب و فقیر خواہ رئیس و امیر خصوصاً بادشاہ اس کتاب کے مطالب کو اپنا قبلۂ مقاصد کرے تو یقین ہے کہ سعادتِ دارین سے سرفرازی پائے اور رونق اُس کے ہر امر کی روز بروز ترقی کرتی جائے۔ اس گفتگو میں سب اہلِ محفل نے اصرار کیا کہ اکثر زبانوں میں ترجمہ اس کا ہو چکا ہے، اگر تم اُردو میں اُسے ترجمہ کر دو تو خوب چیز ہو۔ راقم نے ہر چند عذر کیا، پیش رفت نہ ہوا۔ کچھ منجانب اللہ بندے کو بھی توفیق رفیق ہوئی اور ہمت اس پر آئی کہ "وما توفیقی الا باللہ" کہکر ارادہ کرو۔ اگر فضلِ الٰہی شاملِ حال ہے تو سب بخیر و خوبی انجام ہوگا۔ لہٰذا خدا کی عنایت پر تکیہ کرکے شروع کیا جاتا ہے"

آگے چلکر آپ لکھتے ہیں:۔

"جس نے انوارِ سہیلی کو دیکھا ہوگا، آپ نظرِ تامل سے مطالعہ کرے گا، اُس پر خود منکشف ہو جائیگا کہ گویا صورت کتاب کی اور ہی ہو جائیگی۔ برائے نام ترجمہ کیا جاتا ہے۔ ورنہ یہ کتاب حقیقت میں جُدا جُدا ہے۔ لیکن حق یوں ہے کہ یہ احسان نقاشِ اول کا ہے، ورنہ مجھ سے بے مایہ کو کہاں طاقت اس کے بیان کی تھی"

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ نے آزادی کے ساتھ ترجمہ کیا ہے، مکھی کی جگہ مکھی نہیں ماری یہی وجہ ہے کہ ترجمہ شگفتہ اور معنی خیز ہے۔

مرزا رجب علی بیگ سرورؔ

حالات مرزا رجب علی بیگ، مرزا اصغر علی لکھنوی کے بیٹے تھے، لکھنؤ میں پیدا ہوئے اور یہیں تعلیم و تربیت حاصل کی۔ سرور تخلص اختیار کیا اور فنِ شعر میں آغا نوازش حسین خاں نوازش کے شاگرد ہوئے۔ اگرچہ آپ مذاقِ سخن رکھتے تھے اور صاحبِ دیوان تھے لیکن آپ کی شہرت زیادہ تر نثر نگاری کی وجہ سے ہے۔ آپ کی کئی تصنیفات ہیں، لیکن فسانۂ عجائب اپنے خاص رنگ میں بہترین تصنیف ہے جو ۱۸۲۵ء میں بعہد نصیر الدین حیدر بادشاہ لکھنؤ لکھی گئی اور جس کی عبارت مقفّٰی و مسجع ہے، یہ رنگینی اور قافیہ پیمائی فارسی تحریروں میں پائی جاتی ہے، لیکن اُردو میں اس اندازِ تحریر کے آپ ہی موجد ہیں۔ جس طرح اُردو میں آجکل یہ رنگ پسند نہیں کیا جاتا، حال کی فارسی بھی اس قسم کی تکلفانہ عبارتوں سے معرّا ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ سرور کی یہ طرزِ عبارت آرائی اس دور کے جملہ مصنفین میں کم و بیش پائی جاتی ہے۔ اگرچہ مرزا غالب مرحوم نے اُردو خطوط نویسی میں اس تصنع اور تکلف کو مطلق جگہ نہیں دی لیکن کتابوں کی تقریظ یا دیباچہ لکھنے میں اُن کا قلم بھی سرور کی طرح اس طرز سے آزاد نظر نہیں آتا۔ ہاں مرزا غالب کی مسجع نثر میں تصنع اور آورد کا رنگ کم ہے۔ کیونکہ دوسرے فقرے میں تقریباً ویسی ہی بے تکلفی پائی جاتی ہے جیسی پہلے فقرے میں (دیکھو حالاتِ مرزا غالب)

سرورِ سلطانی، شمشیر خانی کا ترجمہ ہے جو سلطانِ عالم واجد علی شاہ کے حکم سے کیا گیا تھا۔ گلزارِ سرور بھی حدائق العشاق کا ترجمہ ہے۔ اور مہاراج ایسری پرشاد نارائن سنگھ کی فرمائش سے کیا گیا ہے۔ ان کتابوں کے علاوہ شگوفۂ محبت ایک اور قصہ ہے اور انشائے سرور ایک اور کتاب ہے جو آپ سے یادگار ہے۔ ایک نثر اور ایک قصیدہ پرنس آف ویلز ولیعہد ملکہ وکٹوریہ کے جشنِ شادی کی تہنیت میں لکھا ہے جس کا ایک شعر یہ ہے۔

باپ میں شوکتِ شاہی تھی پسر زینتِ تخت ۔۔۔ ماں کے پرتو سے پری خانہ ہے شہرِ لندن

ایک نثر مہاراجہ بنارس کی سواری کی تعریف میں لکھی ہے۔ جملہ تصانیف کا رنگ ایک ہی ہے جو اب بالکل متروک ہے۔

ایک تذکرہ سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ ۱۸۴۳ء تک لکھنؤ میں رہے، ہمارے نزدیک یہ کہنا صحیح نہیں کیونکہ خود سرور نے گلزار سرور میں لکھا ہے کہ حضرت واجد علی شاہ نے ۹ برس تک حکومت کی اور ۱۸۵۶ء میں اُن کو معزول کیا گیا۔ پس ۱۸۴۷ء سالِ جلوس ہوا۔ اور جب کہ آپ نے چند کتابیں بادشاہ کے حکم سے لکھیں اور آپ کی دربارِ شاہی تک رسائی تھی تو کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ آپ ترکِ وطن پر فوراً آمادہ ہوئے ہوں۔

گلزارِ سرور میں جس کا نمونہ ہمنے درج کیا ہے غزل شاہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "شرفا معاش سے تنگ وحیران ہوئے، ایسے نکلے کہ بے نام ونشان ہوئے، از انجملہ فقیر وہاں کس شمار میں تھا" اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انتزاع سلطنت تک آپ لکھنؤ میں رہے اور بعد ازاں مہاراج ایسری پرشاد نارائن سنگھ کی خدمت میں باریاب ہوئے، سُنا ہے کہ ۱۸۶۳ء میں آپ کلکتہ گئے تھے اور وہاں سے واپس آکر تھوڑے ہی دنوں بعد لکھنؤ میں انتقال کیا۔

سرور کی انشاپردازی پر رائے

ایک صاحب سرور کی انشاپردازی کے متعلق لکھتے ہیں کہ:-
"فسانۂ عجائب نثر کی اُس طرزِ تحریر کا اعلیٰ نمونہ ہے جس کی بنا تصنع اور بناوٹ پر ہے اور جس کی دلاویزی کا مدار مصنوعی حسن پر ہے، ایک زمانہ میں اُردو کے انشاپردازوں میں یہ طرز نہایت مقبول تھی مگر اب کچھ تو غالب اور آزاد کی تقلید اور کچھ انگریزی تہذیب کے اثر سے لوگوں نے اس کو ترک کر دیا ہے، تاہم فسانۂ عجائب کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک اعلیٰ درجہ کا انشاپرداز اس رنگ میں بھی کیا کیا رنگینیاں پیدا کر سکتا ہے گواسی کے ساتھ یہ بات بھی اچھی طرح ظاہر ہو جاتی ہے کہ اس طرز کا میدان کس قدر تنگ ہے اور زمانۂ حال کی دوا دوش کے لیے کس قدر ناموزوں ہے"

نمونہ از فسانۂ عجائب

ذیل میں فسانۂ عجائب کی مختصر عبارت بطور نمونہ نقل کیجاتی ہے۔

(یہ کتاب بازار میں عام طور پر فروخت ہوتی ہے اس لیے اختصار مدِ نظر ہوا)

طوطا خریدنا جانِ عالم کا

"ایک روز گزر جانِ عالم کا گزری میں ہوا۔ انبوہِ کثیر، ہجوم عظیم نظر آیا۔ شہزادہ اُدھر متوجہ ہوا۔ دیکھا ایک مردِ نحیف، ستر اسّی برس کا سن، نہایت ضعیف پنجرہ ہاتھ میں لیے کھڑا ہے۔ اُس میں ایک جانور، مانندِ ساکنانِ جناں سبز پوش، باستغفار گفتار لطیفے رنگین اور نکتے قابلِ تعریف و نمکین بیان کرتا ہے۔ شاہزادے کو دیکھتے ہی طوطا اپنے مالک سے بولا۔ اے شخص! کوکبِ بخت تیرا افلاس کے بُرجِ تیرہ سے نکلا، نصیب چمکا۔ طالع برسرِ یاوری اور زمانہ آمادۂ مددگاری ہوا! دیکھ ایسا شاہزادۂ عالی تبار متوجہ اس بے مقدار پر ہوا ہے۔ وہ بیکار، نے کارگاہِ بے ثبات میں میں ہوں جس کا طالب کہیں نہیں۔ بحدیکہ جانور ہوں اسیر بلّی کا کھاجا۔ مگر جو یہ نظرِ عنایت کرے ابھی تیرا ہاتھ پُر زر ہو۔ دامن گہر سے بھرے۔ جانِ عالم نے یہ سخن ہوش رُبا اور کلمۂ حیرت افزا کو سُن، طوطے عقل کے اُڑ گئے، پنجرہ اُس طائرِ ہمہ داں، جانورِ سحر بیاں کا ہاتھ میں لے کے مالک سے قیمت پوچھی۔ طوطے نے کہا۔ بیت

کب لگا ہے کوئی اس دلِ بے حال کا مول سب گھٹاتے ہیں مفلس کے غرض مال کا مول

مگر جو حضور کی مرضی۔ جانِ عالم نے لاکھ روپیہ خلعت کے سوا عنایت کیے اور پنجرہ ہاتھ میں لیے دولت سرا کو روانہ ہوا۔ گھر میں جا کر ماہ طلعت کو طوطا دکھایا یہ مصرع انشا کا پڑھا۔

بازار ہم گئے تھے اک چوٹ مول لائے

طوطے نے شہزادہ کو سخنانِ دلچسپ و قصص عجیب و حکایاتِ غریب سنا کر اپنے دامِ محبت میں اسیر کیا۔ یہ نوبت پہنچی کہ سوتے جاگتے دربار کے سوا جُدا نہ ہوتا جب دربار جاتا پنجرہ بتاکید حفاظت ماہ طلعت کو سونپ جاتا۔ اور دربار سے دیوانہ وار بشوقِ گفتار بے قرار جلد پھر آتا۔"

سرور نے ایک رقعۂ دعوتِ شادی لکھا ہے۔ چونکہ دلچسپ ہے اس لیے اُس کو ہم یہاں نقل کرتے ہیں:-

رقعۂ دعوتِ شادی

"امسال نیا ساز و سامان ہے، ہولی شب برات بہار سے دست و گریبان ہے، باغبانِ ازل و فیضِ چمن نکالے گا۔ بوٹہ بوٹا جوبن نکالیگا نسیم سحر غنچوں کی گانٹھ ٹٹولنے لگی۔ عبیر اور گلال گرہ سے کھولنے لگی۔ تختۂ لالہ چراغاں کا ڈھنگ دکھاتا ہے۔ نہروں میں فوارہ پچکاری کا رنگ دکھاتا ہے۔ کوسوں تک سبز مخمل کا فرش بچھا ہے شاداب کوہ وصحرا ہے۔ پتہ پتہ کانِ زمرد کا پتہ دیتا ہے شبنم کا قطرہ دُرِ بے بہا کا آویزہ ہے۔ کوہ میں کبک دری کا قہقہہ، باغ میں بلبل کا نالہ ہے صحنِ گلزار میں سبزے نے سر نکالا ہے۔ جس قلم تراش میں شاخ کا دستہ ہے۔ قوتِ نامیہ کے فیض سے ہر قلم گلدستہ ہے۔ اس گلشنِ ایجاد میں کیا نمونۂ قدرتِ پروردگار ہے کہ دست و گریباں خزاں و بہار ہے۔ اگر شاخ سے کوئی پتی مرجھا کر ٹوٹتی ہے تو برابر سبز کونپل پھوٹتی ہے۔ گل کی ہنسی پر گریۂ شبنم ہے کہ مہلت یہاں بہت کم ہے۔ بشر کو لازم ہے کہ فرصت غنیمت جانکر ان خیالوں سے درگزرے۔ جو امر ضروری ہو اُسے کر گزرے۔ لہٰذا صدر نشینانِ بزمِ طرب و سرور۔ انجمن آرایانِ جلسۂ شادی و سور کی خدمت میں امیدوار ہوں کہ از راہ دوستانہ بے عذر و بے بہانہ رونق بخشِ جلسۂ احباب ہوں۔ خاکسار رہینِ منت ہوگا"

گلزارِ سرور

ایک شخص رضی پسر محمد شفیع نے جو نظام الدولہ نواب الہ ویردی خاں حاکم بنگالہ کا مصاحب تھا، کتاب حدایق العشاق کو بعبارتِ فارسی تحریر کیا تھا۔ مرزا رجب علی بیگ سرور نے سلطنتِ اودھ کے الحاق کے بعد مہاراج الیسری پرشاد نارائن سنگھ بہادر کی فرمائش سے، اسکو فارسی سے اردو میں ترجمہ کیا۔ عبارت مقفّٰی و مسجع ہے۔ وہی فسانہ عجائب کا انداز ہے، اور نام اس کتاب کا گلزار سرور ہے حسب ذیل عبارت بطور نمونہ نقل کیجاتی ہے۔

نمونۂ گلزارِ سرور

مذکور آوارۂ وطن، خزاں دیدۂ چمن، مترجم حدائق العشاق رجب علی بیگ سرور عفی عنہ۔

"یہاں سے نقاشِ ثانی، معترفِ نادانی، گردش دیدہ، بلا رسیدہ، یار و دیار سے دور رجب علی بیگ سرور، اپنی گذشتہ داستانِ حیرت بیان لکھتا ہے۔ بارہ سو چوہتر ہجری (۱۲۷۴) شہر شعبان

میں فلک نے وہ سامان کیا۔ گلزار لکھنؤ پہ عین بہار میں خزاں آئی۔ اس شعبدہ باز کہن نے نئی نیرنگی
دکھائی۔ بعد خرابی شاہجہان آباد، یہ زمین بسی، سب طرح کی خلقت کا یہاں قیام ہوا، دور دور
اس شہر کا شہرہ ہوا، نام ہوا، اس سلیقہ سے آباد ہوا کہ دنیا کی بلک اس کے روبرو ویران تھی۔
سرزمین شام کی صبح ہو گئی۔ اپنے شہر کی کیفیت اور فضا پر ترجیح دیتے ساکن شیراز و اصفہان
تھے۔ ہر گلی گلزار، جو کوچہ نظر پڑا پُر بہار تھا۔ خزاں بار نہ پاتی تھی، بہار کا دل نثار تھا۔ سب علم و فضل
کے کامل، ہر فن کے اُستاد شامل ایک جا تھے۔ عقل حیران تھی وہ کون تھے کیا تھے۔ جو کسی کمال کا
کسی طرف سے آیا، جفا دیدۂ روزگار بے برگ و بار تھا، بچشم زدن سرسبز ہو کے نہال ہو گیا۔
قدر شناسی ہوئی مالا مال ہو گیا۔ سیکڑوں شہر اس کی بدولت بستے تھے، اشرفی روپیہ کے منھ
برستے تھے۔ جو چیز گرانبہا جس ملک میں کسی کاریگر نے بنائی وہ بکنے کو یہیں آئی۔ سرد مہر کا
بازار تھا۔ اور کہاں ایسا خریدار تھا۔ بے فکری اس جا کی دور دور مشہور تھی۔ بقول مشہور لنگوٹی
میں پھاگ کھیلتی تھی، فاقہ کشی میں ڈنڈ پیلتی تھی، اپنے زعم میں قیصر و فغفور تھی۔ ایسی چمک دمک
ہوئی کہ حد سے گزر گئی۔ ہر کمالے را زوالے، فلک کو اُجاڑنا، اس کا نام و نشان بنا کے بگاڑنا منظور
تھا۔ وگرنہ بادشاہ کے دل میں، نہ یہاں کی رعایا کی طبیعت میں فتور تھا۔ حضرت واجد علی شاہ
سلطان عالم نے نو برس محمد شاہی کی۔ اس پر سرکار سے سرتابی نہ کی بلکہ عذر خواہی کی۔ قیصر باغ
کو غیرت گلزار ارم بنایا تھا۔ کیا لکھوں رات دن جو لطف اُٹھایا تھا، خدا جانے کس کمبخت کی نظر
اس شہر کو کھا گئی، امیر فقیر سب پر تباہی آ گئی۔ پہلی بسم اللہ یہ ہوئی: صاحبان عالیشان نے اسکی
خرابی کا خیال کیا۔ دیا ہوا ملک بے سبب لیا۔ وہ کلکتہ فریاد کو گئے، اپنی داد کو گئے، بیگم صاحبہ
ولیعہد بہادر، جرنیل صاحب یہ قافلہ لندن روانہ ہوا، قضا کو بہانہ ہوا۔ پہنچے جناب بیگم صاحبہ
نے رحلت فرمائی۔ بعد جرنیل صاحب کو مرگ جوانی آئی۔ مصرع

این ماتم سخت است کہ گویند جواں مُرد

ہند میں فوج سرکار، قدیم نمک خوار، پیادہ اور سوار، شامت اعمال سے پھر گئے۔ غربا سے اُمرا تک

بلائیں گھر گئے۔ جابجا شور و شر مچا، قتل و غارت سے فساد ہوا۔ مجنوں کا کیا بگڑا، ہندوستان اس بکھیڑے میں برباد ہوا۔ پہلے دہلی اُجڑی، پھاٹک ٹوٹا، پھر لکھنؤ لوٹا، یہاں تک کہ بے چراغ ہوا۔ بے بہمن و دے پامالِ خزاں خانہ باغ ہوا۔ شرفا معاش سے تنگ و حیران ہوئے۔ ایسے نکلے کہ بے نشان ہوئے ازاں جملہ فقیر وہاں کس شمار میں تھا، نہ خلیفۂ رعیت، نہ غلامانِ شہریار میں تھا۔ مگر غربا نوازی، شرفا پروری کی راہ سے مہاراج بہادر رام دولتھم نے یاد فرمایا۔ سر کے بل یہ بے سرو پا چلا آیا۔ ملازمت حصول ہوئی، سعادت حصول ہوئی، مسافر پروری کی، ناموری کی۔ للہ الحمد امیر جوہر شناس قدر دان ہاتھ آیا، زیست باقیماندہ بسر کرنے کو مکان خوب پایا۔ اگر فلکِ سفلہ پرور حسد شعار جل نہ جائے، چکر کر کے رنگ نہ لائے :۔

ایک روز حسب اتفاق نسخہ حدائق العشاق نظر سے گزرا اُسکے ترجمہ کرنیکو فقیر سے ارشاد فرمایا۔ ہر چند عذر کیا کہ اب تحریر کا زمانہ نہیں، حواس مختلف ہوش کا ٹھکانا نہیں نشۂ جوانی لطفِ زندگانی گھٹ گیا، جہان کی قصہ کہانی ہوگئی دل ہٹ گیا، قبول نہ ہوا، ناچار الامر فوق الادب سمجھ کے احکام بجا لایا۔ اطاعت سے سر نہ پھرایا۔ خزاں کی باریابی سے معذور ہے، تاہم اس کا گلزار سرور ہے۔ گو مزے اور کیفیت سے یہ نثر عاری ہے۔ فقط تحریر فرماں برداری ہے۔ ناظرین پر تمکین سے عرض پیرا ہوں، کیا میرا لکھنا اور میں کیا ہوں، صاحب زبان فارسی دان کے روبرو ہندی کیا چیز ہے العاقل تکفیۃ الاشارہ شرط تمیز ہے"

۱۲۶۴ھ ہجری میں مرزا رجب علی بیگ سرور نے شمشیر خانی کا ترجمہ اُردو زبان میں بنام سرور سلطانی کیا۔ اس کتاب میں ایران کے مشہور بادشاہوں کا حال درج ہے، غالباً کسی نے فردوسی کے شاہنامہ کو نثر کر دیا ہے اور اُسکا ترجمہ سرور نے فرما دیا ہے۔ مختصر عبارت نقل کی جاتی ہے :۔

نمونہ از شمشیر خانی

"راویانِ اخبار و حاکیانِ آثار متفق ہیں کہ پہلے جس نے گلزار بے ثبات میں روش سلطنت نکالی، تخت و تاج کی بنا ڈالی، عدل و داد کو رواج دیا، محصول و خراج

لساوہ کیومرث تھا۔ الا بود و باش کوہ و بیابان کی، اور پوشاک پوست حیوان کی، بیٹا اُسکا سیامک
نام تھا۔ اُسکو عبادت کے سوا اور نہ کچھ کام تھا۔ دیو نے اُسکو مارا۔ کیومرث کو بہت قلق ہوا،
ہوسنگ، سیامک کا بیٹا تھا۔ اُس نے باپ کے خون کا بدلا لیا۔ دیو کو قتل کیا تیس برس
کیومرث نے سلطنت کی، پھر دار فنا سے رحلت کی۔ یہ قولِ فردوسی ہے۔ اس نام کی تحقیق
میں کیومرث کاف فارسی اخیر تاء فوقانی اور آئمہ اخبار نے اختلاف کیا ہے۔ امام غزالی
نے اس داوی سے رم کیا ہے۔ بزرگترین اولاد صلبی آدم لکھا ہے۔ بعضے کہتے ہیں ولیم بن لاو
بن سام بن نوح ہے اور مصنفِ روضۃ الصفا لکھتا ہے کہ یافث بن نوح کا بیٹا ہے،
عرب اُس کو عام عجم کیومرث کہتے ہیں اور علمائے مجوس آدم اسی کو جانتے ہیں کلشاہ کہکے
مانتے ہیں۔ ہزار برس کا سن اور چالیس برس سلطنت کے دن"

اس کتاب میں ۱۹۶ صفحات ہیں جنکو سرور نے دو مہینے میں لکھا ہے، کتاب کے آخر میں
مشکل الفاظ کی ایک فرہنگ بھی دی ہے جسکو قاموس، برہان، سراج اللغات، موید الفضلا
فرہنگ شاہنامہ، اور غیاث اللغات سے مرتب کیا ہے۔ اس فرہنگ کے آٹھ صفحات ہیں
اور اس طرح کل کتاب ۲۰۴ صفحات پر ختم ہو گئی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ فرہنگ منشی نولکشور
نے لکھوائی ہے کیونکہ منشی صاحب نے پہلی مرتبہ اس کتاب کو سنہ ۱۸۸۷ء میں چھپوا کر شائع کیا ہے۔

مرزا اسد اللہ خاں غالب

غالب نامِ آورم نامِ و نشانم مپرس — ہم اسد اللّٰہم و ہم اسد اللّٰہیم

تاریخ ولادت و خاندان

میرزا اسد اللہ خاں غالب المعروف بہ میرزا نوشہ۔ المخاطب بہ نجم الدولہ
دبیر الملک اسد اللہ خاں بہادر نظام جنگ۔ المتخلص بہ غالب و اسد
آٹھویں ماہ رجب سنہ ۱۲۱۲ ہجری کو شہر آگرہ میں پیدا ہوئے۔ مرزا کے خاندان کا حال یہ ہے کہ اُنکے

آبا و اجداد ایبک قوم کے ترک تھے اور اُن کا سلسلۂ نسب تور ابن فریدوں تک پہنچتا ہے۔ جب کیانی تمام ایران و توران پر مسلط ہوگئے اور تورانیوں کا جاہ و جلال دنیا سے رخصت ہوگیا، تو ایک مدت دراز تک تور کی نسل ملک و دولت سے بے نصیب رہی، مگر تلوار کبھی ہاتھ سے نہ چھوٹی چنانچہ خود فرماتے ہیں :-

سو پشت سے ہے پیشۂ آبا سپہگری　　کچھ شاعری ذریعۂ عزت نہیں مجھے

بارے ایک مدت کے بعد اسلام کے عہد میں اسی تلوار کی بدولت ترکوں کے بخت خفتہ نے پھر کروٹ بدلی اور سلجوقی خاندان میں ایک زبردست سلطنت کی بنیاد قائم ہوگئی کئی سو برس وہ تمام ایران و توران و شام و روم پر حکمران رہے۔ آخر ایک مدت کے بعد سلجوقیوں کا ستارہ بھی گردش میں آیا اور سلجوق کی اولاد جا بجا منتشر و پراگندہ ہوگئی۔ اُنہی میں سے ترسم خاں نام ایک امیر زادے نے سمرقند میں بود و باش اختیار کرلی تھی۔ مرزا کے دادا جو شاہ عالم کے زمانے میں سمرقند سے ہندوستان میں آئے وہ اسی ترسم خاں کی اولاد میں تھے۔

مرزا کے دادا کی زبان بالکل ترکی تھی اور ہندوستان کی زبان بہت کم سمجھتے تھے۔ مرزا کے دادا کو سلطنت کی حیثیت کے موافق ایک عمدہ منصب اور پہاسو کا سیر حاصل پرگنہ ذات اور رسالے کی تنخواہ میں دیا گیا۔ اُن کے کئی بیٹے تھے جن میں سے دو کے نام معلوم ہیں۔ ایک مرزا کے باپ عبداللہ بیگ خاں عرف میرزا دولہا اور دوسرے نصراللہ بیگ خاں۔ عبداللہ بیگ خاں کی شادی خواجہ غلام حسین خاں کمیدان کی بیٹی سے ہوئی تھی جو سرکار[۱] میرٹھ کے ایک معزز افسر اور عمائدِ شہر آگرہ میں سے تھے۔ مرزا عبداللہ بیگ خاں نے بطور خانہ داماد کے اپنی تمام عمر سسرال میں بسر کی اور اُن کی اولاد نے بھی وہیں پرورش پائی۔ مرزا عبداللہ بیگ خاں کے دو بیٹے ہوئے، ایک مرزا اسداللہ خاں اور دوسرے مرزا یوسف خاں جو ایام شباب میں مجنون ہوگئے تھے اور اُسی حالت میں ۱۸۵۷ء میں انتقال کیا۔ خود مرزا نے ایک موقع پر جبکہ بھائی نے بیماری

---

[۱] سرکار ملک کے اُس حصے کو کہتے تھے جو صوبہ کی نسبت چھوٹا اور پرگنہ و محال وغیرہ سے بہت بڑا ہوتا تھا۔

سے شفا پائی ہے یہ مقطع کہا ہے ؎

دی مرے بھائی کو حق نے از سر نو زندگی — میرزا یوسف ہے غالبؔ یوسفِ ثانی مجھے

مرزا کے والد عبداللہ بیگ خاں اوّل لکھنؤ میں جاکر نواب آصف الدولہ کے ہاں نوکر ہوئے اور چند روز بعد وہاں سے حیدرآباد پہنچے، اور سرکار آصفی میں تین سو سوار کی جمعیت سے کئی برس تک ملازم رہے مگر وہ نوکری ایک خانہ جنگی کے بکھیڑے میں جاتی رہی اور وہ واپس آگرے میں چلے آئے۔ پھر الور میں ملازمت کی غرض سے گئے اور وہاں ایک گڑھی کا زمیندار راج سے پھر گیا تھا۔ جو فوج اُس کی سرکوبی کے لیے گئی اُسکے ساتھ مرزا عبداللہ بیگ خاں کو بھی بھیجا گیا۔ وہاں پہنچتے ہی اُن کے گولی لگی اور وہیں اُن کا انتقال ہوگیا اور راج گڑھ میں دفن ہوئے۔ چنانچہ مرزا ایک قصیدہ میں کہتے ہیں:۔

کافی بود مشاہدہ شاہد ضرور نیست — در خاکِ راج گڑھ پدرم را بود مزار

مرزا غالبؔ کے چچا نصر اللہ بیگ خاں سرکاری فوج میں (لارڈ لیک کے لشکر میں) بعہدۂ رسالداری ملازم ہوئے۔ اُن کی ذات اور رسالے کی تنخواہ میں دو پرگنے یعنی سونک اور سونسا جو نواحِ آگرے میں واقع ہیں سرکار سے اُن کے نام پر مقرر ہو گئے۔ جب تک وہ زندہ رہے دونوں پرگنے اُن کے نامزد رہے، اور اُن کی وفات کے بعد اُن کے وارثوں اور متعلقوں کی پنشنیں سرکار نے فیروزپور جھرکہ کی ریاست سے مقرر کرا دیں۔ جس میں سے سات سو روپیہ سالانہ مرزا کو آخر اپریل ۱۸۵۷ء تک برابر ملتا رہا۔ مگر فتح دہلی کے بعد تین برس تک غدر کے تعلقات کے سبب یہ پنشن بند رہی۔ آخر جب مرزا کی ہر طرح سے بریت ہوگئی تو پنشن پھر جاری ہوگئی اور تین برس کی واصلات بھی سرکار نے عنایت کی جب تک پنشن بند رہی، مرزا کے دوستوں کو نہایت تعلق خاطر رہا

لطیفہ اکثر لوگ پنشن کا حال دریافت کرنے کو خط بھیجتے تھے۔ ایک دفعہ میر مہدی نے اسی مضمون کا خط بھیجا تھا اُس کے جواب میں مرزا صاحب لکھتے ہیں:۔

"میاں بے رزق جینے کا ڈھب مجھکو آگیا ہے، اس طرف سے خاطر جمع رکھنا۔ رمضان کا

مہینہ روزے کھا کھا کر کاٹا، آگے خدا رزاق ہے، کچھ اور کھانے کو نہ ملا تو غم تو ہے"۔

تعلیم مرزا غالب مع اپنے چھوٹے بھائی کے سن شعور تک آگرے ہی میں رہے، اگرچہ سات برس کی عمر سے وہ دلی میں آنے جانے لگے تھے لیکن شادی کے بعد تک اُن کی مستقل سکونت آگرے ہی میں رہی اور شیخ معظم جو اُس زمانہ میں آگرہ کے نامی معلموں میں سے تھے اُن سے تعلیم پاتے رہے۔ اُسکے بعد ایک شخص پارسی نژاد جس کا نام آتش پرستی کے زمانہ میں ہرمزد تھا اور بعد مسلمان ہونے کے عبدالصمد رکھا گیا، غالباً آگرے میں سیاحانہ وارد ہوا اور دو برس تک مرزا کے پاس اوّل آگرے میں اور پھر دلی میں مقیم رہا۔ مرزا نے اُس سے فارسی زبان میں کسی قدر بصیرت پیدا کی، مرزا نے جابجا اُس کے تلمذ پر اپنی تحریروں میں فخر کیا ہے اور اُس کو بلفظ تیمار جو پارسیوں کے یہاں نہایت تعظیم کا لفظ ہے یاد کیا ہے۔ مرزا کی چودہ برس کی عمر تھی جب عبدالصمد اُن کے مکان پر وارد ہوا ہے۔ اور کل دو برس اُس نے وہاں قیام کیا پس جب یہ خیال کیا جاتا ہے کہ مرزا کو کس عمر میں اُس کی صحبت میسر آئی اور کس قدر قلیل مدت اُس کی صحبت میں گزری تو عبدالصمد اور اُس کی تعلیم کا عدم و وجود برابر ہو جاتا ہے۔ اِس لیے مرزا کا یہ کہنا کچھ غلط نہیں کہ مجھکو مبدأ فیاض کے سوا کسی سے تلمذ نہیں ہے ؎

انچہ در مبدأ فیاض بود آنِ من است　　　گل جدا نا شدہ از شاخ بداماں من است

تأہل چونکہ مرزا کے چچا کا رشتہ نواب فخرالدولہ کے خاندان میں ہو چکا تھا اور اس لیے اُنکے خاندان سے ایک نوع کا تعلق پیدا ہو گیا تھا، مرزا کی شادی نواب فخرالدولہ کے چھوٹے بھائی مرزا الٰہی بخش خاں معروف کے ہاں قرار پائی۔ تیرہ برس کی عمر میں ۷ رجب ۱۲۲۵ ہجری کو اُنکا عقد ہو گیا۔ اس تقریب سے اُن کی آمد و رفت دلی میں زیادہ ہو گئی اور آخر کار یہیں سکونت اختیار کر لی اور اخیر عمر تک دلی ہی میں رہے۔

دہلی و آگرہ شیراز و صفاہانِ من است

مرزا کے نانا کی آگرے میں ایک خاصی سرکار تھی جسکی بدولت اُن کے ملازم اور متوسلین

دس دس بارہ بارہ ہزار کے مالگزار بن گئے تھے اور مرزا کا بچپن اور عنفوانِ شباب بڑے الللے تللوں میں بسر ہوا تھا۔ خود لکھتے ہیں "اُس کٹرے کے ایک کوٹھے پر میں پتنگ اُڑاتا تھا اور راجہ بلوان سنگھ سے پتنگ لڑا کرتے تھے"۔

عنفوانِ شباب میں وہ شہر کے نہایت حسین خوش رو لوگوں میں شمار کیے جاتے تھے، اور بڑھاپے میں بھی حسانت اور خوبصورتی کے آثار اُن کے چہرے اور قد و قامت اور ڈیل ڈول سے نمایاں طور پر نظر آتے تھے، مگر آخیر عمر میں قلتِ خوراک اور امراض دائمی کے سبب وہ نہایت نحیف و زار و نزار ہو گئے تھے، لیکن چونکہ ہاڑ بہت چکلا، قد کشیدہ اور ہاتھ پاؤں زبردست تھے۔ اس حالت میں بھی وہ ایک نو وارد تورانی معلوم ہوتے تھے۔

مسکن دلی میں وہ قریب پچاس برس کے رہے۔ لیکن اپنے لیے نہ کوئی مکان خریدا اور نہ بنایا۔ جب ایک مکان سے جی اُکتا یا اُسے چھوڑ کر دوسرا مکان لے لیا۔ مگر قاسم جان کی گلی یا حبش خاں کے پھاٹک یا اُسکے قرب و جوار کے سوا کسی اور ضلع میں جا کر نہیں رہے سب سے اخیر مکان جس میں اُن کا انتقال ہوا حکیم محمود خاں مرحوم کے دیوانخانے کے متصل مسجد کے عقب میں تھا جس کی نسبت وہ کہتے ہیں:۔

مسجد کے زیرِ سایہ اک گھر بنا لیا ہے   یہ بندۂ کمینہ ہمسایۂ خدا ہے

جہاں اب ہندوستانی دواخانہ کی عمارت ہے سڑک کے اُس پار یہ مکان ہوگا لیکن اب تو وہ اصطبل معلوم ہوتا ہے۔

مطالعہ کتب جس طرح مرزا نے تمام عمر رہنے کے لیے مکان نہیں خریدا اسی طرح مطالعے کے لیے بھی، باوجودیکہ ساری عمر تصنیف کے شغل میں گزری، کبھی کوئی کتاب نہیں خریدی، اِلّا ماشاءاللہ۔ ایک شخص کا یہی پیشہ تھا کہ کتاب فروشوں کی دُکان سے لوگوں کو کرائے کی کتابیں لا دیا کرتا تھا۔ مرزا صاحب بھی ہمیشہ اُسی سے کرایہ پر کتابیں منگواتے تھے اور مطالعہ کے بعد واپس کر دیتے تھے۔

سفرِ کلکتہ مرزا نے کبھی کوئی لمبا سفر کلکتے کے سوا نہیں کیا۔ اسی سفر کی آمد و رفت میں وہ چند ماہ لکھنؤ اور بنارس میں بھی ٹھہرے تھے۔ کلکتے جانے کا سبب یہ تھا کہ جب مرزا کے چچا نصراللہ بیگ خاں نے وفات پائی تھی اُس وقت مرزا کی عمر نو برس کی تھی اور اُن کے بھائی کی عمر سات برس کی تھی۔ نصراللہ بیگ خاں کی وفات کے بعد اُن کے متعلقوں اور وارثوں کے لیے جن میں مرزا اور اُن کے بھائی بھی شریک تھے جو پنشن گورنمنٹ نے ریاست فیروز پور جھرکہ پر محوّل کر دی تھی جب تک مرزا صغیر سن رہے جو کچھ وہاں سے ملتا رہا پاتے رہے۔ جب سنِ تمیز کو پہنچے اور شادی بھی ہو گئی۔ عالمِ شباب اور خانہ داری کی ضرورتیں بہت بڑھ گئیں اور گھر میں جو کچھ اثاثہ تھا وہ بھی چند روز میں سب خرچ ہو گیا۔ لاچار فکرِ معاش دامنگیر ہوئی۔ اوّل مرزا کو غلط یا صحیح یہ خیال پیدا ہوا کہ فیروز پور سے جس قدر پنشن ہمارے خاندان کے لیے گورنمنٹ نے مقرر کرائی تھی اُس قدر ہم کو نہیں ملتی۔ ضرورتوں نے سخت تنگ کر رکھا تھا، اُدھر قرضخواہوں کے تقاضے سے ناک میں دم آ گیا تھا، اُدھر چھوٹے بھائی کو جنون ہو گیا۔ مرزا جیسے آزاد منش آدمی کے لیے یہ وقت نہایت سخت تھا، اُس کشمکش میں اُن کو اس کے سوا کچھ نہ سوجھا کہ کلکتے پہنچ کر گورنمنٹ میں پنشن کی بابت استغاثہ پیش کریں۔ غرضکہ مرزا کی عمر کچھ کم چالیس برس کی تھی جب وہ لکھنؤ ہوتے ہوئے کلکتے پہنچے وہاں لوگوں نے اُن کی بہت خاطر و مدارات کی اور اُن کو کامیابی کی امید دلائی۔ اسٹرلنگ صاحب سکرٹری گورنمنٹ ہند نے جن کی مدح میں مرزا کا فارسی قصیدہ اُن کی کلیات میں موجود ہے وعدہ کیا کہ تمہارا حق ضرور تم کو ملیگا۔ کول برک صاحب جو اُس وقت دلّی میں رزیڈنٹ تھے اُنھوں نے دلّی ہی میں مرزا سے عمدہ رپورٹ کرنے کا اقرار کر لیا تھا۔ اِن امیدوں کے دھوکے میں وہ پورے دو برس کلکتے میں رہے، مگر آخرِ کار نتیجہ ناکامی کے سوا کچھ نہ ہوا۔ جب یہاں سے مرزا کو مایوسی ہوئی تو اُنھوں نے ولایت میں اپیل کیا۔ مگر وہاں بھی کچھ نہ ہوا۔

محاولہ اہلِ کلکتہ کلکتے کے قیام کے زمانہ میں کچھ لوگوں نے مرزا کے کلام پر اعتراض کیے تھے اگرچہ مرزا کے طرفدار بھی کلکتے میں بہت تھے مگر انھوں نے تنگ آکر ایک مثنوی موسوم بہ بادِ مخالف لکھی جس میں اپنی غریب الوطنی کا ذکر اور اہلِ کلکتہ کی نامہربانی کی شکایت اور اُن کے اعتراضات اور اپنے جواب نہایت عمدگی اور صفائی اور دردانگیز طریقے سے بیان کیے ہیں۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ دلّی میں واپس آکر یہ سب باتیں فراموش ہوگئیں اور وہاں کی سیر اور گلگشت یاد رہی۔ کہتے ہیں ؎

کلکتہ کا جو ذکر کیا تو نے ہم نشیں! — اک تیر میرے سینہ پہ مارا کہ ہائے ہائے
وہ سبزہ زار ہائے مطرّا کہ ہے غضب — وہ نازنیں بتانِ خود آرا کہ ہائے ہائے
صبر آزما وہ اُن کی نگاہیں کہ حف نظر — طاقت رُبا وہ اُنکا اشارا کہ ہائے ہائے
وہ میوہ ہائے تازہ و شیریں کہ واہ واہ — وہ بادہ ہائے ناب گوارا کہ ہائے ہائے

قیام لکھنؤ لکھنؤ کی ایک صحبت میں جبکہ مرزا وہاں موجود تھے ایک روز لکھنؤ اور دلّی کی زبان پر گفتگو ہو رہی تھی، ایک صاحب نے مرزا سے کہا کہ جس موقع پر اہلِ دہلی اپنے تئیں بولتے ہیں وہاں اہلِ لکھنؤ آپ کو بولتے ہیں؛ آپ کی رائے میں فصیح آپ کو ہے یا اپنے تئیں؟ مرزا نے کہا، فصیح تو یہی معلوم ہوتا ہے جو آپ بولتے ہیں؛ مگر اس میں دقت یہ ہے کہ مثلاً آپ میری نسبت یہ فرمائیں کہ میں آپ کو فرشتہ خصائل جانتا ہوں اور میں اُسکے جواب میں اپنی نسبت یہ عرض کروں کہ میں تو آپ کو کُتّے سے بھی بدتر سمجھتا ہوں؛ تو سخت مشکل واقع ہوگی؛ میں تو اپنی نسبت کہوں گا اور آپ ممکن ہے کہ اپنی نسبت سمجھ جائیں۔ سب حاضرین یہ لطیفہ سُنکر پھڑک گئے۔ مگر یہ فقط ایک لطیفہ اہلِ صحبت کے خوش کرنے کے لیے تھا ورنہ اہلِ دہلی بھی اکثر بجائے اپنے تئیں کے آپ کو بولتے ہیں؛ اس میں کچھ اہلِ لکھنؤ کی خصوصیت نہیں ہے۔

لطیفہ زبان کے متعلق مرزا کا اسی قسم کا ایک اور لطیفہ مشہور ہے۔ دلّی میں رتھ کو بعضے مؤنث اور بعض مذکر بولتے ہیں؛ کسی نے مرزا صاحب سے پوچھا کہ حضرت! رتھ مؤنث ہے یا مذکر؟

آپ نے کہا کہ بھیا! جب رتھ میں عورتیں بیٹھی ہوں تو مؤنث کہو اور جب مرد بیٹھیں تو مذکر کہو۔

ملازمت سرکاری سے انکار

۱۸۴۲ء میں جب دہلی کالج نئے اصول پر قائم کیا گیا تو مسٹر ٹامسن سکرٹری گورنمنٹ ہند جنکے نام سے روڑکی کالج مشہور ہے اور جو اس صوبہ کے بعد ازاں لیفٹننٹ گورنر ہوئے مدرسین کے امتحان کے لیے دلی میں آئے اور چاہا کہ جس طرح سو روپیہ ماہوار کا ایک عربی مدرس کالج میں مقرر ہے، اسی طرح ایک فارسی کا مدرس مقرر کیا جائے، لوگوں نے مرزا اور مومن خاں اور مولوی امام بخش کا ذکر کیا۔ سب سے پہلے مرزا صاحب کو بلایا گیا، مرزا پالکی میں سوار ہو کر صاحب سکرٹری کے ڈیرے پر پہنچے، صاحب کو اطلاع ہوئی۔ اُنھوں نے فوراً بلا لیا، مگر یہ پالکی سے اُتر کر اس انتظار میں ٹھہرے رہے کہ دستور کے موافق صاحب سکرٹری اُن کے لینے کو آئینگے۔ جب بہت دیر ہو گئی اور صاحب کو معلوم ہوا کہ اس سبب سے نہیں آئے وہ خود باہر چلے آئے، اور مرزا سے کہا کہ جب آپ دربار گورنری میں تشریف لائیں گے تو آپ کا اُسی طرح استقبال کیا جائیگا لیکن اِس وقت آپ نوکری کے لیے آئے ہیں، اِس موقع پر وہ برتاؤ نہیں ہو سکتا۔ مرزا صاحب نے کہا گورنمنٹ کی ملازمت کا ارادہ اِس لیے کیا ہے کہ اعزاز کچھ زیادہ ہو نہ اس لیے کہ موجودہ اعزاز میں بھی فرق آئے۔ صاحب نے کہا: ہم قاعدے سے مجبور ہیں۔ مرزا صاحب نے کہا مجھکو اس خدمت سے معاف رکھا جائے، اور یہ کہکر چلے آئے۔

قید ہونیکا واقعہ

مرزا کو شطرنج اور چوسر کھیلنے کی بہت عادت تھی اور چوسر جب کبھی کھیلتے تھے برائے نام کچھ بازی بد کر کھیلا کرتے تھے۔ اِسی چوسر کی بدولت ۱۲۶۴ھ ہجری میں مرزا پر ایک سخت ناگوار واقعہ گزرا یعنی کوتوال کی دشمنی کے باعث اُن کو قید خانہ میں جانا پڑا۔ لیکن آدھی میعاد گزرنے کے بعد وہ خود مجسٹریٹ ہی کی رپورٹ پر رہا کیے گئے۔

یہ واقعہ مرزا صاحب پر نہایت شاق گزرا تھا، اگرچہ منجملہ چھ مہینے کے تین مہینے جو اُن کو قید خانے میں گزرے اُن کو کسی طرح کی تکلیف نہیں ہوئی۔ وہ بالکل اُسی آرام سے رہے جیسے گھر پر رہتے

گئے تھے۔ اور پھر ہر روز حضرت صاحب زادگان کو حضرت ان کو پہنچاتے تھے۔ ان کے دوست
ان سے ملنے جاتے تھے۔ اور وہ صرف [illegible] کے ایک محافظ کے ساتھ رہتے تھے۔
جب مرزا قید سے چھوٹ کر آئے تو میاں کالے صاحب کے مکان میں آ کر رہے تھے
ایک روز میرے پاس بیٹھے تھے کسی نے آ کر قید سے چھوٹنے کی مبارکباد دی۔ مرزا نے کہا:
"کون بھڑوا قید سے چھوٹا ہے۔ پہلے گورے کی قید میں تھا، اب کالے کی قید میں ہوں"

قلعہ کا تعلق

۱۲۶۶ھ ہجری میں مرحوم ابوظفر سراج الدین بہادر شاہ نے مرزا کو خطاب
نجم الدولہ دبیر الملک نظام جنگ ... اور چھ پارچے کا خلعت مع تین رقوم جواہر کے عطا
سرفراز کیا اور [illegible] مقرر فرمایا۔ اور خاندان تیموریہ کی تاریخ [illegible]
کی خدمت پر [illegible]۔ مرزا نے اس کتاب کا نام [illegible]
اور اس کے پہلے حصہ کا نام [illegible] حضرت آدم سے [illegible]
تک [illegible] تیمور سے [illegible] ہمایوں کے [illegible] بیان ہوئے ہیں
مہر نیم روز [illegible] دوسرے حصہ کا نام [illegible] ابوظفر سراج الدین
[illegible]
[illegible]
[illegible]
حصہ شروع ہونے کے بعد غدر ہو گیا اور اس حصہ کا صرف نام ہی نام رہ گیا۔

خدمت استادی شعر بادشاہ

۱۲۷۱ھ میں جب شیخ ابراہیم ذوق کا انتقال ہو گیا تو بادشاہ کے اشعار
کی اصلاح بھی مرزا سے متعلق ہو گئی۔ اور [illegible]

---

۱ حضرت محمد نصیر الدین عرف میاں کالے صاحب بادشاہ بہادر شاہ کے پیر [illegible]
[illegible] تھے۔ مرزا مدت تک انہی کے مکان میں رہے ہیں۔ وہ مرزا سے نہایت محبت رکھتے
تھے اور مرزا کو ان سے [illegible] پیدا ہو گیا تھا۔

سرانجام کرتے تھے۔

بدیہہ گوئی جب مرزا کلکتے میں تھے تو مجلس میں ایک صاحب نے فیضی کی نسبت تعریف کی، مرزا نے کہا "فیضی کو لوگ جیسا سمجھتے ہیں ویسا نہیں ہے" اِس پر بات بڑھی، اُس شخص نے کہا کہ فیضی جب پہلی ہی بار اکبر کے روبرو گیا تھا اُس نے ڈھائی سو شعر کا قصیدہ اُسی وقت کہکر پڑھا تھا۔ مرزا بولے "اب بھی اللہ کے بندے ایسے موجود ہیں کہ دو چار سو نہیں تو دو چار شعر تو ہر موقع پر بداہتہً کہہ سکتے ہیں" مخاطب نے جیب میں سے ایک چکنی ڈلی نکالکر ہتھیلی پر رکھی اور مرزا سے درخواست کی کہ اس ڈلی پر کچھ ارشاد ہو۔ مرزا نے گیارہ شعر کا قطعہ اُسی وقت موزوں کرکے پڑھ دیا جو اُن کے دیوان اُردو میں موجود ہے اور جس کا پہلا شعر یہ ہے ؎

ہے جو صاحب کے کفِ دست پہ یہ چکنی ڈلی زیب دیتا ہے اسے جس قدر اچھا کہیے

اولاد مرزا صاحب کے اولاد کچھ نہ تھی۔ ابتدا میں سات بچے پے درپے ہوئے مگر کوئی زندہ نہیں رہا

حالات غدر و کتابِ دستنبو غدر کے زمانہ میں مرزا دلّی سے بلکہ گھر سے بھی باہر نہیں نکلے، جونہی بغاوت کا فتنہ اٹھا اُنھوں نے گھر کا دروازہ بند کرلیا، اور گوشۂ تنہائی میں غدر کے حالات لکھنے شروع کیے، اگرچہ فتح دہلی کے بعد مہاراج پٹیالہ کی طرف سے حکیم محمود خاں مرحوم اور اُنکے ہمسایوں کے مکان پر جس میں ایک مرزا بھی تھے حفاظت کے لیے پہرہ بیٹھ گیا تھا، اس لیے وہ فتحمند سپاہیوں کی لوٹ کھسوٹ سے محفوظ رہے، مگر پھر بھی اُن کو طرح طرح کی تکلیفیں اُٹھانی پڑیں مرزا یوسف جو دیوانے ہوگئے تھے اور مرزا کے مکان سے تقریباً دو ہزار قدم کے فاصلے پر ایک مکان میں رہتے تھے زمانۂ غدر میں انتقال کرگئے۔ نہ مرزا اپنے بھائی کی تجہیز و تکفین میں شریک ہوسکے اور نہ خاطر خواہ اُس کا انتظام کرسکے، اُس وقت نہ کفن کے لیے کپڑا بازار میں مل سکتا تھا، نہ غسال اور گورکن کا کہیں پتا تھا۔ نہ شہر سے قبرستان تک جانا ممکن تھا۔ مگر مرزا کے ہمسایوں نے اُنکی بڑی مدد کی اور جوں توں مرزا یوسف کو غسل اور تجہیز و تکفین کے بعد مسجد کے صحن میں سپردِ خاک کردیا۔

لطیفہ ایک روز کچھ گورے مرزا کے مکان میں بھی گھس آئے تھے، راجہ کے سپاہیوں نے ہرچند روکا مگر اُنہوں نے کچھ التفات نہیں کیا۔ اور اُن کو اور اُنکے دو عزیز بچوں کو اور دو تین نوکروں کو مع چند ہمسایوں کے کرنل براؤن کے روبرو لے گئے۔ سُنا ہے کہ جب مرزا کرنل کے سامنے پیش کیے گئے تو اُس وقت کلاہ پاپاخ اُن کے سر پر تھی۔ اُس نے مرزا کی نئی وضع دیکھکر پوچھا کہ ول تم مسلمان ہو؟ مرزا نے کہا آدھا۔ کرنل نے کہا اِسکا کیا مطلب؟ مرزا نے کہا "شراب پیتا ہوں، سوُر نہیں کھاتا" کرنیل یہ سُنکر ہنسنے لگا۔ پھر مرزا نے وزیر ہند کی چٹھی جو ملکہ معظمہ کے مدحیہ قصیدے کی رسید اور جواب میں آئی تھی، دکھائی، کرنیل نے کہا تم سرکار کی فتح کے بعد پہاڑی پر کیوں نہ حاضر ہوئے؟ مرزا نے کہا "میں چار کہاروں کا افسر تھا، وہ چاروں مجھے چھوڑ کر بھاگ گئے، میں کیونکر حاضر ہوتا؟ کرنیل نے نہایت مہربانی سے مرزا اور اُن کے تمام ساتھیوں کو رخصت کر دیا۔

ایامِ غدر کی تنگی وعسرت ایامِ غدر میں مرزا کی معاش کے دونوں ذریعے یعنی سرکاری پنشن اور قلعے کی تنخواہ مسدود ہو گئے تھے۔ گھر میں جس قدر بی بی کے پاس زیور یا کوئی اور قیمتی چیز تھی وہ دوسری جگہ گاڑنے دابنے کے لیے بھیج دیا تھا، جہاں سے فتحمند سپاہ نے کھود کر سب نکال لیا۔ مگر مرزا نے اس تنگی وعسرت کی حالت میں بھی اپنے متعدد نوکروں میں سے کسی کو جواب نہیں دیا، اور جو حالت اُن پر اور اُنکے متعلقین پر خوش وناخوش گزری اُس میں نوکر بھی برابر شریک رہے، نوکروں کے علاوہ جن لوگوں کے ساتھ مرزا امن کے زمانے میں ہمیشہ سلوک کرتے تھے وہ اِس حالت میں بھی مرزا کو ستاتے تھے اور چار وناچار اُن کی بھی مرزا کو خبر لینی پڑتی تھی۔ مرزا لکھتے ہیں کہ "اس ناداری کے زمانے میں جس قدر کپڑا، اوڑھنا اور بچھونا گھر میں تھا سب بیچ بیچ کر کھا گیا، گویا اور لوگ روٹی کھاتے تھے اور میں کپڑا کھاتا تھا۔" -

وظیفہ رامپور غدر کے بعد دو برس تک مرزا کا یہی حال رہا۔ مگر دو برس بعد نواب یوسف علیخان رئیس رامپور نے سو روپیہ ماہوار ہمیشہ کے لیے مرزا کے واسطے مقرر کر دیا، جو نواب کلب علیخاں نے

بھی بدستور مرزا کے اخیر دم تک جاری رکھا اور غدر سے تین برس بعد جب مرزا ہر ایک الزام سے بری ثابت ہوئے سرکاری پنشن بھی جاری ہوگئی۔

لطیفہ جب نواب یوسف علی خاں کا انتقال ہوگیا اور مرزا تعزیت کے لیے رامپور گئے چند روز بعد نواب کلب علی خاں کا نواب لفٹنٹ گورنر سے ملنے کو بریلی جانا ہوا۔ اُن کی روانگی کے وقت مرزا بھی موجود تھے۔ چلتے وقت نواب صاحب نے معمولی طور پر مرزا صاحب سے کہا "خدا کے سپرد" مرزا نے کہا حضرت! خدا نے تو مجھے آپ کے سپرد کیا ہے، آپ پھر اُلٹا مجھ کو خدا کے سپرد کرتے ہیں۔"

برہان قاطع جب مرزا دستنبو کو ختم کر چکے اور اب بھی تنہائی اور سناٹے کا وہی عالم رہا تو اُنھوں نے یادداشت کے طور پر برہان قاطع میں جو مقام قابلِ اعتراض نظر آئے اُن کو ضبط کرنا شروع کیا۔ شدہ شدہ ایک کتاب بن گئی جس کا نام قاطع برہان رکھا گیا اور ۱۲۷۶ھ میں چھپکر شائع ہوئی۔ پھر مرزا نے ۱۲۸۲ھ میں باضافۂ دیگر مضامین و فوائد اُسکو دوسری بار چھپوایا اور اُس کا نام درفشِ کاویانی رکھا۔

عربی استعداد و فارسی دانی و عروض مرزا نے عربی میں صرف و نحو کے سوا اور کچھ اُستاد سے نہیں پڑھا تھا۔ مگر چونکہ علمِ لسان سے اُن کو فطری مناسبت تھی اُن کی نظم و نثر اُردو و فارسی کے دیکھنے سے کہیں اس بات کا خطرہ تک دل میں نہیں گزرتا کہ یہ شخص عربیت اور فنِ ادب سے ناواقف ہوگا۔ عربی الفاظ کو اُنھوں نے ہر جگہ اُسی سلیقہ سے استعمال کیا ہے، جس طرح ایک اچھے فاضل اور ادیب کو استعمال کرنا چاہیے، شاعری جس کا ملکہ اُن کی فطرت میں ودیعت کیا گیا تھا اُس سے قطع نظر کرکے فارسی زبان اور فارسی الفاظ و محاورات کی تحقیق اور اہلِ زبان کے اسالیبِ بیاں پر مرزا کو اس قدر عبور تھا کہ خود اہلِ زبان میں بھی مستثنےٰ آدمیوں کو ایران کے مستند شعرا کی زبان پر اس قدر عبور ہوگا۔ اِس کے سوا فنِ عروض میں بھی اُن کو کافی دستگاہ معلوم ہوتی ہے۔ چنانچہ فارسی اُردو میں متعدد غزلیں اور تیز

ایک آدھ فارسی قصیدہ ایسی ٹیڑھی بحروں میں اُنہوں نے لکھا ہے کہ اکثر موزوں طبع بغیر واقفیت عروض کے اُن بحروں میں نہیں چل سکتے۔

نجوم و تصوف علم نجوم سے کسی قدر اور اُس کی اصطلاحات سے پوری واقفیت اُن کو تھی چنانچہ اُن کی نظم فارسی میں جا بجا اس کا کافی ثبوت ملتا ہے۔ علم تصوف سے جس کی نسبت کہا گیا ہے کہ "برائے شعر گفتن خوب است" اُن کو خاص مناسبت تھی اور حقائق و معارف کی کتابیں اور رسالے کثرت سے اُن کے مطالعے سے گزرے تھے، اور سچ پوچھیے تو انہیں متصوفانہ خیالات نے مرزا کو نہ صرف اپنے ہم عصروں میں بلکہ بارھویں اور تیرھویں صدی کے تمام شعرا میں ممتاز بنا دیا تھا۔ فنِ تاریخ اور سیاق و مساحت وغیرہ سے اُنکو مطلق لگاؤ نہ تھا۔

خط اور شعر خوانی مرزا کا خطِ نستعلیق شفیعا آمیز نہایت شیریں اور دلاویز تھا، جیسا کہ اکثر اہلِ ایران کا ہوتا ہے، اور باوجود خوشخطی کے نہایت زود نویس اور تیز دست تھے۔ شعر پڑھنے کا انداز بھی خاصکر مشاعروں میں حد سے زیادہ دلکش اور مؤثر تھا۔

مرزا کے اخلاق و عادات اور خیالات مرزا کے اخلاق نہایت وسیع تھے، وہ ہر ایک شخص سے جو اُن سے ملنے جاتا تھا، بہت کشادہ پیشانی سے ملتے تھے، جو شخص ایک دفعہ اُن سے مل آتا تھا، اُسکو ہمیشہ اُن سے ملنے کا اشتیاق رہتا تھا۔ دوستوں کو دیکھکر وہ باغ باغ ہو جاتے تھے، اور اُن کی خوشی سے خوش اور اُن کے غم سے غمگین ہوتے تھے، اس لیے اُن کے دوست ہر ملت اور ہر مذہب کے نہ صرف دہلی میں بلکہ تمام ہندوستان میں بے شمار تھے، جو خطوط اُنہوں نے اپنے دوستوں کو لکھے ہیں، اُن کے ایک ایک حرف سے مہر و محبت و غمخواری اور یگانگت ٹپکی پڑتی ہے، ہر ایک خط کا جواب لکھنا وہ اپنے ذمہ فرض عین سمجھتے تھے، اُن کا بہت سا وقت دوستوں کے خطوں کے جواب لکھنے میں صرف ہوتا تھا۔ بیماری اور تکلیف کی حالت میں بھی وہ خطوں کے جواب لکھنے سے باز نہ آتے تھے۔ وہ دوستوں کی فرمائشوں سے کبھی تنگدل نہ ہوتے تھے، غزلوں کی اصلاح کے سوا اور طرح طرح کی فرمائشیں اُنکے بعض

خالص و مخلص دوست کرتے تھے اور وہ اُن کی تعمیل کرتے تھے۔ لوگ اُن کو اکثر بیرنگ خط بھیجتے تھے
مگر اُن کو کبھی ناگوار نہ گزرتا تھا، اگر کوئی شخص لفافے میں ٹکٹ رکھکر بھیجتا تھا تو سخت شکایت
کرتے تھے۔ انہوں نے میسور کے ایک شہزادے کو اپنی کوئی کتاب بھیجی ہے، اُس نے کتاب کی
رسید لکھی ہے اور قیمت دریافت کی ہے، اُس کے جواب میں لکھتے ہیں "قیمت[۱] دریافت کرنیکا
سوال کیونکر قلم کی زبان سے نکلا۔ نیاز مندانِ بے نوا پر مہربانی فرمانے کا یہ طریقہ نہیں ہے۔
میں بے سرمایہ ہوں لیکن فرومایہ نہیں۔ شاعر ہوں سوداگر نہیں، موئینہ پوش ہوں کتاب فروش
نہیں۔ بخشش قبول کرنیوالا ہوں، قیمت لینے والا نہیں۔ جو کچھ آزاد لوگ شہزادوں کی خدمت
میں بھیجتے ہیں نذر ہوتی ہے، اور جو کچھ شاہزادے فقیروں کو بخشتے ہیں تبرک ہوتا ہے۔ خرید و فروخت
کا معاملہ نہیں۔ جو کچھ میں نے بھیجا ہے تحفہ ہے، اور جو کچھ میں بھیجونگا تحفہ ہوگا"

مروّت مروّت اور لحاظ مرزا کی طبیعت میں بیحد تھا، اگرچہ عمر کے آخری حصہ میں وہ
اشعار کی اصلاح دینے سے بہت گھبراتے تھے لیکن کبھی کسی کا قصیدہ یا غزل بغیر اصلاح کے
واپس نہ کرتے تھے، ایک صاحب کو لکھتے ہیں "جہاں تک ہوسکا احباب کی خدمت بجالایا
اوراقِ اشعار لیٹے لیٹے دیکھتا تھا اور اصلاح دیتا تھا۔ اب نہ آنکھ سے اچھی طرح سوجھے،
نہ ہاتھ سے اچھی طرح لکھا جائے۔ کہتے ہیں کہ شاہ شرف بوعلی قلندر کو بسبب کبرسن کے خدا
نے فرض اور پیمبر نے سُنّت معاف کر دی تھی، میں متوقع ہوں کہ میرے دوست بھی خدمت
اصلاحِ اشعار سے مجھے معاف کریں۔ خطوطِ شوقیہ کا جواب جس صورت سے ہوسکیگا لکھدیا کرونگا"

فراخ حوصلگی اگرچہ مرزا کی آمدنی قلیل تھی مگر حوصلہ فراخ تھا۔ سائل اُن کے دروازہ سے
خالی ہاتھ بہت کم جاتا تھا، اُن کے مکان کے آگے اندھے، لنگڑے، لولے اور اپاہج مرد و عورت
ہر وقت پڑے رہتے تھے۔ غدر کے بعد اُن کی آمدنی کچھ اوپر ڈیڑھ سو روپیہ ماہوار کی ہوگئی تھی
اور کھانے پہننے کا خرچ بھی کچھ لمبا چوڑا نہ تھا، مگر وہ غریبوں اور محتاجوں کی مدد اپنی بساط سے

[۱] اصل عبارت زبانِ فارسی میں ہے ہم نے اس کا ترجمہ کر دیا ہے۔ ۱۲

زیادہ کرتے تھے۔ اس لیے اکثر تنگ رہتے تھے، غدر کے بعد ایک بار نواب لفٹنٹ گورنر کے دربار میں اُن کو حسبِ معمول سات پارچہ کا خلعت مع تین رقوم جواہر کے ملا تھا لفٹنٹی کے چپراسی اور جمعدار قاعدے کے موافق انعام لینے کو آئے۔ مرزا صاحب کو پہلے ہی معلوم تھا کہ انعام دینا ہوگا۔ اس لیے اُنھوں نے دربار سے آتے ہی خلعت اور رقوم جواہر بازار میں فروخت کرنے کے لیے بھیجدی تھیں، چپراسیوں کو الگ مکان میں بٹھا دیا اور جب بازار سے خلعت کی قیمت آئی تب اُن کو انعام دیکر رخصت کیا۔

وہ اپنے اُن دوستوں کے ساتھ جو گردشِ روزگار سے بگڑ گئے تھے، نہایت شریفانہ طور سے سلوک کرتے تھے۔ دلی کے عائدین سے ایک صاحب جو مرزا کے دلی دوست تھے اور غدر کے بعد اُن کی حالت سقیم ہوگئی تھی ایک روز چھینٹ کا فرغل پہنے ہوئے مرزا سے ملنے کو آئے، مرزا نے کبھی اُن کو مالیدہ یا جامہ وار وغیرہ کے چغوں کے سوا ایسا حقیر کپڑا پہنے نہیں دیکھا تھا۔ چھینٹ کا فرغل اُن کے بدن پر دیکھکر دل بھر آیا، اُن سے پوچھا کہ یہ چھینٹ آپ نے کہاں سے لی؟ مجھے اِس کی وضع بہت ہی بھلی معلوم ہوتی ہے۔ آپ مجھے فرغل کے لیے یہ چھینٹ منگوا دیں۔ اُنھوں نے کہا یہ فرغل آج ہی بنکر آیا ہے اور میں نے اسی وقت اسکو پہنا ہے۔ اگر آپ کو پسند ہے تو یہی حاضر ہے۔ مرزا نے کہا جی تو یہی چاہتا ہے کہ اسی وقت آپ سے چھینکر پہن لوں مگر جاڑا شدت سے پڑ رہا ہے۔ آپ یہاں سے مکان تک کیا پہنکر جائینگے؟ پھر ادھر اُدھر دیکھکر کھونٹی پر سے اپنا مالیدہ کا نیا چغہ اُتار کر اُنھیں پہنا دیا اور اس خوبصورتی کے ساتھ وہ چغہ اُن کی نذر کیا۔

حافظہ جیسی مرزا کی طبیعت میں رسائی اور ذہن میں جودت اور سرعتِ انتقال تھی اسی طرح اُن کا حافظہ بھی نہایت قوی تھا۔ فکرِ شعر کا یہ طریقہ تھا کہ اکثر رات کو عالمِ سرخوشی میں فکر کیا کرتے تھے، اور جب کوئی شعر سرانجام ہوتا تھا تو کمر بند میں ایک گرہ لگا لیتے تھے۔ اسی طرح آٹھ آٹھ دس دس گرہیں لگا کر سو رہتے تھے، اور دوسرے دن صرف یاد پر سوچ سوچ کر

تمام اشعار قلمبند کر لیتے تھے۔

شعر فہمی شعر فہمی اور کتاب فہمی میں وہ ایک مستثنے آدمی تھے۔ کیسا ہی مشکل مضمون ہو وہ اکثر ایک سرسری نظر میں اُسکی تہ کو پہنچ جاتے تھے۔ مولانا آزردہ نے "دور نہیں" "نور نہیں" اس زمین میں غزل لکھی تھی، اُس میں اتفاق سے مطلع بہت اچھا نکل آیا تھا۔ مولانا نے اپنی غزل دوستوں کو سُنا کر اُن سے کہا کہ "اگرچہ بحر دوسری ہے مگر اسی ردیف و قافیہ میں نظیری کی بھی ایک غزل ہے جس کا مطلع ہے ؎

عشق عصیان است اگر مستور نیست　　کشتۂ جرم زباں مغفور نیست

اگر وہ اُردو میں مطلع کہتا تو یوں کہتا ؎

عشق عصیاں ہے اگر مخفی و مستور نہیں　　کشتۂ جرم زباں ناجی و مغفور نہیں

آؤ آج مرزا غالب کے ہاں چلیں اور بغیر اس کے کہ قائل کا نام لیا جائے۔ اپنا مطلع اور نظیری کا یہی اُردو مطلع مرزا کو سُنائیں اور پوچھیں کہ کونسا مطلع اچھا ہے" چونکہ نظیری کا مطلع اُردو ترجمہ سے بہت پست ہو گیا تھا۔ سب کو یقین تھا کہ مرزا نظیری کے مطلع کو ناپسند کرینگے اور مولانا آزردہ کے مطلع کو ترجیح دینگے۔ چنانچہ مولانا اور نواب صاحب اور بعض اور احباب مرزا کے ہاں پہنچے۔ معمولی بات چیت کے بعد مولانا نے کہا کہ اُردو کے دو مطلعے ہیں ان میں آپ محاکمہ کیجئے کہ کونسا مطلع اچھا ہے اور اُنہوں نے اوّل نظیری کے مطلع کا یہی ترجمہ پڑھا۔ ابھی مولانا اپنا مطلع پڑھنے نہیں پائے تھے کہ مرزا اُس مطلع کو سُنکر سر دُھننے لگے اور متحیر ہو کر پوچھنے لگے کہ یہ مطلع کس نے لکھا اور اس قدر تعریف کی کہ مولانا آزردہ کو یہ امید نہ رہی کہ اس سے زیادہ میرے مطلع کی داد ملیگی۔ چنانچہ اُنہوں نے اپنا مطلع نہیں پڑھا اور سب لوگ نہایت تعجب کرتے ہوئے وہاں سے اُٹھے۔

مرزا حقائق و معارف کی کتابیں اکثر مطالعہ کرتے تھے اور اُن کو خوب سمجھتے تھے۔ نواب مصطفیٰ خان شیفتہ فرماتے تھے کہ میں شاہ ولی اللہ کا ایک فارسی رسالہ جو حقائق و معارف

کے نہایت دقیق مسائل پر مشتمل تھا، مطالعہ کر رہا تھا اور ایک مقام بالکل سمجھ میں نہ آتا تھا، اتفاقاً اُسی وقت مرزا صاحب آنکلے۔ میں نے وہ مقام مرزا کو دکھایا۔ اُنہوں نے کسی قدر غور کے بعد اُس کا مطلب ایسی خوبی اور وضاحت کے ساتھ بیان کیا کہ شاہ ولی اللہ صاحب بھی شاید اس سے زیادہ نہ بیان کر سکتے۔

ظرافت ظرافت مزاج میں اس قدر تھی کہ اگر اُن کو بقول مولانا حالی بجائے حیوانِ ناطق کے حیوانِ ظریف کہا جائے تو بجا ہے، حُسنِ بیاں، حاضر جوابی اور بات میں سے بات پیدا کرنا اُن کی خصوصیات میں سے تھا۔

لطیفہ ایک صحبت میں مرزا، میر تقی کی تعریف کر رہے تھے۔ شیخ ابراہیم ذوق بھی موجود تھے، اُنہوں نے سودا کو میر پر ترجیح دی۔ مرزا نے کہا "میں تو تم کو میری سمجھتا تھا مگر اب معلوم ہوا کہ آپ سودائی ہیں۔"

لطیفہ ایک دن مرزا گرمی اور لُو کے موسم میں ایک تنگ و تاریک کوٹھری میں کسی دوست کے ساتھ چوسر یا شطرنج کھیل رہے تھے۔ مولانا آزردہ ٹھیک دوپہر کے وقت مرزا سے ملنے کو چلے آئے اور اُسی کوٹھری میں پہنچے۔ مرزا کو رمضان کے مہینے میں چوسر کھیلتے ہوئے دیکھ کر کہنے لگے کہ "ہم نے حدیث میں پڑھا تھا کہ رمضان کے مہینے میں شیطان مقید رہتا ہے، مگر آج اس حدیث کی صحت میں تردد پیدا ہو گیا" مرزا نے کہا "قبلہ! حدیث بالکل صحیح ہے۔ مگر آپ کو معلوم رہے کہ وہ جگہ جہاں شیطان مقید رہتا ہے وہ یہی کوٹھری تو ہے۔"

الغرض مرزا کی کوئی بات لطف اور ظرافت سے خالی نہ ہوتی تھی! اور بقول مولانا حالی اگر کوئی اُن کے تمام ملفوظات جمع کرتا تو ایک ضخیم کتاب لطائف و ظرائف کی تیار ہو جاتی۔

لطیفہ ایک روز دوپہر کا کھانا آیا اور دسترخوان بچھا۔ برتن تو بہت سے تھے، مگر کھانا بہت قلیل تھا، مرزا نے مسکرا کر کہا "اگر برتنوں کی کثرت پر خیال کیجئے تو میرا دسترخوان یزید کا دسترخوان معلوم ہوتا ہے اور جو کھانے کی مقدار کو دیکھئے تو بایزید کا۔"

آموں کی رغبت فواکہ میں آم اُن کو نہایت مرغوب تھا۔ آموں کی فصل میں اُن کے دوست دور دور سے اُن کے لیے عمدہ عمدہ آم بھیجتے تھے اور وہ خود اپنے بعضے دوستوں سے تقاضہ کرکے آم منگواتے تھے۔

لطیفہ حکیم رضی الدین خاں جو مرزا کے نہایت دوست تھے، اُن کو آم نہیں بھاتے تھے ایک دن وہ مرزا کے مکان پر برآمدے میں بیٹھے تھے اور مرزا بھی وہیں موجود تھے، ایک گدھے والا اپنے گدھے لیے ہوئے گلی سے گزرا۔ آم کے چھلکے پڑے تھے۔ گدھے نے سونگھ کر چھوڑ دیے، حکیم صاحب نے کہا۔ دیکھیے آم ایسی چیز ہے جسے گدھا بھی نہیں کھاتا۔ مرزا نے کہا بے شک گدھا نہیں کھاتا۔

لطیفہ ایک صحبت میں مولانا فضل حق نے مرزا سے آم کی خوبی دریافت کی، مرزا نے کہا "بھئی میرے نزدیک تو آم میں صرف دو باتیں ہونی چاہئیں، میٹھا ہو اور بہت ہو" سب حاضرین ہنس پڑے۔

ناؤ نوش مرزا کو مدت سے رات کو سوتے وقت کسی قدر پینے کی عادت تھی، جو مقدار اُنہوں نے مقرر کرلی تھی اُس سے زیادہ کبھی نہیں پیتے تھے جس بکس میں بوتلیں رہتی تھیں اُسکی کنجی داروغہ کے پاس رہتی تھی اور اُسکو سخت تاکید تھی کہ اگر رات کو سرخوشی کے عالم میں مجھکو زیادہ پینے کا خیال پیدا ہو تو ہرگز میرا کہنا نہ ماننا اور کنجی مجھکو نہ دینا۔ اکثر ایسا ہوتا تھا کہ وہ رات کو کنجی طلب کرتے تھے اور نشہ کی جھنجھلاہٹ میں داروغہ کو بہت بُرا بھلا کہتے تھے۔ مگر داروغہ نہایت خیرخواہ تھا ہرگز کنجی نہ دیتا تھا۔ اوّل تو وہ مقدار میں بہت کم پیتے تھے۔ دوسرے اُس میں دو تین حصے گلاب ملا لیتے تھے، جس سے اُسکی حدت اور تیزی کم ہوجاتی تھی، چنانچہ ایک جگہ کہتے ہیں۔

آسودہ باد خاطرِ غالبؔ کہ خوئے اوست ... آمیختن بہ بادۂ صافی گلاب را

مگر باوجود اس قدر احتیاط اور اعتدال کے اس کا فرنشے کی عادت نے آخرکار مرزا کی صحت کو سخت صدمہ پہنچایا جس کی شکایت سے اُن کے تمام اُردو رقعات بھرے پڑے ہیں

لطیفہ ایک روز میر مہدی مجروح بیٹھے تھے اور مرزا پلنگ پر پڑے ہوئے کراہ رہے تھے۔ میر مہدی پاؤں دابنے لگے۔ مرزا نے کہا بھئی تو سیدزادہ ہے۔ مجھے کیوں گنہگار کرتا ہے؟ اُنہوں نے نہ مانا اور کہا آپ کو ایسا ہی خیال ہے تو پیر دابنے کی اُجرت دیدیجئے گا۔ مرزا نے کہا ہاں اس کا مضائقہ نہیں جب وہ پیر داب چکے، اُنہوں نے اُجرت طلب کی۔ مرزا نے کہا "بھیا کیسی اُجرت؟ تم نے میرے پاؤں دابے، میں نے تمہارے پیسے دابے۔ حساب برابر ہوا"۔

لطیفہ ایک دن قبل غروب آفتاب کے مرزا صاحب شام کا کھانا کھا رہے تھے اور کھانے میں صرف شامی کباب تھے۔ مولانا حالی بھی وہاں موجود تھے اور اُن کے سامنے بیٹھے رومال سے مکھیاں جھل رہے تھے۔ مرزا نے کہا "آپ ناحق تکلیف فرماتے ہیں، میں ان کبابوں میں سے آپ کو کچھ نہ دونگا"۔

اسلام کا یقین مرزا اسلام کی حقیت پر نہایت پختہ یقین رکھتے تھے اگرچہ اُنہوں نے تمام عبادات اور فرائض و واجبات میں سے صرف دو چیزیں لے لی تھیں، ایک توحید وجودی، اور دوسرے نبی اور اہلبیت نبی کی محبت اور اسی کو وہ وسیلۂ نجات سمجھتے تھے۔

اگرچہ مرزا کا اصل مذہب صلح کل تھا ؎

آزادہ رو ہوں اور مرا مسلک ہے صلح کل ہرگز کبھی کسی سے عداوت نہیں مجھے

مگر زیادہ تر اُن کا میلانِ طبع تشیع کی طرف پایا جاتا تھا اور جناب امیرؑ کو وہ رسولِ خدا کے بعد تمام اُمت سے افضل جانتے تھے۔

انصاف جب تک کوئی شعر مرزا کے دل میں نہ چُبھتا تھا اُس سے مس نہ ہوتے تھے چنانچہ اُنکے معاصرین اس بات سے آزردہ رہتے تھے اور جو شعر اُن کے دل میں چُبھ جاتا تھا اُسکی تعریف بھی ایسی کرتے تھے جو مبالغے کی حد کو پہنچ جاتی تھی۔ وہ درحقیقت کسی کے خوش کرنے کے لیے ایسا نہیں کرتے تھے بلکہ ذوقِ سخن اُن کو بے اختیار کردیتا تھا۔ شیخ ابراہیم ذوق جنکی نسبت مشہور ہے کہ مرزا کو اُن سے چشمک بھی ایک روز جبکہ مرزا شطرنج میں مصروف تھے منشی غلام علیخاں

مرحوم نے اُن کا یہ شعر کسی دوسرے شخص کے سُنانے کو پڑھا ؎

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے — مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے

خانِ مرحوم کہتے تھے کہ مرزا کے کان میں بھی اس کی بھنک پڑ گئی فوراً شطرنج چھوڑ دی اور مجھ سے کہا بھیّا تمنے کیا پڑھا؟ میں نے پھر وہ شعر پڑھا۔ پوچھا کس کا شعر ہے؟ میں نے کہا ذوق کا یہ سُنکر نہایت متعجب ہوئے اور مجھ سے بار بار پڑھواتے تھے اور سر دُھنتے تھے۔ اسی طرح مومن خاں کا جب یہ شعر سُنا ؎

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا — جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

تو اس کی بہت تعریف کی، اور یہ کہا "کاش مومن خاں میرا سارا دیوان لے لیتا اور صرف یہ شعر مجھکو دے دیتا"۔ سوداؔ کا یہ شعر بھی اُنکو بہت پسند تھا ؎

دکھلائیے لیجا کے تجھے مصر کا بازار — لیکن کوئی خواہاں نہیں واں جنسِ گراں کا

ایک صحبت میں نواب مرزا خاں داغؔ کے اس شعر کو بار بار پڑھتے تھے اور اس پر وجد کرتے تھے ؎

رُخِ روشن کے آگے شمع رکھکر وہ یہ کہتے ہیں — اُدھر جاتا ہے دیکھیں یا اِدھر پروانہ آتا ہے

تقریظ لکھنے کا ڈھنگ

مرزا پر تقریظوں کی بے انتہا فرمائشیں ہوتی تھیں اور جیسا کہ ظاہر ہے تعریف کی مستحق فی الحقیقت بہت ہی کم کتابیں ہوتی ہیں۔ مرزا کی طبیعت چونکہ صلح جو اور مرنج و مرنجاں واقع ہوئی تھی وہ کسی سے انکار تو نہیں کرتے تھے مگر تقریظ نگاری کا اُنہوں نے ایسا طریقہ اختیار کیا تھا کہ کوئی بات راستی کے خلاف بھی نہو اور صاحبِ کتاب خوش بھی ہو جائے بہت سا حصہ تمہید میں، یا مصنف کی ذات اور اُس کے اخلاق یا اُس کی محبت اور دوستی کے بیان یا اور لطیف اور پاکیزہ باتوں کے ذکر میں جو بے محل نہوں ختم ہو جاتا تھا۔ اخیر میں کتاب کی نسبت چند جملے جو علیت سے خالی ہوتے تھے اور مصنف کے خوش کرنے کے لیے کافی ہوتے تھے، لکھدیتے تھے۔ اسی وجہ سے بعض اوقات ایسا بھی ہوتا تھا کہ لوگ مرزا سے شکایت کرتے

ایک مرتبہ منشی ہرگوپال تفتہ نے اپنے دیوان کی تقریظ کے متعلق مرزا سے شکایت کی تھے کہ آپ نے ستائش میں مبالغہ کیا ہے۔ اُنہوں نے اُس کے جواب میں ایک خط لکھا جس کے چند فقرے ہم یہاں نقل کرتے ہیں:

"واللہ باللہ اگر کسی شاہزادے یا امیرزادے کے دیوان کا دیباچہ لکھتا تو اُس کی مدح اتنی نہ کرتا کہ جتنی تمہاری مدح کی ہے، ہم کو اور ہماری روش کو اگر پہچانتے تو اتنی مدح کو بہت جانتے۔ قصہ مختصر تمہاری خاطر کی اور ایک فقرہ تمہارے نام کا بدل کر اُس کے عوض ایک فقرہ اور لکھ دیا ہے۔ اس سے زیادہ بھی میری روش نہیں، ظاہراً تم خود فکر نہیں کرتے، اور حضرات کے بہکانے میں آجاتے ہو۔ وہ صاحب تو بیشتر اس نظم و نثر کو مہمل کہیں گے کس واسطے کہ اُن کے کان اس آواز سے آشنا نہیں۔ جو لوگ کہ قتیل کو اچھے لکھنے والوں میں جانیں گے وہ نظم و نثر کی خوبی کو کیا پہچانیں گے۔"

محققانہ نظر

مرزا کی دراکی اور عالی فطرتی کی بڑی دلیل یہ ہے کہ وہ باوجودیکہ ایسی سوسائٹی میں گھرے ہوئے تھے جس میں سلف کی تقلید سے ایک قدم تجاوز کرنا ناجائز سمجھا جاتا تھا اپنے فن میں محققانہ چال چلتے تھے اور اندھا دھند اگلوں کی تقلید ہرگز نہ کرتے تھے۔ وہ ایک خط میں تفتہ کو لکھتے ہیں "یہ نہ سمجھا کرو کہ اگلے جو لکھ گئے ہیں وہ حق ہے، کیا اُس وقت آدمی احمق پیدا نہیں ہوتے تھے؟"

حق پسندی

مرزا کے کلام پر اگر کوئی ٹھیک اعتراض کرتا تھا، یا کوئی عمدہ تصرف اُن کے شعر میں کرتا تھا، اُس کو فوراً تسلیم کر لیتے تھے اور شعر کو بدل ڈالتے تھے۔

راست گفتاری

حالانکہ ایشیائی شاعری جس کی بنیاد جھوٹ اور مبالغے پر رکھی گئی ہے مرزا کی رگ و پے میں سرایت کر گئی تھی باوجود اس کے وہ روایت اور حکایت اور وعدہ و اقرار اور بات چیت میں نہایت راست گفتار اور صادق اللہجہ تھے۔ اسی لیے جو شخص اُن کے وعدے یا اقرار کا یقین نہ کرتا تھا اُس سے نہایت ناراض ہوتے تھے۔

تفضل حسین خاں مرحوم خلف دیوان فضل اللہ خاں سے مرزا نے اپنا دیوان مانگا ہے اور اقرار کیا ہے کہ میں اس کو دیکھ کر واپس بھیجدونگا۔ انہوں نے دیوان دینے سے انکار کیا ہے ان کے انکار کے جواب میں مرزا لکھتے ہیں "کیوں صاحب! یہ چچا بھتیجا ہونا اور شاگردی و استادی سب پر پانی پھر گیا؟ اگر کوئی ہزار پانسو کی چیز ہوتی اور میں تم سے مانگتا تو خدا جانے تم کیا غضب ڈھاتے؟ میرا کلام! خرید آٹھ دس روپئے کی! سو وہ بھی میں یہ نہیں کہتا کہ مجھکو دے ڈالو، تم کو مبارک رہے، مجھکو مستعار دو، میں اسکو دیکھ لوں، جو میرے پاس نہیں ہے اسکی نقل کر لوں، پھر تم کو واپس بھیجدوں، اس طرح کی طلب پر نہ دینا دلیل اس کی ہے کہ مجھکو جھوٹا جانتے ہو۔ میرا اعتبار نہیں، یا یہ کہ مجھکو آزار دینا اور ستانا مد نظر ہے، وہ کتاب ابھی میرے آدمی کو دیدو۔ باللہ واللہ میں اس میں سے جو میرے پاس نہیں ہے نقل کر کے بھیجدونگا، اگر تم کو واپس نہ دوں تو مجھ پر لعنت اور اگر تم میری قسم کو نہ مانو اور کتاب حامل رقعہ کو نہ دو تو تم کو آفرین"۔

اسی طرح ایک خط میں نواب علاؤالدین خاں کو لکھتے ہیں:۔

بدست مرگ ولے بدتراز گمان تو نیست

مکرر لکھ چکا ہوں کہ قصیدے کا مسودہ میں نے نہیں رکھا۔ مکرر لکھ چکا ہوں کہ مجھے یاد نہیں کونسی رباعیاں مانگتے ہو۔ پھر لکھتے ہو رباعیاں بھیج، قصیدہ بھیج۔ معنی اس کے یہ کہ تو جھوٹا ہے۔ اب کے تو مقرر بھیجے گا۔ بھائی قرآن کی قسم، انجیل کی قسم، توریت کی قسم، زبور کی قسم، ہنود کے چار بید کی قسم، دساتیر کی قسم، ژند کی قسم، پاژند کی قسم، استاد کی قسم، گرو کے گرنتھ کی قسم نہ میرے پاس وہ قصیدہ، نہ مجھے وہ رباعیاں یاد، کلیات کے باب میں جو عرض کر چکا ہوں

"بر ہماں نیم کہ ہستیم وہماں خواہد بود"

مرزا کی اسی راستبازی کا سبب تھا کہ وہ کوئی کام چھپا کر نہیں کرتے تھے۔ جو دل میں تھا وہی زبان پر تھا، جو خلوت میں کرتے تھے وہی جلوت میں بھی کرتے تھے، پس اگر ان میں کوئی

عیب تھا تو وہی تھا جسکو ہر کس و ناکس جانتا تھا۔ مخفی عیبوں سے وہ بالکل پاک تھے۔

بعض اوقات ایسی فرمائشوں سے جنکے سرانجام کرنے میں اُن کو دقت اُٹھانی پڑتی تھی بڑے لطف کے ساتھ پہلو بچاتے تھے، وہ مادۂ تاریخ نکالنے سے ہمیشہ گھبراتے تھے۔ ایکبار نواب علاؤالدین خاں نے اپنے لڑکے کی ولادت کی تاریخ اور اُسکے تاریخی نام کی فرمائش کی، اُس کے جواب میں لکھتے ہیں۔ "شیر اپنے بچوں کو شکار کا گوشت کھلاتا ہے، طریق صید افگنی سکھاتا ہے، جب جوان ہو جاتے ہیں آپ شکار کر کھاتے ہیں۔ تم سخنور ہو گئے حسن طبع خداداد رکھتے ہو، ولادتِ فرزند کی تاریخ کیوں نہ کہو؟ اسم تاریخی کیوں نہ نکال لو؟ کہ مجھ پیر غمزدہ دل مردہ کو تکلیف دو۔ علاؤالدین خاں تیری جان کی قسم! میں نے پہلے لڑکے کی، جو اسم تاریخی نظم کر دیا تھا!! اور وہ لڑکا نہ جیا، مجھ کو اس وہم نے گھیرا ہے کہ وہ میرے نحوستِ طالع کی تاثیر تھی۔ میرا ممدوح جیتا نہیں، نصیر الدین حیدر، اور امجد علی شاہ ایک ایک قصیدے میں چل دیے۔ واجد علی شاہ تین قصیدوں کے متحمل ہوئے، پھر نہ سنبھل سکے جس کی مدح میں دس بیس قصیدے کہے گئے وہ عدم سے بھی پرے پہنچا۔ نا صاحب دُہائی خدا کی! میں نہ تاریخ ولادت کہونگا، نہ نام تاریخی ڈھونڈوں گا۔"

تعلقاتِ خانگی

مرزا کی بی بی جو الٰہی بخش خاں معروف کی بیٹی تھیں، وہ نہایت متقی، پرہیزگار اور نماز روزے کی سخت پابند تھیں جس قدر مرزا مذہبی معاملات میں بے پروا تھے، اُسی قدر اُنکی بی بی احکامِ مذہبی کی پابند تھیں، یہاں تک کہ بی بی کے کھانے پینے کے برتن الگ، اور شوہر کے الگ رہتے تھے، تاہم بی بی شوہر کی خدمت گزاری اور خبرگیری میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کرتی تھیں۔ مرزا صاحب ہمیشہ مردانے مکان میں رہتے تھے مگر اُن کے کھانے اور دوا ٹھنڈائی اور جڑاول وغیرہ کا انتظام سب گھر میں سے ہوتا تھا۔ مرزا میں جب تک چلنے پھرنے کی طاقت رہی ہمیشہ وقتِ معین پر ایک بار وہ گھر میں ضرور جاتے تھے، اور بی بی اور اُن کے تمام رشتہ داروں کے ساتھ نہایت عمدہ برتاؤ رکھتے تھے، اور اپنی جان

سے بڑھکر اُن کی ضروریات اور اخراجات کا خیال رہتا تھا۔ مگر چونکہ شوخی اور ظرافت اُن کی گھٹی میں پڑی تھی، اُن کی زبان و قلم سے بی بی کی نسبت اکثر ایسی باتیں نکل جاتی تھیں جنکو ناواقف آدمی نفرت یا بے تعلقی پر محمول کرسکتا ہے۔

لطیفہ کسی نے امراؤ سنگھ نام ایک شاگرد کی دوسری بی بی کے مرنے کا حال مرزا کو لکھا اور اُس میں یہ بھی لکھا کہ اُس کے ننھے ننھے بچے ہیں۔ اب اگر تیسری شادی نہ کرے تو کیا کرے؟ اور بچوں کی کس طرح پرورش ہو؟ مرزا اُسکے جواب میں لکھتے ہیں "امراؤ سنگھ کے حال پر مجھ اُس کے واسطے رحم اور اپنے واسطے رشک آتا ہے۔ اللہ اللہ! ایک وہ ہیں کہ دو دو بار اُن کی بیڑیاں کٹ چکی ہیں، اور ایک ہم ہیں کہ ایک اوپر پچاس برس سے جو پھانسی کا پھندا گلے میں پڑا ہے تو نہ پھندا ہی ٹوٹتا ہے، نہ دم ہی نکلتا ہے، اُسکو سمجھاؤ کہ بھائی تیرے بچوں کو میں پال لونگا، تو کیوں بلا میں پھنستا ہے" وہ ہمیشہ تعلقاتِ خانگی کو جداً یا ہزلاً ایک سخت مصیبت بتایا کرتے تھے۔

لطیفہ جاڑے کے موسم میں ایک دن طوطے کا پنجرا سامنے رکھا تھا، طوطا سردی کے سبب پروں میں منھ چھپائے بیٹھا تھا۔ مرزا نے دیکھکر کہا "میاں مٹھو! نہ تمہارے جورو نہ بچے، تم کس فکر میں یوں سر جھکائے ہوئے بیٹھے ہو؟"

لطیفہ ایک دفعہ مرزا مکان بدلنا چاہتے تھے۔ ایک مکان آپ خود دیکھکر آئے، اُس کا دیوانخانہ تو پسند آگیا، مگر محلسرا خود نہ دیکھ سکے۔ گھر پر آکر اُس کے دیکھنے کے لیے بی بی کو بھیجا وہ دیکھکر آئیں تو اُن سے پسند ناپسند کا حال پوچھا۔ اُنھوں نے کہا کہ اُس میں تو لوگ بلا بتاتے ہیں۔ مرزا نے کہا کیا دنیا میں آپ سے بھی بڑھکر کوئی بلا ہے؟

موت کی آرزو مرزا یا تو اِس وجہ سے کہ اُن کی زندگی فی الواقع مصائب اور سختیوں میں گزری تھی، اور یا اِس لیے کہ اُن پر ناملائم حالتوں کا بہت زیادہ اثر ہوتا تھا، آخر عمر میں موت کی بہت آرزو کیا کرتے تھے۔ ہر سال اپنی وفات کی تاریخ نکالتے اور یہ خیال کرتے کہ اِس سال

ضرور مر جاؤں گا۔" اس سے پہلے کئی

لطیفہ سنہ ۱۲۷۷ھ میں اُنھوں نے اپنے مرنے کی تاریخ یہ کہی کہ "غالب مرد" اس سے پہلے کئی مادّے غلط ہو چکے تھے۔ منشی جواہر سنگھ جوہر تخلص جو مرزا صاحب کے مخصوصین میں سے تھے اُن سے مرزا صاحب نے اِس مادّے کا ذکر کیا۔ اُنھوں نے کہا حضرت! انشاء اللہ یہ مادّہ بھی غلط ثابت ہوگا۔ مرزا نے کہا "دیکھو صاحب تم ایسی فال منھ سے نہ نکالو، اگر یہ مادّہ مطابق نہ نکلا تو میں سر پھوڑ کر مر جاؤں گا۔"

اخیر عمر کی حالت مرنے سے کئی کئی برس پہلے سے چلنا پھرنا بالکل موقوف ہو گیا تھا، اکثر اوقات پلنگ پر پڑے رہتے تھے، غذا کچھ نہ رہی تھی، چھ چھ سات سات دن میں اجابت ہوتی تھی۔ طشت چوکی پلنگ کے پاس ہی کسی قدر اوجھل میں لگی رہتی تھی۔ جب حاجت معلوم ہوتی تھی تو بیر وہ ہو جاتا تھا، مگر خطوں کے جواب اس حالت میں بھی برابر یا خود پلنگ پر پڑے پڑے لکھتے تھے یا کسی دوسرے آدمی کو بتاتے جاتے تھے، وہ لکھتا جاتا تھا۔

مرض الموت کی حالت مرنے سے چند روز پہلے بیہوشی طاری ہو گئی تھی۔ پہر پہر، دو دو پہر کے بعد چند چند منٹ کے لیے افاقہ ہو جاتا تھا۔ پھر بیہوش ہو جاتے تھے۔ جس روز انتقال ہوگا اُس سے شاید ایک دن پہلے مولانا حالی اُن کی عیادت کو گئے تھے۔ اُس وقت کئی پہر کے بعد افاقہ ہوا تھا اور نواب علاؤالدین احمد خاں مرحوم کے خط کا جواب لکھوا رہے تھے۔ اُنھوں نے لوہارو سے حال پوچھا تھا۔ اُس کے جواب میں ایک فقرہ، اور ایک فارسی شعر جو غالباً شیخ سعدی کا تھا لکھوایا۔ فقرہ یہ تھا کہ "میرا حال مجھ سے کیا پوچھتے ہو؟ ایک آدھ روز میں ہمسایوں سے پوچھنا" اور شعر کا دوسرا مصرع مولانا حالی کو یاد رہ گیا اور پہلا یاد نہیں رہا۔ وہ یہ ہے۔ "نکرد ہجر مدارا ببین سر تو سلامت"

مرنے سے پہلے اکثر یہ شعر ورد زبان رہتا تھا ؎

دم واپسیں بر سر راہ ہے — عزیزو اب اللہ ہی اللہ ہے

تاریخ وفات آخر ذیقعدہ ۱۲۸۵ھ ہجری کی دوسری اور فروری ۱۸۶۹ء کی پندرھویں کو تہتر برس اور چار مہینے کی عمر میں دنیا سے رحلت کی اور درگاہ حضرت سلطان نظام الدین قدس سرہٗ میں اپنے خسر کے پائین مزار دفن کیے گئے۔ تاریخ وفات جس میں دس بارہ آدمیوں کو توارد ہوا یاد رکھنے کے قابل ہے یعنی "آہ غالب بمرد" یہاں مولانا حالی کا قطعہ تاریخ وفات لکھا جاتا ہے :۔

غالب نے جبکہ روضۂ رضواں کی راہ لی	ہر لب پہ آہ سرد تھی ہر دل میں درد تھا
اُس دن کچھ اہل شہر کی افسردگی نہ پوچھ	دنیا سے دل ہر اپنے پرائے کا سرد تھا
حالی کہ جسکو دعوئے تمکین و ضبط ہے	دیکھا تو دل پہ ہاتھ تھا اور رنگ زرد تھا
تھا گو وہ اک سخنور ہندوستاں نژاد	عرفی و انوری کا مگر ہمسر و نبرد تھا
اس قافلہ میں آکے ملا گو وہ سب کے بعد	اگلوں کے ساتھ ساتھ مگر رہ نورد تھا
ہم اور صبح و شام یہ اندوہ جاں گزا	دل تھا کہ فکر سال میں بے صرفہ گرد تھا
ناگاہ دی یہ غالب مرحوم نے صدا	(سچ ہے کہ خواجہ راہ نمائی میں فرد تھا)
تاریخ ہم نکال چکے پڑھ بغیر فکر	حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا
۱۲۱۱	۲۷۹۶

(اس میں تاریخ اور فکر کا تخرجہ ہے)

جنازے کی نماز مرزا کے جنازے پر جبکہ دلی دروازے کے باہر نماز پڑھی گئی مولانا حالی اور شہر کے اکثر عمائد اور ممتاز لوگ جیسے نواب ضیاء الدین احمد خاں، نواب محمد مصطفےٰ خاں، حکیم احسن اللہ خاں وغیرہم اور بہت سے اہل سنت اور امامیہ دونوں فرقوں کے لوگ جنازے کی مشایعت میں شریک تھے۔ سید صفدر سلطان نبیرۂ بخشی محمود خاں نے نواب ضیاء الدین احمد خاں مرحوم سے کہا کہ مرزا صاحب شیعہ تھے۔ ہم کو اجازت ہو کہ ہم اپنے طریقے کے موافق اُن کی تجہیز و تکفین کریں۔ مگر نواب صاحب نے نہیں مانا اور تمام مراسم اہل سنت کے موافق ادا کیے گئے ؏

نظر میں ہے ہماری، جادۂ راہ فنا غالب	کہ یہ شیرازہ ہو عالم کے اجزائے پریشاں کا

شاعری اکتسابی نہ تھی

مرزا کی شاعری اکتسابی نہ تھی بلکہ اُن کی حالت پر غور کرنے سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہ ملکہ اُن کی فطرت میں ودیعت کیا گیا تھا۔ اُنھوں نے گیارہ برس کی عمر میں شعر کہنا شروع کیا تھا اور بقولِ بعض آٹھ نو برس کی عمر میں۔ خود مرزا کی زبانی سُنا گیا ہے کہ میر تقی نے جو مرزا کے ہم وطن تھے، اُن کے لڑکپن کے اشعار سُنکر یہ کہا تھا کہ "اگر اس لڑکے کو کوئی کامل اُستاد مل گیا اور اُس نے اسکو سیدھے رستہ پر ڈال دیا تو لاجواب شاعر بن جائیگا۔ ورنہ مہمل بکنے لگے گا"۔ مرزا کے حق میں جو پیشین گوئی اُس ابوالشعراء میر تقی نے کی تھی اُسکی دونوں شقیں اُنکے حق میں پوری ہوئیں۔

نثرِ اُردو

مرزا ۱۸۵۰ء تک ہمیشہ فارسی میں خط کتابت کرتے تھے۔ مگر سنہ مذکور میں جبکہ وہ تاریخ نویسی کی خدمت پر مامور کیے گئے اور ہمہ تن مہرِ نیمروز کے لکھنے میں مصروف ہو گئے اُس وقت بضرورت اُن کو اُردو میں خط کتابت کرنی پڑی۔ وہ فارسی نثر اور اکثر فارسی خطوط جن میں قوتِ متخیلہ کا عمل اور شاعری کا عنصر نظم سے بھی کسی قدر غالب معلوم ہوتا ہے نہایت کاوش سے لکھتے تھے۔ پس جب وہ مہرِ نیمروز کی ترتیب و انشا میں مصروف تھے تو اُن کو فارسی زبان میں خط کتابت کرنی اور وہ بھی اپنی طرزِ خاص میں شاق معلوم ہوئی اور اُنھوں نے اُردو زبان میں خط لکھنے شروع کیے۔ چنانچہ وہ ایک خط میں لکھتے ہیں:۔

"زبانِ فارسی میں خطوں کا لکھنا پہلے سے متروک ہے۔ پیرانہ سری اور ضعف کے صدموں سے محنت پژوہی اور جگر کاوی کی قوت مجھ میں نہیں رہی۔ حرارتِ عزیزی کو زوال ہے اور یہ حال ہے

مضمحل ہو گئے قوےٰ غالب ۔۔۔ اب عناصر میں اعتدال کہاں"

غالباً اُردو زبان میں تحریر اختیار کرنے کو مرزا نے اوّل اوّل اپنی شان کے خلاف سمجھا ہو گا۔ وہ اُس زمانہ کے خیالات کے موافق اُردو شاعری کو بھی داخلِ کمالات نہیں سمجھتے تھے۔ بلکہ اُس میں اپنی کسرِ شان جانتے تھے۔ چنانچہ ایک فارسی قطعہ میں جسکی نسبت مشہور ہے کہ اس میں شیخ ابراہیم ذوقؔ کی طرف خطاب ہے۔ کہتے ہیں ؎

فارسی میں تا بہ بینی نقشہائے رنگ رنگ	بگزر از مجموعۂ اُردو کہ بے رنگ من است
راست میگویم من و از راست سر نتواں کشید	ہرچہ در گفتار فخر تست آں ننگ من است

مگر بعض اوقات انسان اپنے جس کام کو حقیر اور کم وزن خیال کرتا ہے وہی اُسکی شہرت اور قبولیت کا باعث ہو جاتا ہے۔ مرزا کی عام شہرت ہندوستان میں جس قدر اُن کی اُردو نثر کی اشاعت سے ہوئی ہے ویسی نظم اُردو اور نظم فارسی یا نثر فارسی سے نہیں ہوئی۔ وجہ یہ کہ اوّل تو فارسی زبان سے ملک میں عام اجنبیت پائی جاتی ہے۔ دوسرے کلام میں بعض خصوصیتیں ایسی ہیں جن سے لوگوں کے مذاق بالکل ناآشنا ہیں۔ اُردو کے اشعار بھی اپنے خاص طرزِ بیاں کی وجہ سے مشکل اور بعض مشکل ہیں۔ ہاں نثر اُردو ایسی ہے جس سے خاص و عام سب یکساں لطف اور حظ اُٹھا سکتے ہیں۔

تصنیفاتِ نثرِ اُردو

اگرچہ مرزا کی اُردو نثر کی قدر بھی جیسی کہ چاہیے ویسی نہیں ہوئی لیکن پھر بھی مرزا کی اُردو نثر کے قدردان بہ نسبت ناقدردانوں کے ملک میں بہت زیادہ نکلیں گے مرزا کی اُردو نثر میں زیادہ تر خطوط و رقعات ہیں۔ چند تقریظیں اور دیباچے ہیں، اور تین مختصر رسالے ہیں۔ جو برہانِ قاطع کے طرفداروں کے جواب میں لکھے ہیں۔ لطائفِ غیبی، تیغِ تیز اور نامۂ غالب۔ اِس کے سوا چند اجزا ایک ناتمام قصّے کے بھی ہیں، جو مرزا نے مرنے سے چند روز پہلے لکھنا شروع کیا تھا۔ ان میں سب سے زیادہ دلچسپ اور لطف انگیز اُن کے خطوط ہیں جن میں سے زیادہ تر اُردوئے معلّٰی میں اور اُس سے کم عودِ ہندی میں جمع کر کے چھپوائے گئے ہیں اور بہت سے خطوط ان دونوں کتابوں کی اشاعت کے بعد دستیاب ہوئے ہیں جو مطبع مجتبائی میں چھپکر شائع ہو گئے ہیں۔

مولانا حالی کی رائے مرزا کی طرزِ تحریر پر

مولانا حالی نے جو رائے مرزا غالب کی نثر اُردو کے متعلق یادگارِ غالب میں جو چھپ چکی ہے ہم نے مرزا کے حالاتِ زندگی اخذ کیے ہیں ظاہر کی ہے، ہمارے نزدیک اُسکا اعادہ کرنا اپنی رائے دینے سے بہتر ہے۔ مولانا حالی

خود اُردو کے نامور مصنف، شاعر اور ادیب ہیں اور فنِ تنقید میں بے مثل ہیں اس لیے مولانائے مرحوم کی رائے یہاں نقل کی جاتی ہے :-

" مرزا کی اُردو خط و کتابت کا طریقہ فی الواقع سب سے نرالا ہے۔ نہ مرزا سے پہلے کسی نے خط کتابت میں یہ رنگ اختیار کیا، اور نہ اُن کے بعد کسی سے اُسکی پوری پوری تقلید ہو سکی۔ اُنہوں نے القاب و آداب کا پُرانا اور فرسودہ طریقہ اور بہت سی باتیں جنکو مترسلین نے لوازم نامہ نگاری میں سے قرار دے رکھا تھا مگر درحقیقت فضول اور دوراز کار تھیں سب اُڑا دیں۔ وہ خط کو کبھی "میاں"، کبھی "برخوردار" کبھی "بھائی صاحب" کبھی "مہاراج" کبھی کسی اور مناسب لفظ سے آغاز کرتے ہیں، اُسکے بعد مطلب لکھتے ہیں۔ اور اکثر بغیر اس قسم کے الفاظ کے سرے ہی سے مدعا لکھنا شروع کر دیتے ہیں۔

ادائے مطلب کا طریقہ بالکل ایسا ہے جیسے دو آدمی بالمشافہ بات چیت یا سوال و جواب کرتے ہیں .... بعض جگہ مکتوب الیہ کو خطاب کرتے کرتے اُسکو غائب فرض کر لیتے ہیں؛ یہاں تک کہ جو لوگ مرزا کے اندازِ بیاں سے واقف نہیں وہ اُسکو مکتوب الیہ کا غیر سمجھ لیتے ہیں.....

.....مرزا ایسے موقع پر سائل و مجیب کا نام نہیں لیتے اور نہ اُن کے نام کی علامت لکھتے ہیں مگر سوال جواب کے ضمن میں ایک ایسا لفظ لے آتے ہیں جس سے صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ سوال کیا ہے؟ اور جواب کیا؟ شاید قصے یا ناول میں یہ بات نہ چل سکے مگر خطوط میں تو مرزا نے یہ راہ بالکل صاف کر دی ہے۔

مرزا کی طرزِ تحریر کی جو خصوصیتیں اوپر مذکور ہوئیں یہ کوئی ایسی چیز نہیں ہے کہ اور لوگ اُس کی پیروی نہ کر سکیں مگر وہ چیز جس نے اُن کے مکاتبات کو ناول اور ڈراما سے زیادہ دلچسپ بنا دیا ہے وہ شوخیٔ تحریر ہے جو اکتساب یا مشق و مہارت یا پیروی و تقلید سے حاصل نہیں ہو سکتی۔ ہم دیکھتے ہیں کہ بعض لوگوں نے خط کتابت میں مرزا کی روش پر چلنے کا ارادہ کیا ہے اور اپنے مکاتبات کی بنیاد بذلہ سنجی و ظرافت پر رکھنی چاہی ہے مگر اُن کی اور مرزا کی تحریر

میں وہی فرق پایا جاتا ہے جو اصل اور نقل یا روپ اور بہروپ میں ہوتا ہے۔ مرزا کی طبیعت میں شوخی ایسی بھری ہوئی تھی جیسے ستار کے تار میں سُر بھرے ہوئے ہوتے ہیں۔ اور قوت متخیلہ جو شاعری اور ظرافت کی خلاق ہے اُسکو مرزا کے ذہن کے ساتھ وہی نسبت تھی جو قوت پرواز کو طائر کے ساتھ۔ اگرچہ مرزا کے بعد نثر اُردو میں بے انتہا وسعت اور ترقی ہوئی ہے، علمی، اخلاقی، پولیٹکل، سوشل اور مذہبی مضامین کے لوگوں نے دریا بہا دیے ہیں، بائیوگرافی، اور ناول میں بھی متعدد کتابیں نہایت ممتاز لکھی گئی ہیں۔ باوجود اسکے مرزا کی تحریر خط کتابت کے محدود دائرے میں بلحاظ دلچسپی اور لطف بیان کے اب بھی اپنا نظیر نہیں رکھتی۔

معلوم ہوتا ہے کہ مرزا خط لکھتے وقت ہمیشہ اس بات کو نصب العین رکھتے تھے کہ خط میں کوئی ایسی بات لکھی جائے کہ مکتوب الیہ اُسکو پڑھکر محظوظ اور خوش ہو۔ پھر جس رتبے کا مکتوب الیہ ہوتا تھا اُسکی سمجھ اور مذاق کے موافق خط میں شوخیاں کرتے تھے۔ مثلاً اپنے ایک دوست کو خط لکھا ہے، اُس میں اُن کی لڑکی کو جو بچپن میں مرزا کے سامنے آتی تھی اور اب جوان ہو گئی ہے بعد دعا کے لکھتے ہیں "کیوں بھئی اب ہم اگر کول آئے بھی تو تم کو کیونکر دیکھیں گے؟ کیا تمہارے ملک میں بھتیجیاں چچا سے پردہ کرتی ہیں؟" یا مثلاً نواب امیر الدین احمد خاں کو جواب تیس لوہارو ہیں اُن کے بچپن کے زمانہ میں اُن کے رقعے کا جواب جس میں مرزا کو دادا صاحب لکھا تھا اس طرح لکھتے ہیں "اے مردم چشم جہاں بین غالب! پہلے القاب کے معنی سمجھ لو، یعنی چشم جہاں بین غالب کی پُتلی۔ چشم جہاں بین تمہارا باپ مرزا علاء الدین احمد خاں بہادر اور پُتلی تم۔ میاں تمہارے دادا تو نواب امین الدین خاں بہادر ہیں؛ میں تو صرف تمہارا دل دادہ ہوں"

مرزا نے بعض اُردو خطوں میں اور خاصکر اُردو تقریظوں میں مسجع عبارت لکھنے کا التزام کیا ہے۔ اگرچہ اس زمانہ میں ایسا التزام تکلفات بارِدہ میں شمار کیا جاتا ہے خصوصاً اُردو جو بمقابلہ عربی یا سنسکرت وغیرہ کے ایک نہایت محدود زبان ہے وہ اس قسم کے تصنع اور ساختگی کی متحمل نہیں معلوم ہوتی، مگر مرزا نے جس قسم کی مسجع عبارت اُردو خطوں یا تقریظوں وغیرہ

بداں وجہ از حق بود مستفیض　　بدیں وجہ بر خلق باشد مفیض

یہ جو صوفیہ کا قول ہے کہ "الولایۃ افضل من النبوۃ" معنی اس کے صاف اور از روئے
انصاف یہ ہیں کہ ولایت نبی کی کہ وہ وجہ الی الحق ہے افضل ہے نبوت سے کہ وہ وجہ الی الخلق
ہے۔ نہ یہ کہ ولایت عام افضل ہے نبوت خاص سے جس طرح نبی مستفیض ہے حضرت الوہیت
سے اُسی طرح ولی مستنیر ہے انوارِ نبوت سے مستنیر کی تفضیل منیر پر اور مستفیض کو ترجیح مفیض
پر ہرگز معقول اور عقلا کے نزدیک مقبول نہیں۔ اب وہ ولایت کہ خاصۂ نبی تھی نبوت کیساتھ
منقطع ہو گئی مگر وہ فروغ کہ اخذ کیا گیا ہے مشکوٰۃ نبوت سے ہنوز باقی ہے۔ نقل و تحویل ہوتی
چلی آتی ہے اور چراغ سے چراغ جلتا چلا جاتا ہے۔ اور یہ سراجِ ایزدی تا صبح ظہورِ قیامت روشن
رہیگا، اور اب اِسی کا نام ولایت اور یہی شغلِ طریقِ ہدایت ہے۔ ولایت و ہدایت
وہی حقیقت توحید ذاتی ہے کہ جو از روئے کلمۂ لا الٰہ الا اللہ شہودِ عیوانِ اعیانِ آمت
اور منظورِ نظرا کابرِ ملت ہوئی ہے۔ مگر وہ بات کہاں کہ ایک بار لا الٰہ الا اللہ کہے اور دل
نورِ معرفت سے منور ہو جائے۔ اور وہ ضامنِ زبردست کہاں کہ قائل لا الٰہ الا اللہ کو
اگرچہ اُس کے معنی اچھی طرح نہ سمجھا ہو قدمگاہِ توحید پر قائم کر دے یعنی رسولِ مقبول
واجب التعظیم قائل انا احمد بلا میم علیہ التحیۃ والتسلیم۔ اب سعادت بقدر ارادت ہے
اور راحت بعد جراحت۔ سچ بھی تو ہے، آدمی کیونکر سمجھ سکے اور بطلانِ بدیہیات کے
جواز پر اُسکو کیونکر تسلی ہو، یعنی اس مجموعِ موجودات کو کہ افلاک و انجم و بحار و جبال اِسی
میں ہیں نیست و نابود محض جان لے اور تمام عالم کو ایک وجود مان لے۔

اے کردہ بآرائشِ گفتار بسیچ　　در زلفِ سخن کشودہ را خم و پیچ
عالم کہ تو چیزہا دگرش میدانی　　ذاتیست بسیط منبسط دیگر ہیچ

جب اولیاء اللہ نے۔ کہ وہ اطباء روحانی ہیں، دیکھا کہ نفوس بشری پر وہم غالب ہے
اور بسبب استیلاء وہم کے مشاہدۂ وحدت ذات سے محروم رہ جاتے ہیں اسپر چند

اُن کو سمجھائیں گے، راہ پر نہ آئینگے۔ ناچار اشغال واذکار وضع کیے تاکہ قوتِ متخیلہ اُس میں اُلجھی رہے، اور رفتہ رفتہ بیخودی طاری ہو جاوے۔ وحدتِ وجود اس طرح کی بات تو نہیں کہ نہ ہو اور ہم اُسکو بجبر یا بہ تکلف ثابت کیا چاہتے ہوں۔ حق دائی ہمہ اوست وغیرہ دانی ہمہ و وہم صورت گری اور پیکر تراشی کر رہا ہے اور معدومات کو موجود سمجھ رہا ہے۔ پس جب وہ وہم شغل وذکر کی طرف مشغول ہو گیا ہے تب اپنے کام سے یعنی صورت گری اور پیکر تراشی سے معزول ہو گیا۔ بیخبری اور بیخودی چھا گئی اور وہ کیفیت جو موحدین کو بمجرد فہم حاصل ہوتی ہے اس شاغل کے نفس کو بیخودی میں آگئی۔ ایک دریا میں جا کر کودا، ایک کو کسی نے غافل کر کے ڈھکیل دیا۔ انجام دونوں کا ایک ہے۔ وہ لوگ جو وحدتِ وجود کو سمجھ لیں یہ میں نہیں کہتا کہ نہیں ہیں مگر ہاں کم ہیں اور کہیں کہیں ہیں، اور ایسے نفوس کہ جو کسب حالتِ بیخودی کے واسطے محتاج اشغال واذکار ہیں، بہت ہیں بلکہ بے شمار ہیں۔"

مولانا نذیر احمد کی رائے مرزا کی شاعری پر

مولانا نذیر احمد اپنے ایک لکچر کے دوران میں مرزا غالب کی نسبت فرماتے ہیں:-

"اس پر مجھ کو اسد اللہ خاں غالب یاد آئے کہ وہ بڑے مشکل گو شاعر تھے، وہ ابتدا میں فارسی کہا کرتے تھے بلکہ فارسی بھی نہیں پارسی اور پارسی بھی ناآمیختہ بتازی۔ اس پر انوکھے استعارات اچھوتی تشبیہات، لفظی تعقیدات۔ تو اُن کا کلام مشکل ہوا ہی چاہتا ہے۔ کوئی شخص کہتا تھا کہ ایک دفعہ اُنہی کے شعر کے اُن سے معنی پوچھے تو کچھ دیر تامل کرنے کے بعد فرمایا "بھئی اس وقت تو کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کہا تھا" اُن کو اپنی فارسی پر بڑا ناز تھا اور ریختہ گوئی کو مبتذل اور دون مرتبہ سمجھتے تھے لیکن انگریزی عملداری کی وجہ سے جو انقلاب عظیم واقع ہونیوالا تھا، اُسکی صبح نمودار ہو چکی تھی اور زمانہ کہہ رہا تھا کہ مرزا صاحب اس بساط کو تہ کیجیے کہ زبان فارسی نہ تو ہندوستان کی ملکی زبان ہے نہ اس میں علوم ہیں۔ کیوں آپ اس کے پیچھے اپنا وقت ضائع کر رہے ہیں۔ اگلے لوگ کچھ مستقل مزاج بھی زیادہ ہوتے تھے، مرزا صاحب زیادہ مدتوں تک اسی فارسی کو پکڑے رہے مگر زمانے کے ساتھ کسی کی ضد

میں لکھی ہے اُس پر یہ گرفت مشکل سے ہو سکتی ہے .... مسجع نثروں میں عموماً یہ عیب ہوتا ہے کہ دوسرے فقرے میں جو پہلے فقرے کی رعایت سے خواہ مخواہ قافیہ تلاش کرنا پڑتا ہے تو اُس میں تصنع اور آورد کا رنگ پیدا ہو جاتا ہے اور اس لیے پہلے فقرے کے مقابلہ میں دوسرا فقرہ بسبب لزوم مالا یلزم کے کم وزن ہو جاتا ہے۔ مگر مرزا کی مسجع نثر میں یہ بات بہت کم دیکھی جاتی ہے دوسرے فقرے میں تقریباً ویسی ہی بے تکلفی پائی جاتی ہے جیسی پہلے فقرے میں اور یہ بات اُسی شخص سے بن پڑتی ہے جو باوجود خوش سلیقگی اور لطف طبیعت کے شاعری میں غایت درجے کا کمال رکھتا ہو اور وزن و قافیہ کی جانچ اور تول میں ایک عمر بسر کر چکا ہو۔ یہاں اس کی مثالیں لکھنے کی کچھ ضرورت نہیں ہے۔ مرزا کے اُردو رقعات میں اس کی مثالیں بکثرت موجود ہیں مگر یہ معلوم رہے کہ مقفّٰی عبارت مرزا صاحب اُن خطوں میں لکھتے تھے جن سے ہنسی، ظرافت، اور مخاطب کا خوش کرنا مقصود ہوتا تھا۔ ورنہ واقعات کا بیان یا مصائب کا ذکر یا تعزیت یا ہمدردی کا اظہار ہمیشہ سیدھی سادی نثر عاری میں کرتے تھے۔

مرزا نے چند تقریظیں اور دیباچے بھی اُردو زبان میں لکھے ہیں اور ان سب میں مسجع و مقفّٰی عبارت لکھنے کا التزام کیا ہے، جو بے تکلفی اور صفائی مرزا کے اُردو خطوں میں پائی جاتی ہے وہ ان تقریظوں اور دیباچوں میں نہیں ہے۔ خصوصاً سجع کی رعایت نے اُن میں آورد اور تصنع کا رنگ زیادہ پیدا کر دیا ہے۔ لیکن مرزا کو اس میں معذور سمجھنا چاہیے۔ جو لوگ تقریظوں اور دیباچوں کی فرمائش کرتے تھے وہ بغیر ان تکلفاتِ بارِدہ کے ہرگز خوش ہونے والے نہ تھے، جو طریقہ اس زمانہ میں ریویو لکھنے کا نکلا ہے اُس کو اب بھی بہت کم لوگ پسند کرتے ہیں، اور مرزا کے وقت میں تو اس کا کہیں نام و نشان بھی نہ تھا۔

باایں ہمہ ان میں سے بعض نثریں مرزا کی روشِ خاص میں نہایت ممتاز ہیں۔ خصوصاً وہ دیباچہ جو اُنہوں نے منشی میراں صاحب کی کتاب سراج المعرفت پر لکھا ہے، اُس میں جس خوبی اور متانت سے تصوف کے اعلیٰ خیالات ظاہر کیے ہیں اُسکے لحاظ سے کہا جا سکتا ہے

کہ اُردو زبان میں تصوف کے اعلیٰ خیالات نہ اس سے پہلے اور نہ اسکے بعد ایسی عمدہ نثر میں کسی نے لکھے ہیں۔"

اب ہم دیباچہ مذکور کا اقتباس ذیل میں درج کرتے ہیں۔

دیباچہ سراج المعرفت

"حق یوں ہے کہ حقیقت از روئے مثال ایک نامہ درہم پیچیدہ سربستہ ہے کہ جس کے عنوان پر لکھا ہے "لا مؤثر فی الوجود الا اللہ" اور خط میں مندرج ہے "لا موجود الا اللہ" اور اس خط کا لانے والا اور اس راز کا بتانے والا وہ نامہ آور اور نام آور ہے کہ جس پر رسالت ختم ہوئی ختم نبوت کی حقیقت اور اس معنیٰ خاص کی صورت یہ ہے کہ مراتب توحید چار ہیں، آثاری، افعالی، صفاتی، ذاتی۔ انبیائے پیشین صلوات اللہ علی نبینا وعلیہم اعلانِ مدارج سہ گانہ پر مامور تھے۔ خاتم الانبیا کو حکم ہوا کہ حجابِ تعیناتِ اعتباری اُٹھادیں، اور حقیقتِ یک رنگی ذات کو صورت الآن کما کان میں دکھادیں، اب گنجینۂ معرفت خواص امتِ محمدی کا سینہ ہے، اور کلمۂ لا الٰہ الا اللہ مفتاح بابِ گنجینہ ہے نہ ہے عامۂ مومنین کہ وہ اس کلام سے صرف نفیِ شرک فی العبادۃ مراد لیتے ہیں اور نفیِ شرک فی الوجود جو اصل مقصود ہے اُن کی نظر میں نہیں۔ مگر جب لا الٰہ الا اللہ محمد الرسول اللہ کہیں گے اُسی توحیدِ ذاتی کے اعتقاد کی قدمگاہ پر آرہیں گے۔ یعنی ہماری اس کلمہ سے وہ مراد ہے جو خاتم الرسل کا مقصود تھا۔ یہی حقیقت ہے شفاعتِ محمدی کی اور یہی معنی ہیں رحمۃ للعالمین ہونے کے، اور اسی مقام سے ناشی ہے ندائے روح افزائے "من قال لا الٰہ الا اللہ دخل الجنۃ"

قلم اگرچہ دیکھنے میں دوزباں ہے لیکن وحدتِ حقیقی کا رازداں ہے۔ گفتگوئے توحید میں وہ لذت ہے کہ جی چاہتا ہے کوئی سو بار کہے اور سو بار سُنے۔ نبی کی حقیقت ذوجہتین ہے، ایک جہت خالق کہ جس سے اخذِ فیض کرتا ہے اور ایک جہتِ خلق کہ جس سے فیض پہنچاتا ہے۔

نبی را دو وجہ است در جوئے خلق + یکے سوئے خالق یکے سوئے خلق

کو بنش جانکر ساحل سے اُٹھا لیتے ہیں لیکن جب ہاتھ کھولکر دیکھتے ہیں تو بجز پانی کے کچھ بھی نہیں پاتے۔ قہقہہ زندگی کے سمندر کا کف ہے، جو شخص اس کے رقص کو فاصلے سے دیکھتا ہے خوش ہوتا ہے اور آفتاب سے اُس کا آبدار جسم روشن ہو کر طلسم نور نظر آتا ہے، لیکن جو قریب جاتا ہے محض فریب پاتا ہے اور تلخ کام ہوتا ہے۔

مرزا یوں فرماتے ہیں:۔

"عرضِ نازِ شوخیِ دنداں برائے خندہ ہے — دعوئے جمعیتِ احباب جائے خندہ ہے

ہے چمن میں غنچہ محوِ عبرتِ انجامِ گل — یک جہاں زانو تامل در قفائے خندہ ہے

کلفتِ افسردگی کو عیشِ بیتابی حرام — ورنہ دنداں در دل افشردن بنائے خندہ ہے

شورشِ باطن کے ہیں احباب منکر ورنہ یاں — دل محیطِ گریہ و لب آشنائے خندہ ہے"

چونکہ ہم کو مرزا کی شاعری سے یہاں بحث کرنا منظور نہیں، بر سبیلِ تذکرہ صرف اس قدر لکھدیا ہے لہٰذا جو اصحاب مرزا کی اُردو شاعری سے دلچسپی رکھتے ہیں اُن کے لیے ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری کے مقدمۂ دیوانِ غالب کا مطالعہ ایک ناگزیر شے ہے۔ ڈاکٹر مرحوم کے نزدیک "ہندوستان کی الہامی کتابیں دو ہیں۔ مقدس وید، اور دیوانِ غالب۔ لوح سے تمت تک مشکل سے سو صفحے ہیں لیکن کیا ہے جو یہاں حاضر نہیں، کونسا نغمہ ہے جو اس سازِ زندگی کے تاروں میں بیدار یا خوابیدہ موجود نہیں ہے، شاعری کو اکثر شعراء نے اپنی حدِ نگاہ کے مطابق حقیقت اور مجاز، جذبہ اور وجدان ذہن اور تخیل کے لحاظ سے تقسیم کیا ہے۔ مگر یہ تقسیم خود انکی نارسی کی دلیل ہے، شاعری انکشافِ حیات ہے، جس طرح زندگی اپنی نمود میں محدود نہیں شاعری بھی اپنے اظہار میں لاتعین ہے۔

جمالِ الٰہی ہر شے میں رونما ہوتا ہے، آفرینش کی قدرت جو صفاتِ باری میں سے ہے شاعر کو بھی ارزانی کی گئی ہے۔ جہاں ملائکہ کارخانۂ ایزدی میں پوشیدہ حسن آفرینی میں مصروف ہیں۔ شاعر یہ کام علی الاعلان کرتا ہے۔

اس لحاظ سے مرزا کو ایک رب النوع تسلیم کرنا لازم آتا ہے۔ غالب نے بزمِ ہستی میں جو

فانوسِ خیال روشن کیا ہے۔ کونسا "پیکرِ تصویر" ہے جو اس "کاغذی پیرہن" پر منازلِ زیست قطع کرتا ہوا نظر نہیں آتا!"

ماسٹر رام چندر

آپ کے حالاتِ زندگی یا تاریخ پیدائش و وفات کا کچھ پتہ نہیں چلتا۔ صرف اس قدر معلوم ہوا ہے کہ پہلے آپ سرکارِ انگلشیہ کی ملازمت میں بعہدہ مدرسی علوم انگریزی کی تعلیم دہلی کالج میں دیتے تھے۔ مولوی محمد حسین آزاد، مولوی نذیر احمد، اور مولوی ذکاء اللہ جنکا ذکر خیر تیسرے دور کے مصنفین میں کیا گیا ہے آپ کے ارشد تلامذہ میں سے تھے! ور اگرچہ آپ کا نام ظاہر کرتا ہے کہ آپ ہندو ہیں لیکن دراصل آپ عیسائی مذہب رکھتے تھے جسکو آپ نے بڑے مباحثوں کے بعد اختیار کیا تھا۔ آپ ریاستِ پٹیالہ میں ڈائرکٹر سررشتہ تعلیم بھی مقرر ہوگئے تھے۔ غالب خیال یہ ہے کہ آپ دلّی کے رہنے والے تھے۔ اور اقامتِ دہلی ہی کے زمانہ میں آپ نے ایک کتاب تذکرۃ الکاملین تحریر فرمائی۔ اِس کتاب میں مشاہیر یونان و روما کا ذکر ہے جو آپ نے انگریزی اور عربی اور دیگر کتابوں سے ماخوذ کیا ہے۔ یہ کتاب آپ نے یکم اکتوبر سنہ ۱۸۴۹ء کو اوّل مرتبہ شائع فرمائی اور اگست سنہ ۱۸۸۰ء میں تیسری مرتبہ مطبع نولکشور لکھنؤ سے چھپکر شائع ہوئی۔ اِس تیسرے ایڈیشن کا نسخہ ہمارے پیشِ نظر ہے۔ اُس عہد کی اُردو کا نمونہ حسب ذیل ہے۔ اس کتاب میں دو سَو صفحات ہیں۔ ہر نامور شخص کی شبیہ بھی کتاب مذکور میں دی گئی ہے آخری حصہ میں انگلستان کے نامور فلاسفہ اور شعراء کا بھی ذکر ہے۔ اس کے بعد آپ نے چند فارسی شعراء اور نیز ہندوستان کے نامور شاعر والمیک کا ذکر کیا ہے شنکراچارج اور مہندس بھاسکر کو بھی اس کتاب میں جگہ دی گئی ہے۔ علاوہ ازیں آپ نے دو کتابیں اور بھی تحریر فرمائی ہیں جن کا نام اصول علم ہیئت اور عجائب روزگار ہے اور جو سنہ ۱۸۴۷-۴۸ء

کیا چلے، خاصکر شاعری تو پیٹ بھرے کے مشغلے ہیں۔ اُس وقت جیسا کچھ شاہی دربار تھا، وہاں ریختہ ہی کی قدر تھی۔ ناچار مرزا صاحب نے بھی بادلِ ناخواستہ ریختہ کا منھ چڑانا شروع کیا میں صرف نمونے کے طور پر اُن کے اُس وقت کے چند شعر پڑھتا ہوں:۔

عرضِ نازِ شوخیِ دنداں برائے خندہ ہے — دعوئے جمعیتِ احباب جائے خندہ ہے
ہے عدم میں غنچہ محوِ عبرتِ انجامِ گل — یک جہاں زانو تامل در قفائے خندہ ہے
کلفتِ افسردگی کو عیشِ بیتابی حرام — ورنہ دنداں در دل افشردن بنائے خندہ ہے

ایک اور تاکہ یہ خیال نہ ہو کہ میں قصداً اتفاقی بند شعروں کو چھانٹ کر لایا ہوں۔

لبِ خشک در تشنگی مردگاں کا — زیارت کدہ ہوں دل آزردگاں کا
ہمہ نا امیدی ہمہ بدگمانی — میں دل ہوں فریبِ وفا خوردگاں کا

مرزا صاحب کی شاعری اس بات کا نمونہ ہے کہ زمانہ کیونکر اپنی جنتری میں سے لوگوں کو نکالتا ہے، وہ مرزا جو ریختہ گوئی کو ننگ سمجھتے تھے آخر آخر اپنی اُردوئے معلّیٰ پر فخر کیا کرتے تھے۔ مرزا کے منھ سے اُردو کے ساتھ معلّیٰ کا لفظ۔ فاعتبروا یا اولی الابصار۔"

اور اُسکا جواب ڈاکٹر عبدالرحمٰن کی طرف سے

زمانہ بھی اٹھکیلیاں کرتا ہوا چلتا ہے۔ کل جو بات مقبول تھی آج مسترد ہے اور جو مسترد تھی وہ مقبول ہے۔ ایک وقت وہ تھا کہ مرزا غالب کا کلام بڑے بڑے سخن فہم مشکل اور بعض اشعار کو مہمل بتاتے تھے آج وہ وقت ہے کہ اُردو شاعری میں کوئی اُن کا ہمسر نہیں مانا جاتا۔ کلام کے ادق ہونے میں تو آج بھی کسی کو شک نہیں لیکن آج اُن کے اشعار کو مہمل کہنا آسان نہیں۔ جن اشعارِ خندہ پر مولانا نذیر احمد خندہ کرتے ہیں اُنکی نسبت ایک فاضل اجل ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری مرحوم لکھتا ہے:۔

"خندہ کیا ہے؟ ارسطو کے زمانہ سے آجتک فلسفی اس مسئلہ پر غور کرتے آئے ہیں۔ ہمارے زمانے میں کانٹ، اسپنسر، ہیگل، کریپلین، ہین، لپس، ہیری ڈتھ اور برگساں نے اس پر تفصیل سے بحث کی ہے، اور عجیب اور نادر نکات پیدا کئے ہیں۔ قہقہہ ہمیشہ مجلسوں میں بلند

ہوتا ہے، جہاں گرم صحبت نہیں، یہ ساز محفل بھی نہیں۔ اسی وجہ سے لکھنؤ کے قیصر باغ کے عیاشانہ جلسوں کے رند، انشا اور جرأت، اور آگرہ کے برج کی ہولیوں کے کنہیا نظیر کے قہقہوں کی آواز آج تک بلند ہے اور میر تقی، ورڈز ورتھ اور غالب کے کلام میں جو دنیا سے نفور اور ہنگامۂ عالم سے دور رہنے والوں میں ہیں کمال سنجیدگی اور خاموشی کا اثر ہے۔ قہقہہ! قدرت کا غلبۂ نفس دور کرنے کا ذریعہ ہے، یہ صحت بخش ضرور ہے لیکن خود اخلاط کی زیادتی اور مرض کی علامت ہے۔ چنانچہ رنگین اور دیگر ہزل سرا شعراء کا اصلی علاج بذریعہ فصد ہونا چاہیے تھا۔ مرزا کی طبیعت میں خیالات سفیہہ کو بالکل بار نہیں۔ خندہ اصلاح عیوب کے لیے ایک تازیانہ ہے۔ اس میں انصاف نہیں بلکہ ایک ظلم پایا جاتا ہے۔ سودا اور اکبر کے قہقہوں کی یہی شان ہے۔ غالب کی طبیعت میں رحم ہے۔ وہ انسانی کمزوریوں پر لب آسا ہنستے نہیں بلکہ چشم آسا روتے ہیں بلکہ خندہ لاتعلقی کی علامت ہے۔ زندگی کو جو شخص دور سے دیکھتا ہے اور خود بے پرواہ رہتا ہے وہ ہنستا ہے اور جو قریب سے دیکھتا ہے اور اس میں شریک ہوتا ہے وہ نہیں ہنستا۔ غالب زندگی کی خارجی کیفیات سے اندرونی جذبات کا اندازہ نہیں کرتے۔ بلکہ اپنے اندرونی جذبات سے خارجی کیفیات کا موازنہ کرتے ہیں اس لیے غالب کے لب ہنسی سے ناآشنا ہیں۔

خندہ غم سے ناواقف ہونے کی اور لطف خواب کی علامت ہے۔ اطفال شیرخوار سوتے میں ہنستے ہیں لیکن جب بیدار ہوتے ہیں تو روتے ہیں جب تک انسان آلام مصائب سے شناسا نہیں ہوتا ہنستا رہتا ہے، لیکن جب دل ٹوٹ جاتا ہے تو بجز غم کے کوئی رفیق نہیں رہتا۔ بدنصیب مرزا سے قہقہۂ نشاط کی امید رکھنا بے جا توقع ہے۔

خندہ غم اور سکون کو چھپانے کا پردہ بھی ہے، اس مسئلہ پر برگساں اور غالب متفق ہیں۔ برگساں اپنی کتاب خندہ کے اختتام پر لکھتا ہے۔

"سمندر میں سطح پر موجوں میں رقص اور ارتعاش پایا جاتا ہے لیکن عمق قلزم میں ہمیشہ امن و سکون ہوتا ہے۔ بالائے آب لہریں آپس میں ٹکراتی ہیں اور کف لے آتی ہیں۔ یہ کف دیا

میں دہلی سے شائع ہوئی ہیں۔

حال اقلیدس مشہور مہندس یونانی کا

اقلیدس بیٹا نوقطرس کا پوتا زنیقس کا اور صاحب جو میطریا مشہور ہے۔ یہ حکیم قدیم زمانہ کا یونانی ملک شام میں رہنے والا شہر صور کا ہے اُس کو علم ہندسہ میں دستگاہ کامل تھی اور اُسکی کتاب جو ارکان یعنی قواعد مشہور ہے وہ کتاب بزرگ قدر اور بہت مفید اور اصل علم ریاضی کی ہے۔ یونان میں پہلے اُس سے اس وضع کی کوئی کتاب جامع نہیں تھی اور نہ بعد اُسکے کوئی ایسا ہوا اور اُس کا جماعات ریاضی دان یونان اور روم اور اسلام کے نے اعتبار کیا پس بعضے اُس کی شرح کرنے والے ہیں، اور بعضوں نے نئی شکلیں اُسکی کتاب میں بڑھائی ہیں اور بعضے فائدے نکالنے والے ہوئے ہیں۔ حکما ر یونان کے اپنے اپنے مدرسوں کے دروازوں پر لکھ دیتے تھے کہ ہرگز مدرسہ میں جو شخص کہ محنت کش نہ ہووے، نہ داخل ہو، اور مراد اُنکی اس سے یہ تھی کہ وہ آدمی مدرسہ میں داخل نہ ہووے جس نے کتاب اقلیدس نہ پڑھی ہووے اور اور تصنیفات اقلیدس میں سے اس نوع میں کتاب المفروضات ہے، کتاب المناظر ہے کتاب ترکیب آوازوں کی اور سوائے ان کے اور کتابیں ہیں، یعقوب بن اسحق الکندی نے یہ کہا ہے کہ اقلیدس علم ہندسہ میں اپنے زمانہ کا سب سے دانا تر تھا۔ اقلیدس نے، ابو لونیوس کی دو کتابوں کو جو مخروطات میں ہیں تفصیل سے لکھا۔ پھر ایک صدر بنایا جس سے معرفت ان پانچوں مجسمات کی حاصل ہو سکے اور اُسکو تیرہ مقالوں میں جو اقلیدس کی طرف منسوب ہیں داخل ہو گیا اور کتاب اُسکی جو قواعد ہندسی میں ہے اُس کو حجاج بن یوسف بن مطر کوفی نے دو نقلیں کیں۔ اُن میں سے ایک ہارونی مشہور ہے، اور دوسری نقل کا نام مامونی ہے اور اُسی پر اعتماد کیا جاتا ہے اور اُسکو اسحق بن حنین نے نقل کیا اور ثابت بن قرہ حرانی نے اُسکو اصلاح دی اور ابو عثمان دمشقی نے اُس میں سے کئی مقالے نقل کیے، ابن الندیم نے کہا ہے کہ میں نے اُس میں سے دسواں مقالہ

موصل میں علی بن احمد العمرانی کے خزانہ میں دیکھا تھا سنہ ۳۲۸ھ میں۔ اور شکوک اس کتاب کے
ابیرن نے رفع کیے اور اسکی شرح نیریزی اور کرابیسی نے کی اور لطیف الطیف نے یہ
ذکر کیا ہے کہ اس نے اقلیدس کا دسواں مقالہ رومی زبان میں دیکھا۔ اس میں چالیس شکلیں
زیادہ تھیں بہ نسبت اس مقالہ کے جو لوگوں کے پاس ہے، اس میں ایک سو نو شکلیں ہیں (تو اس
میں ۱۴۹ ہوئیں) اور اس نے اسکو عربی میں ترجمہ کرنے کا ارادہ کیا اور یوحنا القس نے ذکر
کیا ہے کہ وہ شکل جس کا ثابت نے مقالہ اولی میں دعوے کیا ہے اور اپنی بتائی ہے میں نے وہ
یونانی میں دیکھی ہے اور لطیف نے ذکر کیا ہے کہ میں نے اسکو دکھائی ہے اور شرح کتاب اقلیدس
کی ابو حفص خراسانی اور ابو الوفا بوجانی نے کی مگر تمام نہیں کی اور ابو القاسم انطاکی نے تمام
کتاب کی تفسیر کی اور سند بن علی نے جو اسکی تفسیر کی تو نو مقالہ اور کچھ دسویں کی کی ہے
اور دسویں کو ابو یوسف رازی نے تقسیم کیا اور بہت خوب درست ابن عمید کے واسطے کیا ہے
کندی نے کتاب اقلیدس کے اغراض میں ذکر کیا ہے کہ اس کتاب کو ایک شخص ابلینس نامی نے
تالیف کیا تھا اور اس نے پندرہ مقالے لکھے تھے جب بہت زمانہ گزر گیا تو وہ کتاب متروک
ہو گئی۔ پھر کسی بادشاہ نے اسکندرانیوں میں سے علم ہندسہ کی طرف توجہ کی اور اسکے زمانہ میں
اقلیدس موجود تھا اس بادشاہ نے اس کتاب کی اصلاح اور تفسیر کے لیے اقلیدس سے کہا۔
اس نے اس میں سے تیرہ مقالہ کی تفسیر کی۔ پس وہ اسکی طرف منسوب ہو گئے۔ پھر بعد اس کے
اسقلاوس اقلیدس کے شاگرد نے دو مقالے پائے، چودھواں اور پندرھواں۔ وہ بطور تحفہ
کے بادشاہ کو دیے۔ پس وہ دونوں بھی اس نے کتاب میں ملا دیے اور یہ تمام واقعہ سکندریہ
میں ہوا اور ابو علی الحسن بن الہیثم بصری نے جو خوش باش مصر کا ہے اس کتاب کے مصادرات
کی شرح کی ہے اور اسکے اعتراضات بھی اسی کتاب میں مع ان کے جواب لکھے ہیں پھر ابو الحسن
قشیری اندلسی نے ذکر کیا کہ اس کتاب پر شرح ہے کسی اندلسی کی اور اسکا نام وابستہ ہے
اور اس کا یہ قول تھا کہ میری شرح بیت المقدس سنہ پانسو بچانویں میں تمام ہوئی اور اقلیدس

کی تصنیف کی اور چند کتابیں ہیں۔ منجملہ ان کے سوائے اس کتاب کے کتاب الطاہرات
ہے، کتاب اختلاف المتاخرہ، کتاب المطیات، کتاب النحم بنگالی اسکے نام پر کتاب العصمۃ
ثابت کی اصلاح ہے۔ کتاب الفوائد بنگالی اسکے نام پر کتاب التاوین، کتاب النقل اور
خفت کی کتاب الترکیب بنگالی اسکے نام پر کتاب التحلیل اسکے نام پر۔ فقط“

ذکر کمالات چند از قوم ہنود حال والمیکی جی مہاراج

”صاحبان دانش و بینش پر ظاہر ہو کہ زمانہ قدیم میں ایسے ایسے فاضل اور کامل شخص
قوم ہنود میں گزرے ہیں کہ وہ فضیلت میں اچھے اچھے حکمائے فرنگ اور یونان سے کم
نہیں تھے لیکن نہایت افسوس کی بات ہے کہ ان بزرگوں کے حالات نہیں ملتے سوائے نام
کے ہم اور کچھ نہیں پاتے۔ ہم کیا کریں کہ ہمارے ہم وطنوں نے کبھی اس طرف توجہ نہیں کی کہ ایسے
ایسے خدارسیدہ اور کامل شخصوں کے حالات لکھیں۔ لیکن تیر جیسا کچھ مجھکو چند پانچ بزرگوں کا
حال معلوم ہوا ہے حتی المقدور راست ان چند اوراق میں درج کرتا ہوں۔ چنانچہ اول میں
ذکر والمیکی جی کا کرونگا۔ ہنود میں والمیکی جی کہ مصنف پاک کتاب رامائن کے ہیں بہت مشہور
بزرگ گزرے ہیں۔ نہایت افسوس کی بات ہے کہ ہم کو کسی کتاب میں نہیں معلوم ہوتا کہ یہ جناب
کس جگہ پیدا ہوئے۔ اہل فرنگ نے اس بات سے کہ یہ بڑے نامی گرامی شخص ہنود میں گزرے
ہیں ان کے حال کی تحقیقات کی۔ چنانچہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پندرہ یا سولہ برس پیشتر سن
عیسوی کے والمیکی جی کے قدم کی برکت سے باغ ہستی کی رونق تھی۔ بیان کرتے ہیں کہ وہ
ایک غریب کے گھر پیدا ہوئے تھے اور اس باعث سے کہ ان کے مربی مفلس تھے انہوں نے
بڑی عمر تک تربیت نہیں پائی اور بے علم رہے۔ جبکہ بڑی عمر ہوئی تو ان کو فرض پڑا کہ اپنے
ماباپ کی پرورش کریں۔ ناچار انہوں نے پیشہ ٹھگی اور قزاقی کا اختیار کیا اور ان دنوں میں
یہ بزرگ شخص بالکل علم کی روشنی سے جاہل تھے اور ایک جنگل میں رہنا شروع کیا۔ اور یہ رواج
ہو گئی اور گزشتہ گزرتے ہیں جو مسافر کہ گزرتا اسکو لوٹتا اور قتل کرنا اختیار کیا۔ یہ معلوم نہیں کہ پیشہ

اُنہوں نے کب تک رکھا، اور سبب چھوڑ دینے اِس بد پیشہ کا یہ ہوا کہ ایک روز تین برہمن جنکو ہمارے بزرگ برہما اور روشن اور نارد کہتے ہیں اُس جنگل میں سے گزرے جہاں کہ والمیکی جی رہتے تھے۔ والمیکی جی نے جب ان تین برہمنوں کو دیکھا مستعد اُن کے قتل کا ہوا اور چاہا کہ اُن کو جان سے ہلاک کر کر اُن کا مال لے لیجیے، لیکن اُن برہمنوں نے کہا کہ اَے والمیکی تو ہماری بات سُن لے بعد ازاں تجھ کو اختیار ہے تو چاہے جو کچھ ہمارا کیجیو۔ والمیکی نے قبول کیا تب اُن تین برہمنوں نے کہا کہ اے والمیکی تو جو رب العالمین کے بندوں کو مارتا ہے اور ستاتا ہے اور اس گناہ عظیم میں داخل ہوتا ہے اس کا کیا باعث ہے۔ اُس نے جواب دیا کہ واسطے پرورش اپنے ما اور باپ اور کنبہ کے یہ کام کرتا ہوں تب اُن برہمنوں نے یہ کہا کہ ایک بات تو اپنے ما باپ سے پوچھ آ کہ تو جو گناہ کرتا ہے اور جانیں تلف کرتا ہے تیرے گناہ کے وہ بھی شریک ہونگے یا نہیں یعنی جبکہ تجھکو تیرے اعمالوں کی سزا ہوگی تو تیرے شریک تیرے ما اور باپ بھی رہیں گے یا نہیں یہ بات والمیکی نے قبول کی اور اُن تینوں برہمنوں کو تین درختوں سے بخوبی مضبوط باندھکر خود اپنے گھر اس سوال کا جواب استفسار کرنے چلا گیا جب وہ گھر پہنچا اُس نے اپنی والدہ اور باپ سے پوچھا کہ میں جو تمہارے واسطے یہ گناہ کرتا ہوں اس کے تم بھی شریک ہو یا نہیں، اُنہوں نے صاف جواب دیا کہ ہم اِس پاپ میں تیرے شریک نہیں جو کوئی جیسا فعل کریگا اُس کا عوض رب العالمین خاص اُس شخص کو جس نے فعلِ مذکور کیا ہے دیگا۔ یہ سُنکر والمیکی جی کے دل میں اثر پیدا ہوا اور دل میں خیال کیا کہ میں اتنا گناہ ناحق کرتا ہوں کس واسطے کہ میرا کوئی شریک نہیں اور واپس آنکر ان تینوں برہمنوں مذکور کو درخت سے کھول کر خلاص کیا اور اُن کے روبرو توبہ کی کہ ایسی حرکت اور فعل نالایق پھر نہ کرونگا جب سے والمیکی جی مہاراج نے اس امر کو ترک کیا اور قادرِ مطلق کی جناب میں توبہ کی اور پشیمان ہوا۔ اور اب توجہ اُن کی اس بات پر ہوئی کہ کسی طرح سے علوم و فنون میں کمال حاصل کرنا چاہیے چنانچہ علم کی تلاش میں وہ تپ بن میں جو کہ ایک جنگل آٹھ میل کے فاصلہ پر چترکوٹ سے ہے چلے گئے۔ (چترکوٹ ایک پہاڑ قریب الہ آباد کے ہے)

اور اُن دنوں میں رکھیشر لوگ یعنی بڑے فاضل و عالم خدا رسیدہ شخص اُس جنگل میں اللہ تعالیٰ کی یاد میں رہا کرتے تھے وہاں جاکر والمیکی جی مہاراج نے ایک رکھیشر سے علم حاصل کیا اور نہایت کمال حاصل کیا لیکن مدت تحصیل علم بخوبی تحقیق نہیں ہے۔ بعد تحصیل کے وہ اُسی جنگل میں رہا کرتے اور یادِ حق اور تحصیل علوم فلسفہ میں مشغول ہیں۔ ہمیں یہ نہیں معلوم ہوتا کہ کس زمانہ سے والمیکی جی نے اشعار تصنیف کرنے شروع کیے۔ لیکن اُن کی استعداد فن شاعری میں بہت کامل تھی، جب مہاراج رامچندر سامی نے راون والی لنکا یعنی سیلون پر فتح پائی اور واپس واسطے لینے راج اجودھیا کے آئے تو تمام رکھیشر واسطے مبارکبادی کے گئے۔ اُس وقت میں مہاراج والمیکی جی بھی تشریف رامچندر مہاراج کے پاس لے گئے۔ کہتے ہیں کہ سیتا جی قبیلہ رام چندر سامی نے وقت بن باس یعنی جلا وطنی میں بیچ جنگل تپ بن کے والمیکی جی مہاراج کے گھر کو رہکر رونق اور فخر دیا۔ ہم کو نہیں معلوم کہ یہ رکھیشر کب مرے اور کس سال میں اُن کی زندگی کا انجام ہوا۔ اُن کی تصنیفات میں سے نہایت مشہور اور پاک کتاب رامائن ہے۔ ان خدا رسیدہ کا حال بہت دلچسپ اور بڑا ہے لیکن چونکہ ہمارا مطلب اس چھوٹے سے رسالہ میں صرف مختصر اً لکھنا حالات کا ملین کا ہے اسی واسطے اِن ہی چند سطور پر قناعت کی۔"

مولانا غلام امام شہید

حالات آپ شاہ غلام محمد کے بیٹے تھے اور قصبہ امیٹھی ضلع لکھنؤ کے رہنے والے تھے۔ ہندوستان کے نامور شاعر، مداح نبی اور عاشق رسول کے لقب سے مشہور تھے۔ نظم میں قتیل اور مصحفی کے شاگرد تھے۔ علوم متداولہ کی تحصیل مولوی حیدر علی صاحب کی خدمت میں کی تھی۔ فارسی زبان خوب جانتے تھے اور فارسی نظم و نثر میں آغا سید اسمٰعیل مازندرانی کے شاگرد تھے۔ سرکار نظام سے چار سو تیس روپیہ سال بلا شرط خدمت مقرر تھے۔ جو آخر وقت تک اُن کو ملتے رہے۔ آپ کے

آبا و اجداد نسب گوشہ نشین اور قناعت گزین تھے۔ لکھنؤ کے اطراف میں اور آگرہ، مراد آباد، رامپور حیدر آباد اور الٰہ آباد میں آپ کے بہت مرید تھے۔ سر سالار جنگ بہادر سابق مدار المہام ریاست حیدر آباد دکن، نواب کلب علی خاں رئیس رامپور، سعید عالم خاں رئیس سورت اور اکثر رؤسا و امرا آپ کی بڑی عزت کرتے تھے۔ پیرانہ سالی میں آپ نے انتقال کیا۔ آپ کا تخلص شہید ہے۔ افسوس ہے کہ آپ کی تاریخ ولادت و تاریخ وفات معلوم نہیں ہوئی۔

اردو نظم اور نثر رنگین، جیسا کہ اُس زمانے کا رواج تھا اچھی لکھتے تھے۔ کلام اپنا کبھی جمع نہیں کیا۔ مجموعۂ میلاد شریف اور انشائے بہار بے خزاں اور قصائد و غزلیات کا ایک مجموعہ آپ سے یادگار ہے۔

ذیل میں بطور نمونہ ایک رقعۂ تہنیت و تعزیت آمیز، اور تاج گنج کے روضے کی تعریف درج کرتا ہوں۔ ناظرین آپ کی انشا پردازی کا اندازہ اس نمونہ سے خود کر سکیں گے۔ ع

حاجت مشاطہ نیست روئے دلارام را

رقعۂ تہنیت و تعزیت آمیز

مجموعۂ انشائے شیریں زبانی، دیباچۂ کتاب سخن معانی زاد حشمتہٗ۔ قلم بعد تشریح مراتب اشتیاق و آرزومندی کے تعزیت کے مضمون سے آنسو بھی بہاتا ہے اور کچھ خوشی میں آکر مبارکباد کا مضمون بھی زبان پر لاتا ہے۔ زمانے میں خوشی و غم دونوں کا چولی اور دامن کا ساتھ ہے اور دنیا میں دھوپ چھاؤں کی طرح شادی کے ہاتھ میں ماتم کا ہاتھ ہے۔ دو پھول ایک ہی شاخ میں پھولتے ہیں۔ ایک دولہا دولہن کے سہرے کے کام آتا ہے، دوسرا میت کی تربت پر چڑھایا جاتا ہے۔ دو موتی ایک سیپ میں پیدا ہوتے ہیں، ایک بادشاہ کے تاج میں لگاتے ہیں، دوسرے کو کھرل میں پیس کر دوا میں ملاتے ہیں۔ ایک ہی کافور سے دو شمعیں بنتی ہیں، ایک محفل سرود کے کام آتی ہے، دوسری کسی مردے کے مزار پر جلائی جاتی ہے۔ چمن میں کلی اگر کھل کھلا کر ہنستی ہے، شبنم بے اختیار اس کے ہنسنے پر روتی ہے جس باغ میں خزاں ہو وہاں بہار بھی ہے اور جہاں گل ہو وہاں خار بھی ہے، بادام کے پوستا

اور مغز کو دیکھیے کہ نرمی اور سختی ایک ہی جگہ موجود ہے۔ برف کو سوچیے تو گرمی اور سردی اُس کے ساتھ ہی موجود ہے۔ سرخی اور زردی گلِ رعنا کی دلیل ہے۔ تقدیر نے اگر صبح کو لباسِ سفید خوشی کا پہنایا تو شام کے واسطے جامہ سیاہ ماتمی بنایا۔ حاصل یہ کہ آپ کے والدِ ماجد نے عین عید کے دن انتقال فرمایا۔ گویا اسی گردشِ لیل و نہار کی خزاں و بہار کا تماشا دکھایا۔ اور اس غم نے جتنا رُلایا تھا آپ کی شادی نے اتنا ہی ہنسایا۔ افسوس میں آسمان جو ماتمی لباس پہنے نظر آیا تو شفق کی سُرخی نے وہیں خوشی کا رنگ بھی دکھایا۔ رنج میں دو ہتڑ جو پہلے منہ پر مارا، تو پھر خوشی میں دبی دونوں ہاتھ اُٹھا کر یوں دعا مانگی کہ خدا اُس مرحوم کو جنّت نصیب کرے اور آپ سلامت رہیں اور شادی مبارک ہو۔ بندہ بھی ادائے رسمِ فاتحہ خوانی و شرکتِ محفلِ شادمانی کے واسطے بضرورت حاضر ہو گا زیادہ والسلام۔

تاج گنج کے روضے کی تعریف

آج قلم کا دماغ پھولوں کی خوشبو سے معطر ہے، کاغذ کا صفحہ آنکھ کی سفیدی کی طرح منوّر ہے۔ نظر کا ڈورا، رگِ گل کی طرح پر رنگین ہے۔ نگاہ و نگار رشتہ گلدستہ کے مانند بہاریں ہے کس واسطے ؟ کہ مجھے ایک باغ اور مکان کی صفت لکھنی منظور ہے جس کی سیر سے چشمِ مردم میں نور ہے اُس کے صحن اور دالان میں خدا کی قدرت کا گل کھلا ہے چمن اور میدان میں صانع کی صنعت کا تماشا ہے وہ کون مکان ؟ اور کیسا گلستان ؟ جو شاہجہاں ایسے بادشاہِ عالیجاہ کا قیام گاہ ہے۔ کون قصر ؟ اور کیسا ایوان ؟ جو جنابِ عالیہ بادشاہ بیگم کا آرامگاہ ہے جس جگہ یہ دونوں آفتاب ماہتاب سوتے ہیں۔ چاند اور سورج دن رات اُس زمین کے نثار ہوتے ہیں۔ تاج بی بی کا روضہ جہان میں مشہور ہے اور ہر چمن اُس کا جنّت کی خوشبو سے معمور ہے۔ اکبر آباد کیا بلکہ سارے ہندوستان کو اس مکان سے عزّت ہوئی ہے۔ ہندوستان کیا بلکہ تمام روئے زمین کو اُس سے زینت ہوئی ہے۔ اس چمن کی ہوا نے جو کلیوں کی بو باس سے جہان کے دماغ کو معطر کر دیا تو باغ کی فضا نے دامنِ نظر کو گلچیں کے دامن کی طرح پھولوں سے بھر دیا۔

سبحان اللہ! کیا روضہ ہے! کہ رضوان جس کے لطف و لطافت سے راضی و خوشنود ہے۔ بارک اللہ کیا باغ ہے جسمیں بہشت کی ہر نعمت موجود ہے۔ سورج اس باغ کا ایک زرد آلو ہے۔ چاند اس چمن کا گلِ شبو ہے۔ پہلے دروازے کی بلندی دیکھنے کو جو آسمان گردن اور سر اُٹھائے تو اُسکو آفتاب کی پگڑی سنبھالنی دشوار ہو جائے، دونوں بازو کے سرے سے محراب کی چوٹی تک کلام مجید کا سورہ چوب قلم سے جو لکھا ہے، عقل اس طلسمات سے حیران ہے کہ ہر حرف جیسا نزدیک سے نظر آتا ہے، ویسا دور سے دکھائی دیتا ہے۔ اس فن کے مبصر انصاف سے دیکھیں کہ یہ بات کیسی مشکل اور کس طرح کی تقسیم کامل ہے۔ سنگِ مرمر پر سنگ موسیٰ کی پچی کاری کیسے یا آنکھوں کی سفیدی پر پتلیوں کی سیاہی کی نمواری۔ حرف ہیں یا کافور کے قرص پر مشک کے دانے پڑے ہیں۔ لفظ ہیں یا ہیرے کی تختی پر نیلم کے نگین جڑے ہیں۔ مینار آسمان کی طرف تعجب کا ہاتھ اُٹھائے ہے کہ یہ خم دیکھیے، اور اس بارگاہ کے ساتھ ہمسری کا دعوے اور دم دیکھیے، محراب کا خم، ابروسے اشارہ کر رہا ہے کہ اندر جا کر ذرا بہار کا عالم دیکھیے۔ نہیں! نہیں! غلطی ہوئی مجھ سے! بلکہ محراب کا اشارہ یہ ہے کہ پہلے حواس کو یہاں طاق پر رکھ جائیے تب آگے قدم بڑھائیے، بس جو اُدھر چوکھٹ لانگنے کی عزیمت ہوئی تو اُدھر عقل اور حکمت رخصت ہوئی۔ سیر سے سیر ہونا تو نگاہ کے ہاتھ ہے لیکن حیرت یہاں ہر قدم کے ساتھ ہے۔ سب کے پہلے بہار کے علمدار بڑی شوکت اور شان کے ساتھ نظر پڑتے ہیں۔ یعنی دورویہ سرو کے درخت نیک بخت جوان کی طرح حسن کے جوبن سے اکڑتے ہیں۔ زمرد کے جھاڑ کی تو کیا حقیقت ہے؟ جو اس کے ساتھ تشبیہ دوں، مگر ہاں لکھوں تو یوں لکھوں کہ اچھے اچھے سبز پوش ہر قطار میں کھڑے ہو کر ناز و انداز سے انگڑائیاں لے رہے ہیں۔ یا غلمان بہشت سے آکر آسمان کو اس باغ کی خوبیوں کی خبر دے رہے ہیں۔ نشو و نما جو ہر چیز کو بڑھاتی ہے شاید سرو ہی کے لباس میں کمر بستہ یہاں آتی ہے، یا آب و ہوا کی لطافت سے سرو کے پردے میں آپ ہی بڑھی جاتی ہے۔ دونوں قطار کے درمیان جو ایک حوض زمیں دوز اور طویل ہے گویا فی سبیل اللہ سبیل ہے، صاف پانی سے بھرا ہوا ہے، ایسا

ہر سرو کے مقابل ایک ایک فوارہ چھوٹ رہا ہے۔ اُدھر سرو نے زمرد کے فوارہ کا نقشہ اُڑا لیا۔ اِدھر پانی کے فوارے نے ہیرے کو پانی کر کے بہا دیا۔ بعد اسکے ایک مربع حوض جو بہت سُتھرا ہے نہایت خوبصورت اور خوشنما ہے۔ آئینہ اُسے دیکھ حیرت میں آتا ہے، نگاہ کا قدم پھسلا جاتا ہے بہشت کی نہر اُسکا خزانہ ہے، آئینہ اُس کا آبدار خانہ ہے۔ بلکہ آئینہ میں یہ روانی کہاں؟ اور وہ موجوں کی سلسلہ جُنبانی کہاں؟ پانی اُس کا دودھ سے زیادہ مصفا ہے، برف سے زیادہ ٹھنڈا ہے۔ چونہ جو شیر خشت ہو جائے تو روا ہے۔ پتھر جو یخ در بہشت بن جائے تو بجا ہے، چاروں طرف سے فوارے چھوٹتے ہیں گویا آسمان سے تارے ٹوٹتے ہیں، پانی کی زمین سے پانی کا درخت نکلنا اور پانی ہی کے پھل پھول سے پھولنا، پھلنا خدا کی قدرت ہے، آئینے کے چشمے سے سوج کا کھڑے ہو کر چلنا اور ہوا کے ساتھ زور کر کے اُچھلنا عجب حکمت ہے۔ عقل نے جب فکر کے دریا میں غوطہ لگایا تو روضے کے اُدھر حوض کے واقع ہونے کا سبب یوں سمجھ میں آیا کہ نگاہ پہلے اُس میں نہا کر پاک ہو لے تب روضے کے طواف کی آرزو کرے، اور ناطقہ پہلے اسکے پانی سے کلیاں کر کے منہ صاف کرے۔ تب بہار کی صفت میں گفتگو کرے۔ اس حوض کی یاد میں دریا کی پسلی پھڑکتی ہے، سینے میں آگ بھڑکتی ہے جوش کھا کر دیکھنے آتا ہے مگر دیوار سے سر ٹکرا کر پھر جاتا ہے جس طرف آنکھ اُٹھائیے اور جدھر خیال دوڑائیے۔ بیلا، چنبیلی، مونگرا، موتیا، چنپا، جوہی، کیتکی، کیوڑا، گلاب، سدا بہار، گیندا، داؤدی گُلِ عباس، گُلِ مہندی، نازبو، گُلِ رعنا، گلِ فرنگ، گُلِ چاندنی، شب بو، کلغا، سیوتی، دوپہریا سورج مکھی، لالہ نافرمان، سوسن، ہزار زبان، نرگسِ حیراں، قسم قسم رنگ برنگ کے پھول پھول رہے ہیں، پیارے سہانے درختوں پہ صبح شام کی دھوپ چھاؤں کا عالم، پتوں پر شبنم کی طراوت اور نم، ڈالیوں پر چڑیوں کا غل، پریوں کی آپس میں چھیڑ چھاڑ، اور جوانوں کے غول، ہمجولیوں کی ہنسی اور ٹھٹول۔ کہیں گل کے قہقہے، کہیں بلبل کے چہچہے ہیں۔ مور اُدھر شور کرتا ہے، اِدھر مستوں کا جنون زور کرتا ہے۔ کویل وہاں کوک اُٹھتی ہے، سینہ میں یہاں ہُوک اُٹھتی ہے پپیہا جو اُدھر بولا۔ پی کہاں، تو یہاں بدن میں جی کہاں؟ ڈیتر کی اُدھر نئے نئے طور پر دُھن ہے یاں ادھر

خیاباں کے جامہ کی اُدھیڑ بُن ہے، طوطی کی جو بات ہے گویا نبات ہے، مینا کو شیریں کلامی سے
کام ہے، ناکامی کا کام ہی تمام ہے۔ جگنوؤں کا چمکنا، باغ کا مہکنا، دونوں وقت کا ملنا۔ شبّو کا
لہکنا۔ سنبل کا بال بکھیرنا۔ مچھلیوں کا حوض میں تیرنا۔ ہوا کا چلنا۔ دل کا مچلنا۔ سبزی کا لہلہانا
چڑیوں کا چہچہانا۔ شفق کا پھولنا گلزار خیال کا تماشا دکھاتا ہے، یہ سماں دیکھ کر کوئی پھول سا پھولا نہیں
سماتا، کوئی بوئے گل کی طرح گریبان پھاڑ کر نکلا جاتا ہے، بیلا بے لاگ دل کو کھینچتا ہے، چنبیلی کی
البیلی وضع پر روح شیدا ہے۔ مہندی کی ٹٹیوں پر چاندنی لوٹ پوٹ ہے۔ جسکی بہار سے چاند کے
جگر میں داغ اور دل پر چوٹ ہے، لالہ لعل سے بہتر، سبزہ زمرد کا ہمسر، کیاریوں کے کنارے کی
ہری دوب کا شانی مخمل سے زیادہ خوب و مرغوب، درختوں کے تھالے ہیں یا دودھ کے بھرے ہوئے
پیالے ہیں۔ آبشار ہے یا آئینہ پشت بدیوار ہے، پانی کی چادر پر جو نقش و نگار ہے، قلم قدرت کا
یادگار ہے، نہر کی جو ایسی اٹکھیلیوں کی چال ہو تو دل کیونکر نہ پامال ہو؟ مہتاب سرو کے ساتھ
ہم آغوش ہے، یا کوئی جوانِ سبز رنگ بادلہ پوش ہے۔ گلنار کو دیکھ کر لعل انگاروں پر لوٹتا ہے، سبزے
کے رشک سے زمرد زہر کھاتا ہے، یہ لالے ہیں یا آتش کے پرکالے ہیں، جن کے دیکھنے سے جینے
کے لالے پڑتے ہیں، اور دل ہی دل میں داغ بڑھتے ہیں۔ چاندنی نے سبزے میں کیفیت کیا ہے یا سبز
مخمل پر مقیش کتر کے چھڑک دیا ہے۔ کلغی کو قلم کر کے ایسا برابر کیا ہے کہ اُسکے پتّے اور پھولوں سے گویا
سبز اور سرخ بوٹیوں کا غالیچہ بچھا دیا ہے۔ مولسری کی بھینی بھینی خوشبو ہے تو صبا کو اسی کی جستجو ہے۔
یہ ہارسنگھار کی گلکاریاں ہیں یا آگ کی چنگاریاں ہیں۔ بیر بہوٹیاں رینگتی ہیں، یا یاقوت کا خون
بہہ چلا۔ لالہ زار چمن میں کھلا، یا چنار سے شعلہ نکل پڑا۔ اگر آب و ہوا کی لطافت یہی ہے تو موتی صدف
سے نکل کر کلیوں کا روپ دکھلائیگا اور مچھلی کا کانٹا سرسبز ہو جائیگا۔ میوے کا نام زبان پر آیا اور
حلاوت کے منھ میں پانی بھر آیا۔ کولا۔ سنگترہ۔ رنگترہ۔ چکوترہ۔ نارنگی۔ لیمو۔ زردآلو۔ شفتالو
۔ بہی۔ انگور۔ انناس۔ ناشپاتی۔ کیلا۔ بیر۔ کمرکھ۔ شریفہ۔ کٹھل۔ بڑھل۔ انب۔
بلیندا۔ امرود۔ شہتوت۔ پونڈا۔ کھرنی۔ کوئی پھل ایسا نہیں جو اس باغ میں نہ ہوتا ہو

اور ساگ ترکاری سے لیکر جڑی بوٹی تک کوئی ایسی شے نہیں جسے باغبان نہ بوتا ہو کہیں کولے سنگترے سے چمن کا چمن آگ بھبوکا ہوگیا۔ کہیں فالسے کی رنگت سے زمین کا دامن اودا ہوگیا۔ سیب سے آسیب کی زحمت دفع ہوجاتی ہے۔ بہی بدن میں فربہی لاتی ہے، ناشپاتی سے روح راحت پاتی ہے۔ انار نے خلق کے منھ یاقوت اور موتیوں سے بھر دیے۔ نازنینوں کے دانت کھٹے کردیے۔ ادنے میوہ یہاں کا اخروٹ ہے جس پر ستاروں کا دل لوٹ پوٹ ہے، آسمان دن رات نسونسو طرح تاک جھانک میں رہا۔ تب انگور کی ٹٹی سے ایک خوشہ پروین کا جھپٹا لے بھاگا۔ سو یا وصف اس پختہ کاری کے اب تک پکانہ سکا۔ کیلا یہاں ایک ایک گود میں ہزار ہزار پھلتا ہے۔ بارہ تو وہاں آسمان پر اکیلا نکلتا ہے۔ اس زمین کا اگر خربزہ یا سردا ہے پوست میں مغز اُسکا حلوا ہے۔ ہندوانہ مرغِ روح کا آشیانہ ہے جسمیں ایک ہی جگہ موجود آب ودانہ ہے۔ شہتوت تمام عالم کا قوت۔ انجیر بالکل شکر و شیر۔ امرود حلوائے بے دود۔ انبہ نازنینوں کے ہونٹھوں پر مہر خاموشی ہے، کہ میرے سامنے شیرینی کا دعوے ناحق کوشی ہے۔ دوات قلم کی زبان چوستی ہے۔ گویا نیشکر ٹہرایا۔ قلم کاغذ کو چاٹتا ہے۔ آپ چیونٹا بنا اور اُسکو مصری بنایا، مالی ڈالیاں سروں پر لیے جابجا کھڑے ہیں۔ انعام کے لیے اڑے ہیں، کوئی پھولوں کا ہار لاتا ہے، کوئی گلدستہ دور سے دکھاتا ہے۔ پھر جو روضہ نظر آیا تو وہ سماں آنکھوں میں سمایا کہ نہ دیدۂ خواب کی آنکھوں سے کبھی دیکھا نہ شنید نے خیال کے کانوں سے کہیں سُنا۔ الہی یہ روضہ ہے یا خُلدِ بریں، آسمان ہے یا زمین۔ سنہرا کلس ہے یا سورج کی کرن، گنبد ہے یا نور کا مسکن۔ قبرستان ہے یا روضۂ رضوان۔ مکان ہے یا جواہرات کی کان، جو پتھر ہے جواہرات سے بہتر ہے۔ صبح نے مرمر کے ایسی صفائی پائی۔ تب سنگِ مرمر کی صورت بنائی۔ سنگِ موسے کو شعلۂ تجلی نے طور پر جلایا۔ تب اس درگاہ کے صرف میں آیا۔ کلس کا سایہ دریا میں ایسا رہتا ہے جیسا برجِ آبی میں آفتاب۔ حوض میں چاند ایسا نظر آتا ہے جیسا دریا میں حباب۔ دیوار میں منھ نظر آتا ہے گویا آئینہ ہے۔ بلا کیا ہوا۔

گنبد سے دماغ تازہ ہوتا ہے گویا قرابہ ہے گلاب سے بھرا ہوا۔ صبح کی طبا شیر استر کاری کے صرف میں لائی گئی، جو اب تک وہی نور کا عالم دکھاتی ہے۔ رات کا مشک اور شفق کی زعفران پلیسکر گارے میں ملائی گئی جو آج تک وہی خوشبو دماغ میں آتی ہے۔ آفتاب کے ترنج کا عرق نچوڑ کر ماہتاب کے پیالے میں موتی کی آب سے ملایا تھا جو چونے میں یہ نور اور ایسی صفائی ہے بہشت کے کافور کو شفق کے ساتھ آفتاب کی کھرل میں پلیسکر صبح کے دامن میں چھانا تھا جو رنگ نے یہ آب و تاب پائی ہے، جالیوں کی نزاکت میں عقل کام نہیں کرتی، کہ پتھر کو موم کرکے بال کا قلم پار کردیا۔ یا خیال کا جالا کھینچکر نگاہ کی نوک سے جیسا چاہا کام بنالیا۔ ہر ایک جالی میں وہ ملاحت ہے کہ دیکھنے میں پتھر کی حالت نہ ہے۔ کاغذ کی وصلی پر حرفوں کا اُبھراپن تو معلوم بھی ہوتا ہے۔ یہاں پتھر پر پتھر کی پچی کاری کا نہ جوڑ نظر آتا ہے نہ پیوند اور نہ جوڑ کہیں سے پست ہے نہ بلند بس کر شہید بس کر۔ اب لکھنے کی مت ہوس کر ؎



خان بہادر منشی غلام غوث بیخبر

حالات آپ کا نام منشی غلام غوث ہے اور بیخبر تخلص ہے۔ آپ کے مورث اعلیٰ سلطان زین العابدین شاہ، کشمیر کے رہنے والے تھے اور حکومت مغلیہ میں ان کے بزرگ عہدہ ہائے قضائے کشمیر پر مامور ہوئے، ان کے والد خواجہ حضور اللہ ترک وطن کرکے تبت چلے گئے، وہاں سے ریاست نیپال میں آئے اور وہیں اقامت اختیار کرلی۔ چنانچہ بیخبر ۱۲۴۰ھ ہجری میں وہیں پیدا ہوئے ان کی چار برس کی عمر تھی کہ والد اور نانا کو گردش زمانہ نے پھر ترک وطن پر مجبور کیا اور ابن مرتبہ بنارس میں طرح اقامت ڈالی۔ یہیں سن شعور کو پہنچے اور تعلیم کا سلسلہ تکمیل کو پہنچا ۱۸۴۰ء میں ملازمت کا سلسلہ شروع ہوا اور اپنے خالو خان بہادر مولوی سید محمد خاں میر منشی نواب لفٹنٹ گورنر اضلاع شمال و مغرب کے نائب مقرر ہوئے۔ انہیں ایام میں لارڈ ایلن برا نے گوالیار پر چڑھائی

کی تو یہ گورنر جنرل کے منشی خانہ میں منسلک ہو کر شریک مہم ہوئے اور جنگ کے خاتمہ پر بہ صلۂ کارگزاری خلعت پایا۔ پھر کئی سال بعد اپنے خالو کی بجائے میر منشی مقرر ہوئے اور ۱۸۸۵ء تک برابر اسی عہدۂ جلیلہ پر فائز رہے اور حکام میں اعلیٰ درجہ کا اعتبار اور وقار حاصل کیا۔ غدر ۱۸۵۷ء میں سند و خلعت ہفت پارچہ مرحمت ہوا۔ آپ کو ملکہ معظمہ کے خطاب شاہی اختیار کرنے پر تمغۂ قیصری ملا۔ ۱۸۸۵ء میں ۴۵ سال کی ملازمت کے بعد آپ نے پنشن لی۔ اور خطاب خان بہادر و اقتدار سے مخاطب کیے گئے۔

شاعری اور انشا پردازی میں آپ کو ایک امتیازی درجہ حاصل تھا۔ اور آپ کے تعلقات مرزا غالب مرحوم سے دوستانہ تھے۔ آپ کی دو تصنیفیں خونابۂ جگر اور فغانِ بیخبر آپ سے یادگار ہیں۔ آپ نے پیرانہ سالی میں ۱۹۰۵ء میں انتقال فرمایا۔

مرزا غالب کے خطوط

ہم یہاں مرزا غالب کے دو خط جو خواجہ غلام غوث بیخبر کے نام لکھے گئے تھے نقل کرتے ہیں:۔

"قبلہ! کبھی آپ کو یہ بھی خیال آتا ہے کہ کوئی ہمارا دوست جو غالب کہلاتا ہے وہ کیا کھاتا پیتا ہے؟ اور کیونکر جیتا ہے؟ پنشن قدیم انگریزی جمعیتہ سے بند اور میں سادہ دل فتح جدید کا آرزومند۔ اُس پنشن کا احاطۂ پنجاب کے حکام پر مدار ہے تو اُن کا یہ شیوہ اور یہ شعار ہے کہ نہ روپئے دیتے ہیں نہ جواب، نہ مہربانی کرتے ہیں نہ عتاب۔ خیر اُس سے قطع نظر کی، اب سنئے اِدھر کی۔ ۱۸۵۶ء سے بموجب تحریر وزیر عطیۂ شاہی کا امیدوار ہوں، تقاضا کرتے ہوئے شرماؤں، اگر گنہگار رہوں، گنہگار ٹہرتا تو گولی یا پھانسی سے مرتا۔ اس بات پر کہ میں بے گناہ ہوں، بے قید اور مقتول نہ ہونے سے آپ اپنا گواہ ہوں۔ پیشگاہِ گورنمنٹ کلکتہ میں جب کوئی کاغذ بھیجا بتقلم چیف سکتر اُس کا جواب پایا ہے۔ اب کی بار دو کتابیں بھیجیں۔ ایک پیش کش گورنمنٹ اور ایک نذر شاہی۔ نہ اُسکے قبول کی اطلاع، نہ اُسکے ارسال سے آگاہی ہے۔ جناب سر ولیم میور صاحب بہادر نے بھی عنایت نہ فرمائی، اُن کی بھی کوئی تحریر مجھکو نہ آئی۔ یہ سب ایک طرف، اب

خبریں مختلف۔ کہتے ہیں کہ چیف سکتر بہادر لفٹنٹ گورنر ہوئے۔ یہ کوئی نہیں کہتا کہ اُن کی جگہ کونسے صاحب عالی شان چیف سکتر ہوئے۔ مشہور ہے کہ جناب ولیم میور صاحب صدر بورڈ میں تشریف لے گئے۔ یہ کوئی نہیں بتاتا کہ لفٹنٹ گورنری کے سکرٹری کا کام کس کو دے گئے۔ آپ کا حال کوئی نہیں کہتا کہ آپ کہاں ہیں؟ ہاں از روئے قیاس جانتا ہوں کہ آپ اُسی منصب اور اُسی دفتر میں شاد و شادماں ہیں جواب لفٹنٹی کے سکرٹری ہوئے ہونگے اُن سے علاقہ رہتا ہوگا۔ میور صاحب بہادر سے کاہے کو ملنا ہوتا ہوگا؟ لفٹنٹ گورنری اور صدر بورڈ یہ دونوں محکمے الہ آباد آگئے یا آئینگے؟ بہرحال، آپ اب کیوں آگرہ کو جائینگے؟ نواب گورنر جنرل بہادر کی روانگی کی بھی خبر میں اختلاف ہے۔ کوئی کہتا ہے کہ ۲۰ جنوری کو گئے۔ کوئی کہتا ہے فروری میں کوچ فرمائینگے۔ میں تو اُدھر سے بھی ہاتھ دھو بیٹھا۔ ہر طرح اپنی قسمت کو رو بیٹھا۔ مگر یہ چاہتا ہوں کہ حقیقت واقعی پر کماحقہ اطلاع حاصل ہو تاکہ تسلی خاطر اور تسکینِ دل ہو۔ اگر ان مطالب کا جواب نہ مجمل بلکہ مفصل، نہ دیر بلکہ جلد مرحمت کیجئے گا تو گویا مجھکو مول لے لیجیے گا۔ زیادہ اس سے کیا لکھوں۔ فقط

(*)

پایانِ شبِ سیہ سپید است ۔۔۔ در نومیدی بسے امید است

قبلہ! آج آپ کی خوشی و خوشنودی کے واسطے اپنی روداد لکھتا ہوں۔ سنہ ۱۸۶۰ء میں لارڈ صاحب بہادر نے میرٹھ میں دربار کیا، صاحب کمشنر بہادر دہلی، اہالی دہلی کو ساتھ لیگئے میں نے کہا کہ "میں بھی چلوں؟" فرمایا کہ "نہیں" جب لشکر میرٹھ سے دلّی آیا۔ میں سوافق اپنے دستور کے روزِ ورودِ لشکر مخیم میں گیا۔ میر منشی صاحب سے ملا۔ اُن کے خیمہ میں سے اپنے نام کا ٹکٹ صاحب سکتر بہادر کے پاس بھیجا۔ جواب آیا کہ "تم غدر کے دنوں میں بادشاہ باغی کی خوشامد کیا کرتے تھے، اب گورنمنٹ کو تم سے ملنا منظور نہیں" میں گدائے مبرم، اس حکم پر ممنوع نہ ہوا جب لارڈ صاحب بہادر کلکتہ پہنچے، میں نے قصیدہ حسب معمولِ قدیم بھیج دیا، مع اُس حکم کے واپس آیا کہ "اب یہ چیزیں ہمارے پاس نہ بھیجا کرو" میں مایوس مطلق ہو کر

بیٹھ رہا۔ اور حکام شہر سے ملنا ترک کیا اور آخر ماہ گزشتہ یعنی فروری ۱۸۶۳ء میں
نواب لفٹنٹ گورنر پنجاب دلی آئے۔ اہالیِ شہر صاحب ڈپٹی کمشنر بہادر و صاحب کمشنر
بہادر کے پاس دوڑے اور اپنے نام لکھوائے۔ میں تو بیگانۂ محض اور مطرودِ حکام تھا
جگہ سے نہ ہلا۔ کسی سے نہ ملا۔ دربار ہوا۔ ہر ایک کامگار ہوا۔ شنبہ ۸ رفروری کو آزادانہ منشی
من پھول سنگھ صاحب کے خیمہ میں چلا گیا۔ اپنے نام کا ٹکٹ صاحب سکرٹری بہادر کے
پاس بھیجا، بلا لیا۔ مہربان پاکر نواب صاحب کی ملازمت کی استدعا کی۔ وہ بھی حاصل ہوئی
دو حاکم جلیل القدر کی وہ عنایتیں دیکھیں جو میرے تصور میں بھی نہ تھیں۔ جملہ معترضہ میر منشی
لفٹنٹ گورنری سے سابقہ معرفت نہ تھا۔ وہ بطریق حسنِ طلب میرے خواہاں ہوئے تو میں
گیا۔ جب حکام بجز داستدعا مجھ سے بے تکلف ملے تو میں قیاس کر سکتا ہوں کہ میر منشی کی طرف
سے حسنِ خلق با یائے حکام ہوگا۔ بقیہ روداد یہ ہے کہ دوشنبہ ۲ مارچ کو سوادِ شہر مخیم خیام گورنری
ہوا۔ آخر روز میں اپنے شفیقِ قدیم جناب مولوی اظہار حسین خاں، صاحب بہادر کے ساتھ گیا
اثنائے گفتگو میں فرمایا کہ "تمہارا دربار اور خلعت بدستور بحال و برقرار ہے" متحیرانہ میں نے پوچھا
کہ "حضرت! کیونکر؟" حضرت نے کہا کہ "حاکمِ حال نے ولایت سے آکر تمہارے علاقہ کے
سب کاغذ انگریزی و فارسی دیکھے اور باجلاس کونسل حکم لکھوایا کہ اسد اللہ خاں کا دربار اور تمبر
اور خلعت بدستور، بحال و برقرار ہے" میں نے پوچھا کہ "حضرت! یہ امر کس اصل پر متفرع ہوا؟"
فرمایا کہ "ہم کو کچھ معلوم نہیں، بس اتنا جانتے ہیں کہ یہ حکم دفتر میں لکھوا کر چودہ[۱۴] دن یا پندرہ دن بعد
ادھر کو روانہ ہوئے ہیں" میں نے کہا "سبحان اللہ!" **شعر**

کارسازِ ما بہ فکرِ کارِ ما　　　فکرِ ما در کارِ ما آزارِ ما

سہ شنبہ ۳ رمارچ کو بارہ بجے نواب لفٹنٹ گورنر بہادر نے مجھ کو بلایا، خلعت عطا کیا اور فرمایا کہ
"لارڈ صاحب بہادر کے یہاں دربار خلعت بھی بحال ہے۔ انبالے جاؤ گے تو دربار خلعت
پاؤ گے" عرض کیا گیا کہ "حضور کے قدم دیکھے، خلعت پایا۔ لارڈ صاحب بہادر کا حکم سن لیا"

میں نہال ہوگیا۔ اب یہاں سے کہاں جاؤں؟ جیتا رہا تو اور دربار میں کامیاب ہوں گا۔"

شعر

کارِ دنیا کسے تمام نہ کرد
ہر چہ گیرید مختصر گیرید

بیخبر کی انشا پردازی اب منشی غلام غوث بیخبر کی انشا پردازی کا نمونہ ہدیۂ ناظرین ہے۔

صبح

"رات آخر ہوئی، صبحِ صادق کا جلوہ نظر آنے لگا۔ ستارے جو رات کی تاریکی میں چمک دمک دکھا رہے تھے اپنی روشنی کو پھیکی دیکھ کر شرمائے اور آہستہ آہستہ غائب ہوئے، جیسے چور نور کا تڑکا ہوتے ہی اپنے اپنے ٹھکانے کو بھاگتے ہیں۔ شب کی سیاہی کا رنگ اُڑا، مشرقی اُفق پر سفیدی نمودار ہوئی۔ گویا محبوبِ صبح نے رات کے سیاہ بکھرے ہوئے بالوں کو چہرے سے سمیٹ لیا اور اُس کی نورانی پیشانی نظر آنے لگی۔ نسیمِ سحری معشوقوں کی طرح خوش خرامی کرتی ہوئی چلی، نرم نرم شاخیں درختوں کی، مستوں کے مانند جھومنے لگیں۔ جانوروں نے چہچہانا شروع کیا باغ میں غنچے کھلنے لگے، جیسے نیند سے کوئی آنکھ کھولے، دریا میں پتلی پتلی لہریں پڑیں، کاتبِ قدرت نے قلمِ شعاع سے زر نگار کرنے کے لیے صفحۂ آب پر مسطر کیا۔ شاہی نوبت خانے کے کوس و ڈھل کی آواز بلند ہوئی۔ اُسکی سُریلی آواز سے لوگ نیند سے چونکے اور اپنے اپنے کام سے لگے۔ میکدہ کا دروازہ کھلا۔ مغبچوں نے صحنِ میخانہ کی رفت و روب کی۔ پیرِ مغ نے صراحی اور ساغر سنبھالا۔ میکشوں نے شب کے خمار کی سرگرانی دفع کرنے کی غرض سے جستجو کی فکر میں اُس طرف کی راہ لی۔ اُدھر مرغ نے اذان دی، اِدھر موذن بھی اپنے دڑبے سے نکل صحنِ مسجد میں آکھڑا ہوا۔ اُس کے گلے سے گلا ملانے لگا۔

یہ سنکر رات بھر کے جاگے ہوئے عابد انگڑائیاں لیکر سجادہ پر سے اُٹھے۔ جبہ اور عمامہ سنبھال عصا ہاتھ میں لے مسجد کی راہ ناپنے چلے۔ بتکدہ میں گھنٹے اور ناقوس بجے، برہمنوں نے پھول اور سیندور بتوں پر چڑھا کر بھیروی بھجن گانا شروع کیا۔ صنم پرستوں نے

سجدۂ بت کے لیے آمادہ ہو کر بیت الصنم کا ارادہ کیا ہے"

دوپہر

"دوپہر کا وقت ہوا، آفتاب سمت الراس پر آیا، زمین تپنے لگی، پاؤں رکھتے ہوئے خوف آتا تھا کہ چھالے نہ پڑیں۔ بیٹھے ہوئے جی ڈرتا تھا کہ سانس کی گرمی سے لب پر چھالے نہ پڑیں، آسمان سے وہ آتشباری ہونے لگی کہ ہوا نے شعلۂ جوالہ کی صورت پیدا کی، خاک کے ذرّوں نے چنگاریوں سے ہیئت بدلی، جانوروں نے ڈر سے اُڑنا موقوف کیا کہ جسم جل کر کباب نہ ہو، زمین کی دہشت سے سکتہ کی حالت ہوگئی کہ دھوپ کی گرمی سے پگھل کر آب نہ ہو، دوکانداروں نے دوکانوں کے تختے لگا دیے اور اُس کی آڑ میں پڑ رہے لوگوں کا گھروں سے نکلنا چلنا، پھرنا بند ہوا، بازاریں سنسان ہوگئیں، دن نے رات کا سناٹا پیدا کیا۔ شہر، شہرِ خموشاں کا نقشہ بن گیا، چوپائے سائے میں کھڑے ہو کر ہانپنے لگے ہر درخت شکلِ چنار ہو گیا۔ دھوپ کی تابش سے معلوم ہوتا تھا کہ کھڑا اجل رہا ہے۔ گھاس مرجھا کر زمین سے ایسی لپٹ گئی جیسے کسی نے کاٹ کے ڈال دی ہو، حوضوں کا پانی ایسا گرم ہو گیا کہ مسجدوں پر حماموں کا گمان ہونے لگا۔ مؤذنوں نے چپکی سادھی، عابد بھی عبادت چھوڑ کر قیلولہ کی سُنت ادا کرنے کے بہانے سے لیٹ رہے۔ برہمن بتخانے کے کونے میں یوں خاموش ہو کر بیٹھا کہ بت بن گیا۔ میکدہ میں ساقی زانو پر سر رکھ کے اس شکل سے ہو بیٹھا کہ معلوم ہوتا تھا شیشے پر پیالہ اوندھا دیا، غریبوں نے اپنے گھروں میں گھاس کی ٹٹیاں لگا لیں مٹی کی صراحیوں پر کپڑا بھگو کے لپیٹ دیا۔ امیروں نے تہ خانوں میں آرام فرمایا جن کی ٹٹیاں چھڑکی جانے لگیں، فرشی پنکھے کھینچے لگے جن کی خوشبو سے ہوا کے جھونکوں پر لخلخہ کا یقین آنے لگا۔ صراحیاں برف میں لگائی گئیں۔ شربت کی قلفیاں جمائی گئیں۔"

شام

"دن تمام ہوا، جھٹ پٹے وقت نے رات کی آمد کی خبر دی، مغربی گوشہ سے

تاریکی کا جوش ہوا۔ جیسے پہاڑ کے غار سے سیاہ ابر امنڈے۔ آفتاب دن کا تماشا ختم ہونے سے ایسا اداس ہوا کہ منہ پر زردی چھا گئی۔ بادلِ ناخواستہ مغرب کو چلا، لیلائے لیل نے شرم سے کہ آفتاب جاتے ہوئے اُسے دیکھ نہ لے، سیاہ نقاب منھ پر ڈالا۔ ہوا جو دن بھر زور سے چل رہی تھی، دھیمی ہوئی اور تھکے ہوئے مسافر کی طرح آہستہ آہستہ چلنے لگی، درختوں کے پتوں نے کھڑکھڑانا، دریا کے پانی نے لہرانا موقوف کیا، پالے ہوئے جانور جو دن کو چراگاہ کے صحرا میں کلیل کر رہے تھے، اُن کو زندان خانہ نصیب ہوا۔ جنگلی چوپایوں نے درختوں کے سایہ اور پہاڑ کے غاروں میں پناہ لی۔ طیور نے فضائے آسمان سے منھ موڑ کر کسی نے اپنے آشیانے کو رُخ کیا، کسی نے درخت پر بسیرا لیا۔ مسجدوں میں قندیلیں روشن ہوئیں۔ تکیوں میں بتی بجھی دی گئی، میخانوں میں خُم لنڈے۔ مینا اور ساغر نے گردش سے ثوابت و سیار کے نقشے دکھائے۔ قدح نے ماہِ تمام کا کام کیا، وہ روشنی پھیلائی کہ وہاں اندھیرا ہونے نہ دیا۔ آسمان پر ستاروں نے چراغاں کر دیا۔ چراغوں نے اپنی روشنی سے زمین کو آسمان بنا دیا۔ مسافر دن بھر کے تھکے سرایوں میں آ پڑے۔ اُن کی دن بھر کی تھکائی، آخر روز کا اضطراب کہ راہ میں رات ہو جائے منزل پر پہنچنے کی جلدی، سرائے میں ناجنسوں کی ہمسائگی، بھٹیاروں کی ناز برداری، گھر کا دھیان، اہل و عیال کا خیال، وطن کی یاد، یارانِ وطن کا تصور، دل کی شکستگی ایک قیامت تھی۔ اس مزے کو وہی جانتا ہے جس نے کبھی اپنی صبحِ وطن کو شامِ غربت سے بدلا ہے۔"

"شہید کی انشائے بہارِ بے خزاں کی تقریظ"

"مردم دیدہ آج گھر بیٹھے بہشت کی سیر کرتے ہیں۔ اللہ اللہ صفحۂ قرطاس پر کیا جوشِ بہارِ معانی ہے! تارِ نگاہ میں بے تکلف موتی پروئے جاتے ہیں واہ وا! کلکِ گہربار کی کیا درافشانی ہے! سبحان اللہ! یہ کیسی انشا ہے؟ جس کے دیکھنے سے یہ لطف اٹھتا ہے۔ کتاب ہے یا گلزارِ بے خزاں؟ جس صفحہ کو دیکھیے حاشیہ فردوس کی روشوں پر حاشیہ لکھتا ہے، جدول کے خطوں پر سلسبیل اور کوثر کا جی پانی پانی ہوتا ہے۔ سطریں سنبلستان ہیں، الفاظ گلستان ہیں، حرف

کی کششوں پر سرو اور شمشاد کا یقین ہوتا ہے، دائروں سے نرگستان آنکھوں کے تلے پھرجاتا ہے حرفوں کی سیاہی سے کاغذ کی سفیدی وہ کیفیت دکھاتی ہے، گویا درختوں سے چاندنی نے کھیت کیا ہے، کاغذ کی سفیدی پر حرفوں کی سیاہی کی وہ بہار نظر آتی ہے جیسے صحنِ باغ پر بادل چھا رہا ہے، وہاں قوتِ نامیہ سے درخت ہر سال پھولتے پھلتے ہیں یہاں فکر درّاک سے جب دیکھیے فقراتِ برجستہ سے معانیٔ تازہ نکلتے ہیں مجموعہ ہے یا گنجِ شائگان۔ ہر باب میں ایسے ایسے بے بہا جواہرِ حکمت کے بھرے ہیں کہ جسے دیکھ کے جوہریٔ عقل کی عقل چکراتی ہے۔ ہر فصل میں اتنے نقدِ کامل عیارِ دانش کے انبار دھرے ہیں کہ مقدار اُسکی صیرفیٔ ذہن کے ذہن میں نہیں آتی۔ یہ وہ جوہر ہے جس کے رکھنے کو حلقۂ چشم دُرج ہو تو بجا ہے اور یہ وہ نقد ہے جس کے پرکھنے کو سویدائے دل محک ہو تو زیبا ہے۔ شہرِ علم کے مفلسوں کو صلائے عام ہے کہ اس کی سیر کو آنکھیں کھولیں، دامنِ نگاہ میں موتی رولیں، دیارِ دانش کے ناداروں کو اجازتِ تام ہے کہ اس گنجینہ کے دیکھنے کو آئیں، جتنا حوصلہ ہو اُٹھائیں، خالی ہاتھ نہ جائیں، کتاب ایسی کیوں نہ ہو جب مصنف اس کا وہ ہے جسکی فصاحت نے سحبان کے منھ میں قبر کی مٹی سے خاک بھری اور جس کی جادو بیانی نے سحرِ بابل کی قدر گھٹا دی یعنی فاضلِ بے بدل، عالمِ عدیم المثل، منشیٔ اعجاز نگار، شاعرِ سحر گفتار مولانا غلام امام شہید جن کا ثانی فضل و کمال میں نہ دیدہ ہے نہ شنیدہ۔ تحریرِ عربی سے اُن کی اعشیٰ اور جریر کی پیٹھ قبر میں نہ لگی تھی۔ نثرِ فارسی سے ظہوری اور طغرا خوابِ عدم میں چین سے نہ سوئے تھے شعر نے انوری کو بے نور، خاقانی کو شکر گدا کر دیا تھا۔ اب اُن کی اُردو سے سودا کی روح کو سودا ہوگا، میر اپنا مرنا غنیمت جانیگا، ہوس کو پہلے ہی خوب سوجھی جو یہ تخلص اختیار کیا یعنی دربردہ معذرت چاہی کہ میں تو ہوس کرتا ہوں، کمال حق اور کسی کا ہے۔ سوز کو بھی اُن کی خبر پہنچ گئی تھی کہ آتشِ رشک سے جلکر یہ تخلص اپنے حسبِ حال رکھا، ناسخ اب ہوتا تو مصحفی سے تخلص اپنا منسوخ مشہور کرتا، آتش نہ مرتا تو کیسا کیسا جلتا؟ اُنکی اس نثر نے رتبۂ نظم کا کھو دیا، اُستادوں کا سفینہ

دریا میں ڈبو دیا۔ سچ تو یوں ہے کہ اُن کی حیثیت اور اُردو نویسی زمین و آسمان کا فرق ہے۔ اسپر بھی اگر تفنن طبیعت کے لیے اِدھر کچھ میل کرتے تو ایسی لکھتے کہ اُن کی اُردو کے سامنے علامی اپنی انشا سے خطِ غلامی لکھتا۔ بہارِ دانش کی بہار پر خزاں کا وقت آجاتا۔ سہ نثرِ ظہوری کو لوگ چھپا ڈالتے طغرا کی تحریر کو خطِ باطل کی طرح ہٹا ڈالتے۔ پر اس سے مجبور ہوئے کہ فرمائش فخرِ عازی کی تھی گو اُنہیں اُس سے عار تھا، پر حکم ماننا ناچار تھا لیکن لوٹ جانے کی جا ہے کہ اس سادگی میں سیکڑوں طرحداری کا مزا بھرا ہے۔ اپنے نزدیک گو کچھ نہ لکھا ہو پر کیا کچھ لکھا ہے، اگر انصاف کیجیے تو ایسی کتاب اُردو میں آج تک کوئی نہیں ہوئی، اُردو کو رتبہ فارسی کا بخشا ہے، اُردو نویسوں کو سامان انشا پردازی کا عطا کیا ہے، اس کی بدولت ہر ایک اُردو نویس اب ایسا منشی بنتا ہے کہ فارسی اُستادوں کو اُن کے آگے سکتا ہے، ان میں سے کب کوئی دیبا لکھ سکتا ہے بلکہ یہ کتاب اُردو نویسوں ہی کے حق میں مفیدِ مطلب نہیں ہے، ہر ایک قاعدہ اس کا فارسی والوں کے حق میں بھی اکسیر کا نسخہ ہے۔ مصنف نے جو اس کتاب کی تصنیف عاجز کی تکلیف دینے سے اختیار فرمائی، میری زبان میں کیا تاب و تواں ہے کہ اس کا شکر ادا کروں۔ یہ تقریظ تو کیا اگر دفتر کے دفتر لکھوں، ایک حرف ادا نہ ہو، اس لیے دعا پر ختم کرتا ہوں۔ الٰہی! جب تک معنی سخن میں اور سخن حرف میں، حرف خط میں اور خط جانِ قالب کتاب میں ہو دانشمندوں کا تعویذِ جاں اس کتاب کا ہر ایک باب ہو، یہ دعا بخیر کی مستجاب ہو۔"

تقریظ کیا ہے بالکل قصیدۂ مدحیہ ہے، تعریف کرنا اور خوبیاں دکھانا قابلِ اعتراض نہیں لیکن افسوس یہ ہے کہ زمین آسمان کے قلابے تو ملائے جاتے ہیں مگر اتنا بھی نہیں لکھا جاتا کہ اس کتاب میں کیا کیا مضامین درج ہیں اور مصنف نے کن مباحث پر قلم اُٹھایا ہے۔ کیا کیا خاص خوبیاں ہیں اور کیا کیا جدت طرازیاں ہیں۔ یہ تعریف انشائے بہار بے خزاں کے لیے مخصوص نہیں اگر کتاب کا نام اور مصنف کا نام بدل دیا جائے تو ہر کتاب کے لیے موزوں ہو سکتی ہے۔ اگر یہ امر تسلیم بھی کر لیا جائے کہ اُس زمانہ میں تنقید کا رواج نہ تھا اور تعریف ہی تعریف مقصود بالذات تھی

تاہم یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتے کہ ہمارے ان بزرگوں کو محض تعریف کرنا بھی نہیں آتا تھا۔ وہی حسان و سحبان اور سہ نثر ملا ظہوری کی تشبیہ زبان پر چڑھی ہوئی تھی اور وہی مستعمل اور مبتذل الفاظ و فقرات قلم سے نکلتے تھے۔ دراصل ان لوگوں کی نظر بالکل سطحی تھی اور ندرت تو گویا ہی معدوم تھی۔ ہاں اس دور کے مصنفین میں مرزا غالب اس عیب سے بری ہیں۔ ان کے خطوط دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کسی کتاب کی تقریظ میں مصنف کی ضرورت سے زیادہ تعریف نہ کرتے تھے۔ منشی ہرگوپال تفتہ نے جن سے مرزا غالب کو بیحد بے تکلفی اور محبت تھی اور اکثر ان کو مرزا تفتہ لکھتے اور بولتے تھے اپنی کسی کتاب کی تقریظ کے متعلق مرزا غالب کو شکایت لکھی کہ آپ نے تقریظ لکھی بھی تو مختصر تحریر فرمودہ۔ اس وقت ابتدائے روزگار تھا آپ نے اسکی تکمیل نہ کی تو مرزا صاحب جواب میں لکھتے ہیں:-

"واللہ باللہ اگر کسی شاہزادے یا امیر زادے کے دیوان کا دیباچہ لکھتا تو اسکی مدح اتنی نہ کرتا کہ جتنی تمہاری مدح کی ہے۔ ہم کو اور ہماری روش کو اگر پہچانتے تو اتنی مدح کو بہت جانتے۔ قصہ مختصر تمہاری خاطر کی اور ایک فقرہ تمہارے نام کا بدل کر اس کے عوض ایک فقرہ اور لکھ دیا ہے۔ اس سے زیادہ بخشش میری روش نہیں۔" (دیکھیے خطوط مرزا غالب)

خط مولانا غلام امام شہید کے نام

"قبلہ میری شوخی دیکھیے! یوسف کو آئینہ دکھاتا ہوں، خورشید کو روشنی کی حکایت سناتا ہوں۔ گلزار میں پھول لے جاتا ہوں، ختن میں مشک تحفہ بھیجتا ہوں۔ دریا کے سامنے موتی کی شفافی بیان کر رہا ہوں، چاند کے روبرو نور افشانی کا معاملہ کرتا ہوں، لعل کے حضور میں رنگ کی ڈینگیں کہتا ہوں، قند کے مواجہ میں شیرینی تولتا ہوں، مسیحا سے کہتا ہوں جان بخشی کی روایت سنیے، موسیٰ سے تمنا کرتا ہوں کہ ید بیضا کی چمک دیکھیے یعنی حضرت کا دیوان مرتب کر کے آپ کے حضور میں پیش کرتا ہوں۔ میرے لیے اس کے دیباچہ لکھنے کا ارادہ کرنا ویسا تھا جیسے ایک فقیر شاہی خزانوں کے اہتمام کا قصد کرے۔ ایک شیشہ گر میز تراشنے کی [illegible]

میں مرے ۔ اندھا چاہے کہ قدرت کے نظارہ سے حظ اُٹھائے، گونگا چاہے کہ فصاحت کا سکہ بٹھائے ۔ مگر چونکہ غلبۂ شوق میں تمیز باقی نہیں رہتی ، یہ خیال نہیں ہوتا کہ میں کیا ہوں اور کیا کرتا ہوں ، دیباچہ بھی لکھ ڈالا ، وہ اُسکے قابل تو کاہے کو ہے ، آپ کے دیوان پر میرا دیباچہ ایسا ہے جیسے موتی کی لڑی میں سنگریزہ کا آویزہ لگا ہو یا زربفت کے قبا میں چھینٹ کا حاشیہ ٹکا ہو ۔ مانی کی تصویر کے گرد ایک نوشق لکیریں بنادے ۔ سحبان کے کلام کی ایک ابجد خواں شرح لکھا وے ۔ مگر اس نظر سے کہ ہر چیز اپنی ضد سے پہچانی جاتی ہے بدصورت کے مقابلہ میں حسین کے حسن کو اور رونق ہوتی ہے ، شب تار میں شمع کی روشنی زیادہ ضیا دیتی ہے ۔ کھاری پانی پینے کے بعد قند کے شربت میں اور ہی مزا آتا ہے صحرا نوردی کے بعد باغ کا لطف کہا نہیں جاتا ہے ۔ خاطر مشکل پسند ، پسند کرلے تو ہوسکتا ہے ۔ بیشک دیکھنے والوں کو اس کی بُرائی اُس کی خوبی زیادہ دکھا دیگی ۔ ستارہ دیکھ کے جو چاند دیکھے اُسے روشنی زیادہ نظر آئیگی ۔ میری خوش طالعی ہے اگر یہ قبول ہو ، اُس کے لیے شرف ہے اگر دیوان میں داخل ہونے کی عزت اُسے حصول ہو ۔



منشی عبد الکریم

آپ کا مولد و منشاء شہر لکھنؤ ہے ۔ آپ جس وقت کلکتہ میں عہدۂ میر منشی گری دفتر فارسی نواب گورنر جنرل بہادر سے ممتاز تھے ، اُس وقت آپنے مشہور کتاب الف لیلہ کے ترجمہ کا قصد کیا لیکن اصل عربی کتاب میسر نہ آنے سے کچھ دنوں کے لیے یہ ارادہ ملتوی کرنا پڑا آخر پنشن لینے کے بعد آپ نے ۱۸۴۵ء میں انگریزی ترجمہ سے اُردو میں ترجمہ کیا جو ۱۸۴۷ء میں ختم ہوکر چھپا ۔ لعدازاں ۳۲ سال بعد ۱۲۹۵ھ ہجری میں بفرمائش مطبع نولکشور مطبع نظامی میں یہ الف لیلہ کا اُردو ترجمہ طبع ہوا ۔ اور مترجم نے اس مرتبہ عمدہ عمدہ تصاویر الف لیلہ انگریزی

مطبوعۂ لندن سے لیکر ہر محل اور موقع پر شامل کیں تاکہ شائقین کی دلچسپی اور مسرت کا باعث ہو
ہمارے پیش نظر اس وقت مطبع مصطفائی کا نپور کا چھپا ہوا نسخہ ہے جو ۱۲۹۵ھ
میں مطبوع ہوا ہے۔ آپ کا سن ولادت و وفات معلوم نہیں ہوا یں ۱۲۹۵ ہجری تک یقیناً آپ
زندہ تھے۔

آپ کا انداز تحریر عبارت آرائی اور رنگینی سے پاک ہے۔ اگرچہ مرزا رجب علی بیگ
سرور کی مشہور کتاب فسانۂ عجائب شہرت عام و بقائے دوام کے دربار میں جگہ پا چکی
تھی مگر چونکہ آپ کا زیادہ تر تعلق کلکتہ سے رہا اور آپ نے یہ کتاب اس غرض سے ترجمہ کی
تھی کہ صاحبان عالی شان کو پسند آئے اور مدارس سرکار میں رواج پائے اس لئے آپ نے
دور اول کے ان مصنفین کی تقلید کی جن کا تعلق فورٹ ولیم کالج کلکتہ سے تھا اور سرور کی
تقلید سے آزاد رہے، چنانچہ آپ نے صاف صاف، سیدھی سادی عبارت میں ترجمہ کیا
اور مقفیٰ و مسجع عبارت سے پرہیز کیا۔

ہم آپ کے دیباچہ سے بطور نمونہ کچھ عبارت نقل کرتے ہیں اور یہی طرز آپ کی کتاب
الف لیلہ میں ہر جگہ پایا جاتا ہے۔

"جس طرح مطالعہ کتب تواریخ سے عجائب و غرائب واردات اور حال سلاطین ماضیہ
دانشمندوں کو موجب بصیرت کا ہر ایک امر میں ہوتا ہے اسی طرح کتب قصص اور حکایات سے
کہ عاقلوں نے ہر ایک زبان میں واسطے تجربے اور تفریح خاص و عام کے تالیف کی ہیں،
ہر ایک کو فوائد کثیر حاصل ہوتے ہیں خصوصاً مبتدیوں کو کہ قصد زباندانی کا رکھتے ہیں۔ ایسی
کتابوں سے مہارت لکھنے اور پڑھنے اور بول چال کی ہو جاتی ہے اور راقم اثیم کو ......
ابتدائے شعور سے کمال شوق دیکھنے کتابوں قصے کہانی کا تھا اور سب قصوں میں تمنا الف لیلہ
کی زیادہ رہتی تھی اور وہ عربی میں الف لیلۃ و لیلۃ یعنی ایک ہزار ایک رات سے،
.... وہ کتاب سواد و سو رات کے کہ جس کو شیخ احمد عرب یمنی شروانی نے

واسطے پڑھانے صاحبانِ عالیشان کالج کلکتہ کے بکمال تلاش عرب سے منگوا کر چھپوایا تھا میسر نہ آئی۔ آخر کار جب راقم بسبب شدت امراض کے بعد تقرر پنشن بیت السلطنت لکھنؤ میں کہ مولد اپنا ہے خانہ نشین ہوا وہ نسخہ تمام وکمال انگریزی زبان میں مع تصویرات بہم پہنچا۔ راقم نے اُسکو اوّل سے آخر تک بسبب استعداد سمجھنے انگریزی کے دیکھا۔ ازبسکہ قصے دلچسپ تھے دو برس تک اُسکا ترجمہ کرتا رہا اور ۱۲۵۰ھ ہجری میں تمام کیا۔ شہر میں شہرہ ہوا اکثر لوگوں نے منگوا کر نقل اُس کی لی، کمتر مسودہ راقم کے گھر رہا، دست بدست پھرا کیا۔ چنانچہ پانچ سات جز تلف ہوئے، راقم کو اُس کے لکھنے میں دوبارہ تکلیف کرنا پڑی، اور طلب کرنے احباب سے نہایت تنگ آیا جس کو نہ دیا وہ خفا ہوتا اور دینے میں اپنی کتاب سے ہاتھ دھوتا۔ آخر کو خیال ہوا کہ یہ کتاب چھپ جائے تا سب کے ہاتھ آئے اور راقم بھی ایک ایک نسخہ اُسکا عزیزوں اور دوستوں کو بانٹے۔ فقط اسی واسطے راقم نے جس طرح ہو سکا بیچ عہد معدلت مہد پادشاہِ جم جاہ، خاقانِ زماں ابوالظفر مصلح الدین محمد امجد علی شاہ بادشاہ غازی ملک اودھ خلد اللہ ملکہٗ اور وزارت وزیر اعظم، نواب امین الدولہ عماد الملک امداد حسین خاں بہادر ذوالفقار جنگ دام اقبالہ کے چھپوایا اور سنہ ہجری طبع اس کتاب کے ۱۲۶۳ھ اور عیسوی ۱۸۴۷ء ہیں........."

منشی امیر احمد مینائی

ولادت اور خاندان آپ شاہ نصیر الدین حیدر بادشاہ اودھ کے عہد میں ۱۶ ؍ شعبان ۱۲۴۴ھ ہجری روزِ دوشنبہ بمقام لکھنؤ پیدا ہوئے، آپ کا نسبی سلسلہ بہت ہی قریب حضرت مخدوم شاہ مینا صاحب نور اللہ مرقدہٗ سے ملتا ہے جن کا مزار مقدس لکھنؤ میں زیارت گاہِ خاص و عام ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جنابِ امیرؔ کے نامِ نامی کے ساتھ مینائی لکھا اور بولا جاتا ہے، آپ مولوی کرم محمد مغفور کے خلف اکبر ہیں۔

آپ کا تذکرہ اس دور میں کیوں کیا گیا

چونکہ آپ نے حیدرآباد دکن میں ۱۹ رجادی الآخر ۱۳۱۸ہجری مطابق ۱۳ راکتوبر سنہ ۱۹۰۰ع کو رحلت فرمائی ہے، اس لیے آپ کا ذکرِ خیر تیسرے دور کے مصنفین کے ساتھ ساتھ ہونا چاہیے تھا لیکن آپ کی کتاب انتخابِ یادگار جس کا انتخاب ہم آگے چلکر ہدیۂ ناظرین کرینگے بلحاظ زبان مرزا رجب علی بیگ سرور کی فسانۂ عجائب سے ملتی جلتی ہے اس لیے ہم نے یہ مناسب خیال کیا کہ آپ کے حالاتِ زندگی اسی طبقہ کے مصنفین کے ساتھ بیان کیے جائیں۔

علاوہ ازیں تیسرے دور کے مصنفین اس اعلیٰ پایہ کے ہیں کہ ایک یا دو کتاب کے مؤلف کو اُن صدر نشینانِ بزمِ اُردو کے ہم پلہ جگہ نہیں دی گئی اور نہ دی جاسکتی تھی۔ نواب محسن الملک۔ مولوی سید کرامت حسین۔ مولوی عزیز مرزا وغیرہم اُن بزرگوں کے حاشیہ نشین ہیں حالانکہ قابلیت کے لحاظ سے یہ لوگ بھی کچھ اُن سے کم نہ تھے۔ خصوصاً مولوی سید کرامت حسین کا درجہ بلحاظ علمیت اُن میں سے اکثر سے فائق و برتر ہے اور اُن کی کتاب افرادِ کاسبہ اُن کی علمیت اور حکمت کی بین دلیل ہے۔ نیز آپ کی دو کتابیں ارشاد السلطان اور ہدایت السلطان۔ فسانۂ عجائب کے کچھ ہی بعد کی تصنیف ہیں اور آپ بلا تکلف دوسرے دور کے مصنفین کے ساتھ پہلو بہ پہلو جگہ پا سکتے ہیں۔

عادات و خصائل

آپ کو صرف خاندانی فضیلت ہی حاصل نہ تھی بلکہ اپنی ذات سے خود بھی صاحبِ تماز زہد و تقوےٰ۔ صوفی مشرب۔ خدا پرست۔ درویش صفت۔ منکسر المزاج آدمی تھے۔ خاندان چشتیہ صابریہ کے سجادہ نشین حضرت امیر شاہ صاحب سے بیعت رکھتے تھے اور بعد میں خرقۂ خلافت سے بھی سرفراز ہوئے تھے۔

تعلیم

آپ کی تعلیم قدیم دارالعلوم فرنگی محل لکھنؤ میں ہوئی تھی۔ فہم سلیم اور ذہانت فطری کی امداد سے عربی و فارسی میں کامل دستگاہ رکھتے تھے۔ اس کے علاوہ طب، جفر، نجوم وغیرہ میں بھی اچھی معلومات تھیں، اور شاعری میں تو آپ مسلّم الثبوت اُستاد

تسلیم کیے گئے ہیں۔ اس فن میں آپ کو منشی مظفر علی خاں اسیرؔ سے تلمذ تھا۔ الغرض آپ کا ابتدائی زمانہ تحصیل علوم و فنون ہی میں بسر ہوا۔

واجد علی شاہ کے دربار میں باریابی

سنہ ۱۲۶۹ ہجری میں آپ کو سلطانِ عالم واجد علی شاہ اخترؔ کے دربار میں باریابی ہوگئی اور حسب الحکم سلطانی دو کتابیں ارشاد السلطان اور ہدایت السلطان تصنیف کیں جن کے جلدو میں خلعتِ فاخرہ اور انعام عطا ہوا۔ اور اسی وقت سے آپ کی شہرت کا زمانہ شروع ہوا۔ اسی اثنا میں اودھ کا الحاق ہوگیا اور چند روز آپ خانہ نشین رہے۔

رامپور کی طلبی اور مستقل سکونت

بعدازاں سنہ ۱۲۷۵ ہجری میں آپ کی معجز بیانی کا شہرہ سُنکر فردوس مکان نواب محمد یوسف علی خاں بہادر ناظمؔ تخلص نے طلب فرمایا۔ اُس وقت سے آپ کی مستقل سکونت بجائے لکھنؤ، رامپور ہوگئی۔ ریاست کی طرف سے عدالت دیوانی کے ایک رکن ہوگئے۔ یہ وہ زمانہ ہے جب کہ دہلی اور لکھنؤ کے تمام اہلِ کمال نواب صاحب کی قدردانی و قدر افزائی کے سبب یہیں آکر جمع ہوگئے اور جن میں سے اکثر آخر وقت تک وہیں رہے۔

نواب فردوس مکان کے انتقال کے بعد سنہ ۱۲۸۱ ہجری میں نواب خلد آشیاں کلب علیخاں بہادر کا عہدِ حکومت آیا، اُردو شاعری کو اور بھی فروغ ہوا۔ یہ وقت جناب امیر مینائی کے آفتاب اقبال و کمال کے عروج کا تھا۔ یہاں تک کہ حضرت امیرؔ کو نواب کی اُستادی کا فخر حاصل ہوا۔ اُس وقت رامپور میں مرزا داغؔ، اسیرؔ، حیاؔ، منیرؔ، بحرؔ، ذکیؔ، قلقؔ، عروجؔ، جلالؔ، شاغلؔ، تسلیمؔ، رساؔ وغیرہ کا جمگھٹا تھا اور کبھی کبھی حضرت غالبؔ بھی دہلی سے تشریف لاکر اُس یادگار بزم کو اپنی صدارت سے اعزاز بخشتے تھے۔

تصنیف و تالیف

آپ کی تصانیف اکثر شائع ہوگئیں اور بعض مسودہ ہیں، ایک اردو دیوان موسوم بہ غیرتِ بہارستان جو اُس زمانہ میں مکمل و مرتب ہوگیا تھا ایامِ غدر کی دست برد کی نذر ہوا وقتاً فوقتاً جو اشعار یاد آتے گئے وہ دوسرے مسودہ میں درج ہوتے گئے جسکا کچھ حصہ دیوان منتخب

میں طبع کر شائع ہوا۔ غدر کے بعد دوسرا دیوان موسوم بہ مرآۃ الغیب جو درحقیقت پہلا دیوان سمجھا جاتا ہے
نعتیہ دیوان اور مولود شریف کے ساتھ چھپا۔ سنہ ۱۳۰۹ھ میں دوسرا عاشقانہ دیوان موسوم بہ صنم خانۂ عشق
چھپا۔ تذکرہ شعرائے رامپور معروف بہ انتخاب یادگار جو نواب کلب علیخاں کی فرمائش سے لکھا گیا تھا
سنہ ۱۲۹۰ ہجری میں شائع ہو چکا ہے۔ اس کے علاوہ آپ نے ایک اور قابل قدر تالیف یعنی فرہنگ
زبان اردو معروف بہ امیر اللغات کا سلسلہ آخر زمانہ نواب کلب علی خاں میں شروع کیا۔ جسکا
باقاعدہ کام نواب مشتاق علیخاں کے عہد تک جاری رہا۔ اس فرہنگ میں آپ نے اردو زبان کے
تمام لغات اختلافی و غیر اختلافی و محاورات نہایت محققانہ اصول سے لکھنے شروع کیے تھے مگر افسوس
کہ یہ تالیف ناتمام رہی اور صرف دو جلدیں یعنی الف ممدودہ اور مقصورہ کے الفاظ میں شائع
ہوئی تھیں کہ آپ کا جام حیات لبریز ہو گیا۔ حضرت امیر کے بعض خطوط بھی شائع ہو گئے ہیں جنمیں
اکثر مقامات پر لطف زبان کے ساتھ ساتھ طرز ادائے بیان نہایت دلکش اور بے ساختہ ہے۔

سیاحت حیدر آباد دکن اور وفات

اس لغت کی تکمیل کے خیال سے آپکو سیاحت حیدر آباد دکن کا شوق دامنگیر ہوا
چنانچہ اپنے دوست نواب فصیح الملک مرزا داغ کی تحریک اور کوشش سے
بنارس میں حضور نظام نواب محبوب علی خاں کی تشریف آوری کے موقع پر آپ کو باریابی کا اعزاز حاصل
ہوا اور قصیدۂ تہنیت کے پیش کرنے کا بھی موقع ملا۔ پھر اگلے سال سنہ ۱۳۱۸ ہجری میں رامپور کو خیرباد
کہکر چند روز بھوپال میں قیام فرمایا اور ۱۰ جمادی الاول کو آپ حیدرآباد پہنچے۔ آپکے صاحبزادے
منشی لطیف احمد اختر اور جناب جلیل اس سفر میں آپکے ہمرکاب تھے۔ نواب فصیح الملک نے نہایت تپاک
و محبت سے استقبال کر کے اپنا مہمان کیا۔ مگر افسوس صد افسوس کہ یہ سفر راس نہ آیا اور وہاں پہنچتے ہی ایسے
بیمار ہوئے کہ پھر نہ سنبھلے۔ پنڈت رتن ناتھ سرشار اور مرزا داغ اور دیگر احباب شبانہ روز آپکی تیمارداری
میں مصروف رہے بلکہ مہاراجہ سرکشن پرشاد پیشکار و وزیر بھی کئی مرتبہ مزاج پرسی کے لیے آئے مگر کوئی
تدبیر کارگر نہ ہوئی اور روز بروز حالت بگڑتی گئی کم و بیش ایک مہینہ کی علالت کے بعد ۱۵ جمادی الآخر
سنہ ۱۳۱۸ ہجری مطابق ۱۳ اکتوبر سنہ ۱۹۰۰ع کو سرائے عالم باقی ہوئے۔ اور وہیں مدفون ہوئے۔

افسوس تجھکو رحم نہ آیا کچھ اے اجل — مارا کہاں امیرِ غریب الدیار کو

اولاد آپ نے چار لڑکے یادگار چھوڑے منشی محمد احمد محمود قمر۔ منشی ممتاز احمد آرزو۔ منشی مسعود احمد ضمیر اور منشی لطیف احمد اختر۔

مکان میں آتشزدگی سُنا ہے کہ ۱۸۹۹ء میں جناب امیر کے مسکونہ مکان میں اتفاقیہ آگ لگ گئی تھی اور آپکی بعض تصنیفات نذرِ آتش ہو گئیں۔ اس سے زیادہ افسوس اس امر کا ہے کہ بعض تصنیفات ابتک شائع ہونیکا موقع نہیں ملا۔ اگرچہ وہ اُن کے صاحبزادوں کے پاس بطور ترکہ موجود ہیں۔

انتخابِ یادگار جیسا کہ پیشتر ذکر ہو چکا ہے آپنے ایک تذکرہ اُن شاعروں کا لکھا ہے جو ریاست رامپور کے متوسل رہے، اس تذکرہ کا نام انتخاب یادگار ہے اور یہ نام تاریخی بھی ہے سنہ ۱۲۹۰ھ میں یہ کتاب طبع ہوئی ہے جسکے یہ معنی ہیں کہ اس کتاب کو تحریر ہوئے ۵۱ سال سے زائد ہو گئے زبان، فسانۂ عجائب کی طرح مقفّیٰ و مسجّع ہے چونکہ امیر مینائی بھی لکھنؤ کے تھے اور اُس زمانہ کے لحاظ سے معمولی زبان میں جو روزمرہ تقریر کا ذریعہ تھی کوئی تحریر لکھنا زیادہ قابلِ تعریف نہ تھا، اگرچہ سرسید نے اپنی تحریرات سے لٹریچر میں انقلاب پیدا کر دیا تھا مگر بعض لوگ لکیر کے فقیر تھے اور اُنہیں قدامت پسندوں میں جناب امیر بھی تھے پس سرور کی تقلید سے امیر مرحوم کیلئے بھی آزاد ہونا مشکل ہو گیا چنانچہ اُنہوں نے وہی طرز اپنی کتاب کا اختیار کیا جسکو ہم فسانۂ عجائب میں پاتے ہیں۔ چار سو دس شاعروں کا حال اِس کتاب میں قلمبند کیا گیا ہے اور اس میں ۴۷۰ صفحات ہیں جستہ جستہ مقام سے بطور نمونہ انتخاب کیا گیا ہے۔

"سمندِ قلم پر شہسوارِ سخن کی تاکید ہے کہ میدانِ حمدِ الٰہی میں قدم اُٹھا، اور تیغِ زبان پر قوتِ ناطقہ کی تہدید ہے کہ اس معرکہ میں جوہر دکھا۔ مگر یہ منزل ایسی کڑی ہے کہ دونوں کو مشکل پڑی ہے نہ اُسکا پاؤں نہ اس کا ہاتھ اُٹھ سکتا ہے، اِس عجز کو دیکھکر عقل حیران ہے اور دل کو سکتہ ہے کہ تحریر و تقریر کا تو یہ حال کہ نہ قلم کو لکھنے کی تاب نہ زبان کو گویائی کی مجال پھر کیونکر وادیِ ناپیدا کنارِ حمد تمام ہو جسکی ذات کی بدایت، صفات کی نہایت نہو، کس طرح اُسکی ستائش کا سرانجام ہو۔ الحق وہی باطن وہی ظاہر ہے، وہی اوّل ہے وہی آخر ہے، گفتگوئے بے سر و پا اُسکی ثنا کی گنجائش کہاں پائے، قطرے

میں دریا، ذرّے میں صحرا کیونکر سمائے عجب بارگاہِ کبریائی ہے کہ وہاں رسائی کا طریقہ نارسائی ہے، انسان ہمت ہار دے اور اس بازی کو جیت لے۔ وادیِ معرفتِ الٰہی طے ہونیکی یہی سبیل ہے اَلعَجزُ عَنِ الدَّرکِ اِدراکٌ اسی پر دلیل ہے"۔ کہیں کہیں عبارت صاف اور سادہ بھی ہے مثلاً:۔

"احمد تخلص سید یمین الدین احمد ولد سید معین الدین احمد۔ سلسلہ ان کے نسب کا حضرت امام ربانی شیخ مجدد الف ثانی قدس سرہ العزیز تک پہنچتا ہے، بارہ سو پینتالیس ہجری انکا سالِ ولادت ہے۔ ماہِ ربیع الاول کی بارھویں تاریخ بارہ سو بیاسی ہجری زمانۂ رحلت ہے۔ اس حساب سے ۳۷ برس کی عمر ہوئی، میاں احمد حسین راحت سے تلمذ تھا۔ سکندر نامہ زبانِ اردو میں انکا موزوں کیا ہوا ملا۔ اس سے یہ کلام منتخب ہو کے لکھا گیا۔

اشعار سکندر نامہ

ہوا جبکہ تابندہ مہرِ منیر	صف آرا ہوا شاہِ گردوں سریر
جواں وہ جو تھے شیرِ صحرائے جنگ	چلے دشمنوں کی طرف بے درنگ
ملے دونوں لشکر بہم اس طرح	کہ ساون سے بھادوں ملے جس طرح
کسی سمت تھے گرزِ آتش فشاں	کہیں پار سینوں کے نوکِ سناں
کوئی نیم جاں تھا کوئی خستہ تن	میسر کسی کو نہ آیا کفن
پڑی لاش پر لاش تھی اس قدر	کہ کشتوں کے پشتے ہوئے سربسر

معلوم ہوتا ہے یہ کتاب شائع نہیں ہوئی ورنہ ہم شاہنامۂ اردو کی طرح سکندر نامہ اردو بھی بازار میں فروخت ہوتا ہوا دیکھتے۔ نہایت عمدہ اور صاف ترجمہ ہے، کاش یہ سکندر نامہ مرحوم کے وارثوں کے پاس محفوظ ہو اور وہ اسکی اشاعت کریں تو بہتر ہو۔

پھر وہی انداز ہے:۔

"تسلیم، شیخ امیر اللہ ابن مولوی عبد الصمد انصاری، ان کے بزرگوں کا وطن قدیم فیض آباد، مرزا محمد صغر علی خاں نسیم دہلوی ان کے استاد، لکھنؤ میں نشو و نما پائی۔ حضور پُرنور (یعنی نواب کلب علی خاں والیِ رامپور) دام ملکہم کی قدردانی یہاں کھینچ لائی۔ ساون برس کی

عمر ہے۔ چار مثنویاں اور دو دیوان اُردو واں سے یادگار ہیں۔ یہ اُنکے منتخب اشعار ہیں:-

مرزا غالب کا حال لکھتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:-

"معلومات اُنکی زبان فارسی میں کالشمس فی رابعۃ النہار آشکار ہے۔ نثر و نظم اُردو کی چار دانگ ہندوستان میں پکار ہے۔ تالیفات و تصنیفات کے نام بیان لکھے جاتے ہیں فارسی میں کلیات جس میں غزلیں ردیف وار ہیں اور قطعات اور قصائد اور رباعیات اور مثنویاں سب قسم کے اشعار ہیں۔ قادرنامہ جو خالق باری کی طرز پر موزوں کیا ہے۔ مہر نیمروز اور ماہ نیم ماہ[۵] یہ نثر میں دو تاریخیں ہیں۔ تاریخ اوّل میں شاہ تیمور سے ہمایوں تک حال لکھا ہے اور تاریخ ثانی میں عہد جلال الدین اکبر بادشاہ سے بہادر شاہ کے عہد تک احوال ضبط کیا ہے۔ دستنبو جس میں غدر کے واقعات ہیں۔ قاطع بُرہان جس میں برہانِ قاطع کی بعض لغات پر خدشات ہیں۔ پنج آہنگ اس میں فارسی زبان کی منشآت ہیں۔ اُردو میں ایک دیوان اور اُردوئے معلیٰ اور عودِ ہندی ان دونوں میں اُردو زبان کے خطوط ہیں۔ الحاصل مرزا صاحب کی طباعی اور ذکاوت ان کے نتائج افکار سے پیدا ہے، بات سے بات پیدا کرنا تمام کلام سے ہویدا ہے۔ اس سرکار فیض آثار کے نمکخوار قدیم ہیں۔ جناب غفران مآب نواب محمد یوسف علیخاں صاحب بہادر فردوس مکان طاب ثراہ کو ان سے تلمذ ہے۔ اُس عہد میں بھی وظیفہ خوار رہے۔ بندگانِ ولی نعمت ابداللہ ظلال اجلالہم کے عہد دولت میں بھی جب تک زندہ رہے مورد پرورشِ بے شمار رہے۔ تہتر برس کی عمر پائی۔ بارہ سو پچاسی ہجری میں ذیقعدہ کی دوسری تاریخ وفات پائی۔ سلطان نظام الدین حضرت محبوب الٰہی قدس سرہ العزیز کی درگاہ میں دفن ہوئے۔ یہ اُن کے کلام کا انتخاب ہے جسکا ہر حرف لاجواب ہے"

[۵] جناب امیر کو غلط معلوم ہوا کہ ماہ نیم ماہ بھی لکھی جا چکی ہے۔ مرزا غالب نے خود اپنے ایک خط میں لکھا ہے کہ اسکا نام ہی نام ہے، اور تاریخی واقعات لکھنے کی نوبت نہیں آئی (دیکھو حالات جناب میرزا غالب) ۱۲

انتخاب یادگار میں جس شاعر کا بھی کلام درج کیا گیا ہے وہ اُس کا نہایت عمدہ نمونہ ہے، اور یہ بھی التزام رکھا ہے کہ مذاقِ سخن سے نہ گرنے پائے۔ چنانچہ بعض شعراء کے کلام میں صرف ایک یا دو شعر ہی پسندِ خاطر ہو کر چھاپا گیا ہے۔

خاتمہ

اس دور کے مصنفین کی تعداد بہت کم ہے لیکن پہلے دور سے زبان کی عمدگی اور شستگی میں یہ دور سبقت لے گیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ پہلے دور کی زبان سادہ اور عام فہم ہے اور اس دور میں قافیہ بندی کا بہت زور ہے۔ نئی نئی تراش اور خراش پائی جاتی ہے، عبارت میں رنگینی بہت زیادہ ہے، فارسی کا تتبع بہت کچھ ہے۔ تاہم ہر شخص کا حوصلہ نہیں کہ اہلِ قلم بن جائے۔ اس دور کے مصنفین اعلیٰ قابلیت کے لوگ ہیں اور سب کے سب فارسی اور عربی سے بہرہ وافی رکھتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔

آزاد آبحیات میں ایک جگہ لکھتے ہیں کہ ۱۸۳۲ء میں ایک دہلی کالج سوسائٹی قائم ہوئی، اور انگریزی سے اُردو میں بہت سی کتابیں اس سوسائٹی کے زیرِ اہتمام ترجمہ ہو کر شائع ہوئیں، اس سوسائٹی کا حال ہم کو کچھ نہ معلوم ہو سکا۔ لیکن اس دور کے شروع میں جو فہرست کتب ہم نے دی ہے اُس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ضرور اس سوسائٹی کا وجود تھا اور ماسٹر رامچندر صاحب اس سوسائٹی کے رکنِ اعظم تھے علاوہ ازیں جو کتابیں دہلی کی مطبوعہ ہیں وہ یقیناً اسی سوسائٹی کی طرف سے شائع ہوئی ہیں کیونکہ زیادہ تر درسی کتابیں ہیں جو طلبائے کالج کے لیے ترجمہ کی گئی ہیں، اور غالب خیال یہ ہے کہ اس سوسائٹی کے اثر سے تمام اطراف و جوانبِ ہندوستان میں انگریزی سے کتابیں ترجمہ ہونی شروع ہوگئیں